کلیات رشید احمد صدیقی

(خاکے۔ اول)

جلد سوم

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

کلیات رشید احمد صدیقی

(خاکے۔اول)

جلد سوم

ترتیب وتدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

پہلی اشاعت : 2009
تعداد : 1100
قیمت : -/252 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1337

Kulliyat-e-Rashid Ahmad Siddiqui, (Khakey-1)Vol.-III

Compiled by

Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-326-1
ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110053
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیش تر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کرلیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔

مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز ومزاح اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز ومزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز ومزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستانِ علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرزِ زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق وتلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کرلیا جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

مقدمہ

رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا سب سے بڑا امتیاز مختلف شخصیات کی ممتاز صفات اور خصوصیات کی نشان دہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی شخصیت کی انسانی کمزوریوں کو کسی طرح چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر یہ کمزوریاں، کمزوریوں کے طور پر نہیں بلکہ فطرت کے تقاضے اور انسانی جبلّت کے نشیب و فراز کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ چوں کہ رشید صاحب کا اندازِ بیان اور اسلوب نگارش ان کی ہر پیش کش کو غیر معمولی طور پر دلچسپ اور پُر وقار بنا دیتا ہے، اس لیے شخصیت کی خوبیاں ہوں یا خامیاں، ان کے بیان میں کہیں بھی تلخی، تلون، ناپسندیدگی یا کسی منفی نقطۂ نظر کا گمان تک نہیں گزرتا۔ کہتے ہیں کہ کسی صاحب اسلوب کے ایسے رویے، کشادہ قلبی، وسیع المشربی اور سیر چشمی کے بغیر نہیں پیدا ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی اس نوع کی سیر چشمی کی بہترین مثال تھے۔ ورنہ صورت حال یہ ہے کہ طنز و مزاح نگار ہو، انشائیہ نگار یا خاکہ نگار، اگر اس کے مزاج میں ذرا بھی تلخی یا تلون کی کیفیت ہے تو وہ اسے کبھی چھپا نہیں پاتا۔

رشید صاحب کے خاکوں کی ایک اور خصوصیت اپنے شخصی موضوع کے ساتھ ان کے کمالات، انفرادی نقوش اور علمی و ادبی امتیازات تک کو شخصیت کے اجزائے ترکیبی بنا کر پیش

کر دینا بھی ہے۔ چنانچہ ان تمام خاکوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں بعض شخصیات کی حیثیت شاعر کی ہے تو بعض کی دانش ور کی، بعض کو عہدے اور مناصب حاصل ہوئے تو بعض دنیاوی نام ونمود سے بے نیاز رہے، بعض کی دانش ورانہ حیثیت تسلیم شدہ رہی تو بعض کا سب سے بڑا امتیاز، خود، رشید کا دوست اور ان کی پسندیدہ شخصیت ہونا رہا۔ غرض رشید صاحب، ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخصیت رشید صاحب کے خوابوں اور تمناؤں کے شہر علی گڑھ اور وہاں کی دانش گاہ سے کسی بھی طور پر ہم رشتہ رہی ہے تو پھر تو رشید صاحب کی گل افشانیِ گفتار قابل دید ہوتی ہے۔

چوں کہ رشید احمد صدیقی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام خاکوں کو ایک جلد میں سمونا ممکن نہیں تھا اس لیے خاکوں کے لیے دو جلدیں مخصوص کی گئی ہیں۔ دونوں ایک دوسری کی تکمیل بھی کرتی ہیں اور نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ منظر نامہ بھی تیار کرتی ہیں۔

000

رشید صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کا پہلا مجموعہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' پہلی بار ریاض ہند پریس، علی گڑھ سے 1942 میں شائع ہوا تھا۔ دوسری بار کتابی دنیا، دہلی سے 1946 میں شائع ہوا، پھر اسے مکتبہ جامعہ، دہلی نے 1962 میں شائع کیا۔

''ہم نفسانِ رفتہ'' کی پہلی اشاعت دارالمصنفین، اعظم گڑھ سے 1960ں ہوئی۔ انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ سے اس کی اشاعت 1966 میں اور سرسید بک ڈپو، علی گڑھ سے 1972 میں ہوئی۔ اس کے علاوہ پاکستان سے بھی مختلف اداروں سے یہ دونوں تصانیف متعدد بار شائع ہوچکی ہیں اور اب بھی شائع ہو رہی ہیں۔

''گنج ہائے گراں مایہ'' مطبوعہ مکتبہ جامعہ 1963 اور ''ہم نفسان رفتہ'' مطبوعہ 1972 کو ہی مرتبین نے سامنے رکھا ہے۔ یہ دونوں مجموعے رشید صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہوئے تھے اور رشید صاحب نے اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا تھا۔

اس کے علاوہ رشید صاحب کے تحریر کردہ وہ خاکے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے اور ان دونوں مذکورہ مجموعوں میں شامل نہیں ہیں، ان خاکوں کو بھی اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

رشید صاحب کے تحریر کردہ ان خاکوں کی نوعیت تاثراتی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مجموعہ میں شامل شخصیات کے مختصر حالات تعارف کے طور پر درج کر دیے جائیں اور پیدائش اور وفات کی معلوم اطلاعات فراہم کر دی جائیں، نیز ماخذات کی نشان دہی بھی کر دی جائیں۔

'گنج ہائے گراں مایہ' میں سولہ اور 'ہم نفسان رفتہ' میں سات خاکے ہیں اور ان خاکوں کی تعداد جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور ان دونوں مجموعوں میں نہیں ہیں ان کی تعداد آٹھ ہیں۔ شیخ نیازی اور ذاکر صاحب پر تحریر کردہ خاکے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

'گنج ہائے گراں مایہ' اور 'ہم نفسانِ رفتہ' میں شامل خاکوں کی تعداد مجموعی طور پر تئیس (23) ہے۔ یہ تمام خاکے 'خاکہ' سے متعلق پہلی جلد میں شامل کر لیے گئے ہیں اور ایسے تمام خاکے جو ان دونوں مجموعوں میں شامل نہیں، اور ان کی اشاعت متفرق انداز میں رسائل و جرائد میں ہوتی رہی یا پھر 'شیخ نیازی' کی طرح انہیں ایک الگ کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا، ان کو دوسری جلد میں شامل کر لیا گیا ہے۔

خاکوں کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ انھیں مختصر ہونا چاہیے مگر رشید احمد صدیقی کے بعض خاکے طویل ہی نہیں اس حد تک طویل ہیں کہ انھیں الگ سے کتابچے کی شکل میں شائع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ تاہم صنفی اعتبار سے اسے 'خاکے' کی صنف سے الگ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ 'خاکے' سے متعلق دونوں جلدوں میں حسب ضرورت حوالے اور حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فارسی اشعار کا ترجمہ درج کر دیا گیا ہے اور پہلی بار ان خاکوں کو معاصر تدوینی اور اشاعتی معیار اور طور طریقے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

شاید اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ 'کلیات رشید احمد صدیقی' کی تمام جلدوں کی تکمیل، تدوین اور تحقیق میں میرے معاون جناب مہر الٰہی ندیم کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے جس کا حق ادا کرنا آسان نہیں —— بس اظہار تشکر کیا جا سکتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی

●●●

فہرست مضامین

● گنج ہائے گراں مایہ:

●

مولانا محمد علی

(1878-1931)

محمد علی کی ولادت 1878 میں رام پور میں ہوئی۔ بریلی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ 1890 میں وہ ایم۔اے۔او۔ کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ 1898 میں بی۔اے۔ کرنے کے بعد آئی۔سی۔ایس کا امتحان دینے انگلستان گئے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ واپسی پر ریاست رام پور کے ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ صحافت کے راستے سیاست میں داخل ہوئے اور کلکتہ سے کامریڈ اور دہلی سے ہمدرد جاری کیا۔

گاندھی جی کے ساتھ نان کوپریشن تحریک میں سرگرم حصہ لیا، اور جنگ آزادی کے لیے جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ 1920 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ 1927 میں نہرو رپورٹ سے اختلاف کی بنا پر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ 1930 میں ہندوستان کے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اسی دوران آپ کی طبیعت بہت بگڑ گئی اور 4 جون 1931 کو ان کا انتقال ہوا۔ بیت المقدس میں دفن ہیں۔

o

ولادت تو مادرزاد ہوتی ہے۔ لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی! عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے۔ محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا! اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا ـــــ ارفع وارجمند!

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں میں ان کی انفرادی اور شخصی افتادِ طبع کی جلوہ گری تھی۔ شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ بھی ہے ـــــ نایاب اور گراں مایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بدتوفیقوں اور بدمذاقوں سے سابقہ پڑا۔ ایسے بدتوفیق اور بدمذاق جو بھو کے تھے، بوالہوس اور کینہ پرور بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ ظرفوں کا خیال ہے ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں، کتنے چشمے اُبل رہے ہیں۔ کیسے کیسے عزائم بیدار اور کتنی روحیں دارورسن کی طلب گار ہیں! یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا بلکہ مرحوم آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔ مردِ غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی، 'برگستواں کی زینت' تمغہ

اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرے —— ڈوبتے ہوئے سورج سے!

محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ و تپاں —— بشارتِ ازلی بھی۔ حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے، کیسی مخالفت! اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے لیے۔ وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔ بشارتِ ازلی اس لیے کہ شخصیت کامیاب رہی۔ شخص کا انجام نا قابلِ التفات۔ توفیقِ انسانی اور تقدیرِ الٰہی کبھی کبھی برگزیدہ افراد کی ناکامی میں بھی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اسے ناکامی نہیں کامرانی بتایا گیا ہے۔

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل تھی جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں ایک جلوہ گری۔ وہ مخالفت کرتے تھے، ان کو پناہ دیتے تھے، ان کی دل دہی اور دل آسائی کرتے، ان کے لیے مارنے مرنے پر تیار رہتے، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان کی مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمے داری، ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی!

وہ آغوشِ مادر، بازوے برادر اور راحتِ عزیزاں تھے!

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے، بولتے تو معلوم ہوتا بوالہول کی آواز اہرامِ مصری سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے! میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیسؔ کو داد دی ہے۔ ع

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے!

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ، غریو اور غلبہ سے بولتے وہ بہتوں نے دیکھا ہوگا۔ وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے۔ وہ ہر حربے کا جواب صرف اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔

محمد علی پر دولت وشہرت کی بارش ہوئی، محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب کی طرح بہادیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا، لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں، ان کی روح پاک تھی —— طاہر—— کیا معلوم زندہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بوریائے بوذرؓ اور سریر سلیماں کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے!

محمد علی کی موت کی خبر سنی تو تھوڑی دیر کے لیے یقین نہیں آیا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طور پر کیا —— خود موت پر کیا گزری ہوگی!

پھر سوچنے لگا کہ اگر قضا و قدر یہ چارۂ کار پیش کرتے کہ محمد علی کی بجائے ہندوستان کے اور مسلمان لیڈر کو حوالے کرو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جانے یہ فیصلہ دل میں کیسے آیا کہ بہت جلد اور بڑی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلے میں مسلم ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر دیا جاسکتا تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا! لوگ آزردہ نہ ہوں، انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ انھیں خیالات کو کبھی الہام قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن ان کے عجیب تر ہونے کے معنی ہمیشہ مہمل ہونے کے تو نہیں ہیں۔ محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ملک و ملّت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے۔ لیکن جنگ آزما کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسینؓ کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو!

آیئے جہاں کل فاتحِ بیت المقدس نے سر جھکایا تھا وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہِ الحمد۔

....

(علی گڑھ میگزین، اپریل 1933)

●●●

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

(1880-1936)

ڈاکٹر مختار احمد انصاری 1880 میں یوسف پور ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے کوئنس کالج بنارس گورنمنٹ اسکول الہ آباد، میور کالج الہ آباد میں تعلیم حاصل کی اور 1901 میں مدراس کالج سے بی۔اے کیا اور 1910 میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ گئے۔ ڈاکٹر انصاری، پہلے ہندوستانی تھے جو چازنگ کراس ہاسپٹل کے سرجن تھے۔

انگلینڈ سے واپسی پر 1910 میں آپ نے پریکٹس شروع کی۔ 13-1912 میں صلیب احمر کے وفد کے قائد کی حیثیت سے ترکی کا دورہ کیا۔ 1915 میں ایم۔اے۔او کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے۔ 1920 مسلم لیگ کے صدر اور 1924 میں خلافت کمیٹی کے صدر چنے گئے۔ عدم تعاون تحریک میں عملی حصہ لیا، کانگریس کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مدراس میں متعدد اجلاس کی صدارت کی۔ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر ہوئے۔

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور مسلم لیگ اور کانگریس دونوں پارٹیوں میں مقبول تھے۔ وہ ایک بہترین معالج، عوامی خدمت گار اور مخلص سیاست داں تھے۔ 1936 میں ڈاکٹر انصاری کا انتقال ہوا۔

6

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم!

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تو یہ سوال فوراً زبان پر آتا۔ ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جب کہ ان کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطّل رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لیے اس موت کا سدّ باب نہ کر سکے جس کو ان کی نقرئی، چمکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں، ٹال دیتی تھیں اور بھگا دیتی تھیں!

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے رجوع کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ مرض معمولی نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی تاریک اور ویران ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو، اس وقت ان کے مطب کا رُخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صَرف ہوتا۔ ان کے انتظار کے کمرے میں بیٹھا، فتح پوری کی دکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو، گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جاؤں گا، زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا اور زیادہ بے تابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا انتظار کرنے لگتا۔

ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں سے زینے پر چڑھتے اور کسی ہم راہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے۔ دیکھتے ہی مسکراتے اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے ان کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں، کہتے —— بھئی تم کہاں، بڑے عرصے تک غائب رہے، کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ فرماتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہ باتیں اس لب ولہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دل رُبائی کے ساتھ دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس سے پہلے کیوں نہ آیا اور اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا، اس سے بات کرتے جاتے، اور اندازِ گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لیے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہنچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور امید کی روح بیدار کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ مریض یا ان کے اعزہ نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے۔ مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گو وہ مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو اس کی تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

معائنہ کے کمرے میں لے جاتے، مجھے ان کے معائنہ خانوں اور آپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھاٹیا (لکھنؤ) کے حوالے کیا ہے وہ کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے، ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے ہیں۔ ان کی انگلیاں، خوب صورت، سڈول، گداز، پاکیزہ، خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور ان کو وہ اس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابروئیں اور لمبی پلکوں والی، گہری، روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو

بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کردیتا ہے۔ مریض کا معائنہ اس طرح کرتے جیسے وہ ان کا جان چھڑکنے والا بھائی، چہیتا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ ان کی پیشانی ایک روشن فضا تھی جس میں مریض کو امید اور برآنے والی امید کے نقوش نظر آنے لگتے تھے!

معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اسی مریض پر سارا وقت اور توجہ صرف کردیں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو سہارا دے کر اٹھاتے۔ کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا رہنے دیتے اور اس کے پاس کھڑے ہوکر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اُتارتے، کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت کردیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہوکر اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ مطب سے اُترتے ہی فتح پوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہماہمی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جاکر کھانا کھاتا، مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بدپرہیزی سے ازسرنو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھٹ جاتا اور زندگی خوش گوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصّع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتر ان کی اُنگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاؔد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج، ایسا امتزاج جو قوسِ قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرے پر سنجیدگی، آنکھوں میں گہرائی، اُنگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکریو سے جڑے ہوں، خوبی، پُھرتی، صفائی اور اعتماد کے ساتھ علاحدہ کر رہا ہے یا جوڑ رہا ہے اور اُنگلیاں بھی برائے نام آلودہ ہیں۔

مدتیں گزریں میری طفولیت اور الہلالؔ کے شباب کا زمانہ تھا۔ الہلال کے جتنے پرچے آتے ہم سب اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہ سمجھتے وہاں یہ خیال کرتے کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لیے اس کا اور زیادہ احترام کرتے۔ پچھلی بار گھر گیا۔ بچپن کے زمانے کی الماری گرد وغبار سے اَٹی پڑی تھی۔ ایک کاغذ پر اتفاقیہ نظر جا پڑی، دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں جنگِ بلقان میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے ہندوستان سے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانے میں الہلال میں شائع ہوئی تھی۔ نیچے کچھ اس طرح کی عبارت درج تھی:

''اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو، جب وہاں پہنچنا تو خدارا ان کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیوں کہ وہ زخم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔''

وہ زمانہ یاد آ گیا جب ابوالکلامؔ، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے۔ محسوس ہونے لگتا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گزرے ہیں۔ اب بھی جوں کا توں ہے۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندوستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے غازی کہلائیں گے اور دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں۔ آج جب کہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اُٹھتے تھے کہ بچپن کا زمانہ جلد کیوں نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لیے اسلام کا نام روشن کرنے کے لیے، زخمی ہونے کے لیے، سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے؟ ہم بدل گئے زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی۔ رنج و راحت، عزّت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی ہے لیکن جدوجہد کا لطف باقی نہیں رہا، تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں۔ فرائض اور ذمے داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں، لیکن کوئی یہ بتائے یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی، دلوں میں ولولے، ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے پرانے وقت کا ہوں، راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں، ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاعِ کنعاں سمجھتے تھے وہ متاعِ کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصلِ حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رُخ بھی بدل گیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ زندگی برہنگی کو برگزیدگی کا انکشاف کیوں کر مانا جائے، سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے، افراد کی شادی اور غمی کیا ہوگی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور اُمنگ کے نخلستان کیوں فنا کیے جا رہے ہیں۔ زمانے کے بدلنے سے زندگی کی سیئات حسنات میں کیوں کر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلم نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر کوشاں رہے، وہ نفاق و افتراق کو دونوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک طبیب اور ایک حقیقی طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دل سوزی اور قابلیت صَرف کرتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی دیکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی، انھوں نے مرض کے ازالے کی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لیے اس کے علاوہ اور چارۂ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کرتے اور جتنا کر سکتے سب طبیب ہی کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا، کم لوگ ایسا کر پاتے ہیں!

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم، بیوائیں، لاوارث اور نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے۔ اس ایک بڑے پہیّے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ ان لوگوں کی آن بان اور وضع داری کے بھی کفیل تھے جن کو آسیائے گردشِ ایام برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دست گیری معمولی کام نہ تھا، دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صَرف ہوتا ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے

جنھوں نے اس طرح کی مدد، کشادہ جبینی اور دریادلی کے ساتھ دوسروں کی ہوگی، اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اس نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو!

انھوں نے خوب کمایا، خوب صَرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب خود ان کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ رہتا۔ لیکن ان کی زندگی میں کسی ایسے کو، جس کے کفیل وہ تھے کبھی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ان کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر مرحوم کے احسانات تھے وہ کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم اکثر بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اُٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دیتے وقت اس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

مرحوم، جامعہ ملیہ کے استحکام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے ان کی جو اُمیدیں اور ولولے اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ رمضان کی ایک شام ذاکر صاحب کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت دیکھنے اوکھلہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اوکھلہ کے صاف اور سادے ورق پر ایک نقش اُبھر رہا تھا، بدیع و بلند، عمارت کے نقشے پر دیوار و در کہیں کہیں سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ تصور تصویر میں منتقل ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا تھا جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے، بالیدہ ہوتا اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

—— دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آ گئے!

(جامعہ، دہلی۔ مئی 1937)

●●●

مولانا سید سلیمان اشرف

(1878-1939)

سید سلیمان اشرف 1878 میں صوبۂ بہار کے ایک قدیم دینی و علمی گہوارہ بہار شریف کے محلہ میر داد میں پیدا ہوئے۔ گھریلو دینی تعلیم کے بعد آپ کے والد حکیم سید محمد عبداللہ نے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے جون پور بھیج دیا۔

1909 میں ایم۔اے۔او کالج میں شعبۂ دینیات میں بحیثیت لیکچرار کے آپ کا تقرر ہوا۔ترقی کرتے ہوئے آپ نے صدر شعبۂ دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کی ذمہ داریاں پوری کیں۔

تقریباً تیس سال تک شعبۂ دینیات کی خدمت کر کے 25/اپریل 1939 کو آپ کا انتقال ہوا،اور علی گڑھ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا کی دس تصانیف ہیں۔جن میں سے 1۔ المبین ، 2۔الانہار، یعنی ترجمہ ہشت بہشت خسرو،3۔امتناع النظیر ،4۔والسبیل موضوع کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

o

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری![1]

مولانا سید سلیمان اشرف اس جہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لیے اب کسی اور میں نہیں۔ میرا ان کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا صرف علی گڑھ کا رشتہ تھا، لیکن کس سے کہوں اور کون سمجھے گا کہ اس رشتے میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے، بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست!

پریشان ہوتا تو ان کے ہاں جاتا، جی گھبراتا تو وہاں جاتا، خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا — اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ گھنٹوں بیٹھتا، کوئی معمولی جان پہچان یا تعلقات کا آدمی پہلے سے موجود ہوتا تو اسے رخصت کر دیتے، کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا اسے اُٹھنے نہ دیتے۔ جو کچھ موجود ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے اور ایسا کبھی نہ ہوا کوئی چیز موجود نہ ہو۔ مجھے چائے کا شوق نہیں، مرحوم اس کے بڑے شائق تھے اور بڑے تکلف سے پیتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے، کہتے پی لو، پھر گپ ہوگی۔ ایک پان کھاؤ۔ دوسرا مجھے بنا کر دو۔

میں کہتا آپ کے ہاں چائے میں نہ شکر، نہ دودھ۔ فرو کیسے ہوگی؟ کہتے میرے لیے پیتے ہو یا اپنے لیے؟ دبی زبان سے کہا۔ بیوی بچوں کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی کبھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ لیا کرو۔ کہتا آپ رام پوری تمبا کو کھاتے ہیں، یہ میرے بس کی نہیں۔

---

1. رام نرائن موزوں

کہتے چائے میں دودھ شکر اور پان میں خوشبودار تمبا کو کھاتے ہو، نشہ کا احترام کرنا نہ آیا۔ آواز دیتے جُمّا! رشید کی پیالی میں شکر ڈالنا۔ پھر پکارتے، 'چھُمّن' (غلام غوث صاحب) رشید کو تمبا کو دو۔ بڑے مزے کی خوشبودار تمبا کو ہوتی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو، بال بچے کیسے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو میں خود کہتا یا انھیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی مجھے گھر سے بُلوا نہ بھیجا۔ کیسی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ چلتے پھرتے ملاقات ہو جائے گی تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے۔ ''اچھا اب جاؤ''۔

ایک دن دو منزلے (آدم جی[1] پیر بھائی منزل) کے سامنے سے تیزی سے سائیکل سے گزر رہا تھا سامنے چبوترے پر ٹہل رہے تھے، پکارا ذرا ٹھہرنا، میں رُکا، سائیکل کو چبوترے سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا۔ فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، وہ تمہارا یار اصغر (اصغر گونڈوی مرحوم) اب کے الٰہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا۔ کیا شعر کہا ہے:

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص مترنّم کسی قدر حزیں لیکن پُر وقار لہجے میں پھر پڑھا کہنے لگے رشید اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الٰہ آباد تک ساتھ رہا کڑھا ہوا آدمی ہے۔ اب کبھی آئیں تو ضرور لانا، اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سناؤں گا، اس وقت جاؤ، خوش رہو!

مرحوم کے یہاں کوئی خاص موضوع گفتگو کے لیے مخصوص نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی، ہر بات بے ضغطہ زبان کہتے ''بے ضغطہ زبان'' انھیں کا فقرہ ہے، کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثقاہت کی زبان پر نہیں آتے، لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا برجستہ کہتے کہ اس لفظ کی بدنمائی کی طرف

---

1 یہ عمارت سرسید ہال شمال پر واقع ہے۔ نچلے حصہ میں پرووسٹ کا آفس ہے اور بالائی منزل پر طلبا کے لیے کمرے ہیں۔

ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں حلاوت تھی۔ کبھی کبھی بہار کا کوئی لفظ بول جاتے اور کہہ دیتے کہ یہ خاص ہمارے دیار کا لفظ ہے، ایسا جامع لفظ کہیں اور نہ ملے گا!

کرسی ہو مونڈھا ہو، صوفا ہو، تخت ہو، بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے۔ پاؤں اُٹھا کر اور سمیٹ کر، اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے اور باتیں کرتے۔ نشست کا ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چبوترے سے متصل نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے، ایک طرف چارپائی بھی ہوتی بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لیے کوئی اچھی کرسی یا صوفا وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا جو موجود ہوتا اسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا۔ مجمع دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی سے آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا نووارد سے مرعوب ہیں یا اس سے خاص طور پر مخاطب ہیں۔ بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن مولانا ہر ایک سے ایک ہی اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولانا کا پرانا نوکر جُمّا اسی طرح نواب صاحب کو چائے کی ایک پیالی لا کر دے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا، وہی بے ضغطۂ زبان گفتگو، وہی نشست، وہی فضا، جس کا جی چاہا اُٹھ کر چلا گیا۔ اسی دوران میں معزز نووارد بھی تشریف لے گئے، مرحوم اپنی جگہ پر جوں کا توں باغ و بہار یا کوہِ وقار بنے بیٹھے رہے!

زندگی میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اکثر محسوس ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں گنوار پن بھی ہے، کوئی عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت، تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی، اللہ والے ملے تو انھیں دنیا کے کام کا نہ پایا، کسی منکر کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسولؐ کی شرافت عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور موقع سے اس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ ان کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں کمی ہے جسے پورا کرنے کے لیے کسی اور کو ڈھونڈنا چاہیے۔

بیس بائیس سال سے ساتھ تھا، پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں نووارد کسمپرس طالب علم تھا۔ جب ساتھ چھوٹا ہے تو سب کچھ تھا۔ دوسروں کے نزدیک نہ سہی اپنے نزدیک سہی۔

اس مدت میں بہت کچھ دیکھا، سنا اور برتا اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں۔ مرحوم نے جو سلوک ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ مولانا کی صحبت سے جب کبھی اُٹھتا تو معلوم ہوتا کہ کوئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا حوصلہ اور اچھا جذبہ پیدا ہوگیا۔ پریشان و مایوس ہوا تو ان کے یہاں سے بشاش اُٹھا، رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہوگیا۔ خالی الذہن گیا تھا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اُٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہوسکتے۔

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے۔ یونی ورسٹی پر تحقیقاتی[1] کمیٹی بیٹھ چکی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر زد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے، اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اس زمانے میں مولانا کو دیکھا کیا مجال کہ روزمرّہ کے معمولات میں فرق آجاتا۔ جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدے میں لوگ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔ ایک شب میں حاضر ہوا، مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے، عرض کیا۔ مولانا کیا ہونے والا ہے، خدانخواستہ نوع دیگر ہوا تو کیا ہوگا، کہنے لگے رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ چھیڑوگے، ہوگا کیا وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ اس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈروگے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ تو ہو چکا ہے پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ؟

---

1. رحمت اللہ کمیٹی 1927 میں یونیورسٹی کے معاملات کے سلسلہ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے سربراہ سر ابراہیم رحمت اللہ تھے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے نتیجے میں یونیورسٹی کے انتظامی اور تعلیمی ڈھانچہ میں تبدیلیاں ہوئیں۔ بعض اساتذہ کو نکال دیا گیا، سر ضیاء الدین کو بھی استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ (مرتبین)

مرحوم پر اس وقت جلال سا طاری تھا۔ شہنشاہیتِ روما کا وہ عہد یاد آ گیا جب گاگس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشے میں آ کر سینٹ کا رُخ کیا جہاں کا ہر رُکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر دیا۔ لیکن کسی سینٹر نے اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ وزاری کی۔

وہ دن گزر گئے جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی ہو چکا۔ مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے آج اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مرحوم کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کی تاریخی دومنزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوتے تو بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

1921 کا زمانہ ہے، نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔ 'گائے کی قربانی' اور سوالات پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس زمانے کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کیا سے کیا ہو گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی۔ کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہو رہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔ اس زمانے میں، میں اسی دومنزلہ کے پچھلے کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کی نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حدِ فاصل تھی جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا۔

کہتے تھے رشید! دیکھو، علما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھر گھروندا بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر ان ہی باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں

چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے۔ لیکن کیا کروں خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے پڑھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اٹھایا اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ کہتا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ کہتے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہڑگم کا اثر ہے اور سمجھتے ہو کہ یہ تمام علما جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں یہ بات نہیں ہے، ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا، آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علما سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے، اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مرحوم نے کہا کہ آپ نے ان کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا، لیکن میں ان کلمات کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ اس سے بدمزگی اور پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے!

تیس سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا، جون پور میں سیرت رسولؐ کی تقریب تھی۔ مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی۔ زبردست اجتماع تھا۔ مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے، حاضرین کی خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی متنفس ہو! اتنے میں دور سے ایک بوڑھا پستہ قد، منحنی شخص جُھکا ہوا انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا، وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا، مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری مرحوم کے استاد اور جون پور میں اس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و طنطنہ تھا ان کی شفقت میں بھی جبروت کارفرما تھا۔ مرحوم کو جھجک کر یا گول مول باتیں کرتے کبھی نہ پایا۔ ایک بار خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک بڑے صاحب منصب نے حاضر ہو کر عرض کیا مولانا براہِ نوازش آج شب کا

کھانا غریب خانہ پر تناول فرمایئے۔ مرحوم نے بغیر کسی تامل کے بے لاگ کہا۔ نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھاتا نہیں ہے یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ صاحب مایوس وخفیف ہوئے لیکن مرحوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہم سب سخت متحیر ہوئے۔ مرحوم نے فرمایا، جی ہاں میرا ان کا کوئی کھاتا نہیں ہے۔ میں ہر شخص کا مہمان نہیں بنتا۔ اس قسم کے کتنے اور واقعات ہیں۔ کئی سال کی بات ہے مرحوم اجمیر شریف جارہے تھے، اتفاق وقت جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے والے تھے اسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مرحوم آزردہ تھے، انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لیے تشریف لائے ہیں۔ دل میں خوش ہوکر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مرحوم نے بغیر کسی پس وپیش کے فرمایا 'جی' اس سعادت کے لیے دوسرے آئے ہوئے ہیں، میں ہاتھ نہیں ملاتا، یہ کہہ کر اپنے ڈبّے میں سوار ہوگئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسے میں شریک نہ ہوئے، کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتے کہ اس سے یارانہ نہ ہوتا۔ مرحوم کی ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین و مذہب سے دور کا بھی سروکار نہیں اور ایسوں سے بھی جو اپنے وقت کے بڑے جید عالمِ دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت واحترام کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن ومسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت نہ ملتی، کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے، اس معاملے میں بڑے 'کھرّے' تھے۔ کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیفِ قلب نہ کی۔ لیکن جن سے خاص تعلقات تھے ان پر جان دیتے تھے، اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اس کی خوشی سے باغ باغ ہوجاتے۔

مرحوم کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے اور اکثر ایسے ناروا اور رکیک حملے کیے گئے کہ انھیں یاد کر کے آج تک میرا دل کڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے قلبی نفرت پیدا ہوگئی ہے لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہے۔ ایک دن معلوم نہیں کون سا موقع تھا، اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو فرمایا، اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے ''چلو آگے بڑھو۔

یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے۔ صاحب زادہ ہو، یہی دیکھتے ہو کس کے خلاف کہہ رہا ہے، لڑائی مجھے پسند ہے لیکن بہادروں سے، بیسواؤں سے نہیں!''

مرحوم کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس تو کرتا ہوں لیکن اس کی وضاحت نہیں کر سکتا، ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے۔ مرحوم کے دن رات کے اُٹھنے بیٹھنے والوں میں فرداً فرداً کوئی خاص جاذبیت نہ تھی، لیکن یہی لوگ جب ان کے حلقے میں بیٹھے ہوتے یہ مجموعہ نہایت دل کش معلوم ہوتا اور ہر شخص فرداً فرداً نہایت دل پذیر۔ اور یہ بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مرحوم کے کمروں کے اندر جو چیز جہاں رکھی ہوتی اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔

کم و بیش بیس سال سے مرحوم کے کمروں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں ہیں۔ جو چیز جہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک موجود تھی۔ کرسیوں کی وہی ترتیب، کتابوں کی الماری اسی جگہ پر، تخت کی وہی جگہ، وہی پوشش، کھونٹیوں کا وہی مقام، پاندان اسی کرسی پر، چھوٹے چھوٹے بکس اور ٹوکریاں، تخت کے نیچے۔ آتش دان پر گھڑی، بوتل، چائے کا ڈبا، دو چار پیالیاں، شلف پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار، تخت کے اوپر کھونٹیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیروانیاں، اور خوش رنگ صافے، ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کی شخصیت کے یہ سب عناصر ترکیبی ہیں۔ اب ادھر سے گزر ہوتا ہے تو دومنزلہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی، دل بھر آتا ہے!

میرا پہلا مکان دومنزلہ سے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازے کے سامنے سڑک کی دوسری جانب درختوں کی جھلملی میں دومنزلہ کا قوسی برآمدہ اور چبوترہ نظر آتا تھا، گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا، طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی، کبھی کبھی دروازے سے باہر نکلتا تو مرحوم اپنے چبوترے پر لمبی کشادہ آستینوں کا ململ کا سپید کُرتا پہنے سر پر قیمتی مخمل کی گول ٹوپی، پاؤں میں دلّی کی نازک پُرزہ جوتی پہنے، سر نیچے کیے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرتے نظر آتے دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی، سوچتا کہ مرحوم اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر گُن گُنا رہے

ہوں گے، اگر چلا جاؤں تو وہ اس طور سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بس اتنا ہی احساس میری تسکین قلب کے لیے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آ جاتا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولانا کے ہاں جاؤں اور جی بھر کر ان کی شفقت، مرحمت اور لطافت وظرافت سے جی سیر ہو۔

مرحوم کو میرے بڑے لڑکے اقبال[1] سے بڑا اُنس تھا، حالاں کہ ان کا تمام عمر خود اپنے کسی بچے سے سابقہ نہیں ہوا تھا، وہ صرف چند مہینوں کا تھا کہ اسے بُلا بھیجتے۔ گود میں بٹھاتے اس کا نام کدّو رکھا تھا پیشاب کر دیتا تو کہتے، ابے کدّو، تو نماز نہ پڑھنے دے گا۔ اچھا کوئی ہرج نہیں، کر پیشاب بڑا ہو گا تو کہے گا مولانا ابا پر پیشاب کر چکا ہوں پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی اُنگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدّو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص دل نشیں لیکن پُر وقار لحن میں کہتے: ''ٹُوم ٹُوم رے باجے تو مڑی ٹُوم ٹُوم رے باجے تو مڑی، ہاں ناچ بے کدّو ناچ۔''

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لے کر بھیکم پور چلے گئے، بغیر ہم سب کو اطلاع کیے۔ دوسرے دن واپس آئے، بے حد خوش۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بالکل تنگ نہیں کیا، لیکن مرحوم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انھوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ یکا یک بغیر کہے سُنے کیوں اقبال کو بھیکم پور لے گئے کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لیے بغیر کہے سنے اس کو ہاتھرس لے کر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانے میں بچے کو دیکھ کر کہنے لگے، کدّو تیرا باپ تجھے اچھے کپڑے نہیں پہناتا۔ اچھا دیکھ تیرے لیے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پُر تکلف اچکن پہنائے ہوئے حسب معمول اسے نچا رہے ہیں۔

حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں سے اس کے لیے ایک نہایت خوب صورت چغا اور عقال لائے۔ اقبال رات میں روتا تو صبح کے وقت آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدّو کیوں رویا، اسے بھیج دو۔ اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خود لے کر جاتا، بہت خوش ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے، پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے اور

---

[1] اقبال رشید صدیقی (پیدائش 1924) رشید صاحب کے سب سے بڑے بیٹے۔ کراچی میں مقیم ہیں۔

کہلا بھیجتے کہ یہ کدّو کے لیے ہے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے ابے کدّو اب میں بیمار ہوں اور بڈھا ہو گیا ہوں۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں؟

اکثر کہا کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو۔ اسے عربی فارسی پڑھاؤں گا۔ اب کدّو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لیے اب اسے دوسرا ناچ نچاؤں گا۔ اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا۔ میں پریشان رہنے لگا، مرحوم نے سُنا تو فرمانے لگے: ''ارے کدّو کا جگر خراب ہے، گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ، یہ کتابی باتیں بتاتے ہیں، مریض کو نہیں پہچانتے، پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ ہو گا لیکن کدّو سے کہہ دو ناچتا رہے۔ تُوم تُوم رے باجے تومڑی! اچھا جاؤ!''

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے مخلصوں اور بے تکلف دوستوں کو سُناتے، ملتا تو مضمون کے بارے میں اپنی رائے بھی سنا دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انھوں نے مضمون سنایا اور کس نے کیا کہا۔ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا، ایک دن یونیورسٹی آفس سے اُتر کر اسٹریچی ہال کی طرف آ رہے تھے، میں سڑک سے گزر رہا تھا، سلام کیا، بولے: اجی یہ تم کیا مہمل لکھنے لگے ہو، اس دفعہ کا مضمون بڑا لغو تھا، ہاں بالکل بے سر و پا، اچھا جاؤ اپنا کام دیکھو، میں نے چاہا کچھ کہوں، کہنے لگے: بس بس آج اتنا ہی۔ وہ دیکھو تمہارا یار آ رہا ہے۔ جاؤ!

مرحوم کی زندگی کا ایک پہلو یہ تھا کہ جو چیز رکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور دل کش ہوتی، قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی۔ ہمیشہ پاکیزہ قیمتی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے اونی کپڑوں کا بہت شوق تھا، شیروانی یا روئی دار اچکن کا کپڑا دل کش ہوتا۔ ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عبا منگائی تھی، فاختی رنگ کا کپڑا، جس پر اُبھرے ہوئے ریشمی پھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن پہنچا تو بولے، خوب آئے۔ گھسن (غلام غوث صاحب) وہ عبا تو لانا، یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مالِ غنیمت ہیں۔ عبا لائی گئی بڑے شوق سے پہنا بولے، کیا رائے ہے؟ میں بہت قریب پہنچ

کر دیکھنے لگا۔ اس پر ہاتھ پھیرا اور ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگا۔ بولے، خیریت تو ہے اس قدر انہماک کا اظہار کیوں؟ میں نے عرض کیا: کیا کہوں، اسی طرح کی ایک چیز اس دن جلسے میں نواب مزمل اللہ خاں کو پہنے دیکھی تھی، ان کے قریب تو جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آج آپ کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس تختِ طاؤس کو ذرا چھو بھی لوں! ہنسے، فرمایا: باز نہ آؤ گے؟ اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بتاؤ، وہ تمہارا یار ذاکر کہاں ہے؟ بڑا مرد آدمی ہے، ذرا صحبت اچھی نہیں ہے، میں نے کہا، جی ہاں ان دنوں صحت اچھی نہیں ہے۔ بولے، یہ کیا، میں کہتا ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے پڑا ہے، تم کہتے ہو صحت اچھی نہیں۔ پھر آواز دی۔ جُمّا ذرا ایک طشتری میں پنڈی تو لانا۔

مرحوم کے معمولات بھی غیر معمولی تھے۔ سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا تو بالکل صحن میں لیکن ادھر چند سال سے برآمدے میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر رضائی اوڑھ کر، بستر گداز، چادریں ستھری، تکیے متعدد، پنکھے کا کوئی دستور نہ تھا۔ گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی کہ پسینہ آنا بہت اچھا ہے۔ شام کا نہانا اور دھوپ میں بیٹھنا منع کرتے تھے، دوسرے کے تولیے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے۔ ننگے سر بہ مشکل دیکھے گئے، گفتگو بلند آواز سے کرتے، کانا پھوسی گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلی کی پرزہ۔ ململ کا لمبا بڑا کشادہ آستینوں کا کُرتا پہنتے جس کے نیچے ہمیشہ ململ کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ اچھا کپڑا پہنے دیکھتے تو خوش ہوتے اور تعریف کرتے، ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے، سالن تیز مرچوں کا پسند تھا۔ ہمیشہ چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کھاتے، نوکروں کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی نہیں سیدھی ہوتی تھی، جسے دوست رکھتے اس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش دلی کا فقرہ ضرور کہتے۔ مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے، کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے، نہ کسی کے اقتدار سے، مذہبی عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے۔ بڑا ہوتا اس سے کہیں بڑا ہو کر ملتے، علم کا وقار ان کے دم سے تھا۔ معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا!

قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ چھلکتا رہتا، نظر تیز و پُر اعتماد، انداز میں بانکپن، اُنگلیاں ایسی جن میں قلم شمشیر و رُباب سب ہی زیب دیں، آواز میں کڑک اور لچک دھمک بھی، خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے، نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، یخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن کر اُترتی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب دینیات غالباً موجود نہ تھے۔ مرحوم امامت کے لیے آگے بڑھے، تکبیر ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا: اللہ اکبر، ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو قرأت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے خالدؓ کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی، لرزتی، گرتی، لچکتی، کاٹتی، سمٹتی، تیرتی، اُبھرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی لمبی سورہ تھی، جب تک ختم نہ ہوئی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں بھر گئی ہیں، اور شوقِ خودسپاری میں ہمیں نہیں در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں۔ اس دن کی نماز اب بھی یاد ہے اور یہ بھی کہ وقت آ گیا تو شوق شہادت دنیا کے ہر نشیب و فراز اور زندگی کے ہر تامل و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے۔ اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجیے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار ——!

المبین[1] شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ سر اقبالؔ مرحوم کو بھیجا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبالؔ مرحوم اپنے لکچروں کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔ المبین کا ذکر چھڑ گیا۔ سر اقبالؔ نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے میرا ذہن نہیں منتقل ہوا تھا۔ گفتگو ہوتے ہوتے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبالؔ مرحوم نے فرمایا کہ ”مولانا دوسرے ایڈیشن میں

1 المبین۔ عربی زبان پر سید سلیمان اشرف کی تصنیف ہے۔

اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجیے تو بہتر ہوگا۔'' ایک ذی وجاہت بزرگ جن کو یونیورسٹی کے نظم ونسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن وسال اور قومی خدمات کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی، مرحوم سے ذرا فاصلے پر دسترخوان پر موجود تھے، وہیں سے آواز دی۔ ''ہاں مولانا میری بھی وہی رائے ہے جو سر اقبال نے دی ہے، دوسرے ایڈیشن میں.....'' اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے للکارا۔ ''........صاحب! بس کیجیے، آپ کھانا کھائیے آپ کو ان باتوں سے کیا نسبت؟ ان باتوں میں نہ پڑیے۔ کھانا کھائیے ـــــ ملاحظہ فرمایا نا۔ ہاں۔ بس کھانا کھائے جائیے!''

ایک اور بزرگ دینیات کے نصاب سے دلچسپی لینے لگے، مقررہ نصاب کی کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلۂ خیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انھوں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ ایک دن حلقۂ چائے نوشی میں آکر شریک ہوئے اور تھیالوجی کا تذکرہ چھیڑ دیا، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا ـــــ ''آپ کو دینیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں۔'' وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں آموں کا تذکرہ آ گیا۔ اس میں نو وارد نے بڑے انہاک سے حصہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے فرمایا ـــــ ''یہ ٹھیک ہے۔ اس پر گفتگو کیجیے۔ ملاحظہ فرماتے ہو نا یہ آپ کا حق ہے!''

مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے آپس میں بے تکلفی تھی ورنہ ظاہر ہے اس خانقاہ میں کون بار پا سکتا تھا، چلّے کی سردی تھی، مرحوم حسب معمول برآمدے میں سو رہے تھے اور مہمان کمرے کے اندر، مہمان تہجد کی نماز پڑھنے اُٹھے، دروازہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی، پوچھا کون؟ جواب ملا کوئی نہیں میں ہوں۔ بولے: خیر تو ہے؟ کہا وضو کروں گا، بولے تو کیجیے نا، نیند کیوں حرام کرتے ہیں؟ انھوں نے دبی زبان سے کہا تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا: جہنم میں ملے گا، انھوں نے جواب دیا تو اُٹھو راہ بتاؤ۔ مرحوم نے قہقہہ لگایا، بولے: نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا!

ایک دن کلاس پہنچے، خلاف معمول بہت کم لڑکے نظر آئے، پوچھا کیا بات ہے؟ معلوم ہوا، باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکے کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا چھٹی دے دیجیے تو ہم بھی دیکھ آئیں، بولے: ہاں چھٹی ہے، مقصود حاضری تھی، لڑکے نے جواب دیا حاضری لیجیے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا: حاضری اپنی مقصود تھی، تمہاری نہیں، جاؤ جاؤ میچ دیکھ آؤ!

ایک زمانے میں کلاس میں لوائح جامی[1] اور گلشن راز[2] پڑھایا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے کبھی کبھی اپنی دقتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بہت خوش ہوتے۔ کہتے، بیٹھو، عرض کرتا کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اٹکتا ہوں۔ فرمایا: یہی تو مصیبت ہے تفصیل سے باتیں نہیں سنتے تھوڑا سا پالیا اور بھاگ نکلے، طالب علم یہ نہیں کرتے، یہ کام اٹھائی گیروں کا ہے۔ پگڑیاں ہوں یا ڈگریاں۔ علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے۔ میں نے کہا۔ مولانا گھنٹہ ہونے والا ہے آخر اٹھائی گیروں پر بھی تو برا وقت آتا ہے، کہتے اچھا اچھا، بولو، پڑھو، میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے، پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو پھر کہتا ہوں قرآن پڑھ ڈالو، لوائح جامی اور گلشن راز کلاس میں پڑھا دو گے، لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت چھیڑنا، آگے تم جانو تمہارا کام اور ہاں ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جائے گی۔ کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ!

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خانقاہِ سلیمانیہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار پا جاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ

---

1. لوائح جامی۔ جامی کا تصوف پر رسالہ۔
2. گلشن راز جامی کا تصوف پر رسالہ۔

صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف وتوصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا مہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا بھائی میں تو مولانا لطف اللہ مرحوم کی کرامت کا قائل ہوں۔ نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا، کیوں کر؟ مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا — ''اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے!''

کئی سال ہوئے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زنانی سواریاں آئی ہوئی ہیں، کہا چلو مولانا کے ہاں ہو آؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں 'کلاسیکل' چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر پاؤں اٹھائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کوئی چیز بڑے غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا مخل تو نہیں ہوا؟ بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بتاتا ہوں، بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ کر کے بولے: ٹھکانے سے بیٹھو، گپ ہوگی، تھوڑی ہی دیر میں پرچہ علاحدہ رکھ دیا۔ عینک کو اس کے خانے میں رکھا، پھر بولے: سنو۔

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

بے نظیر شاہ کو جانتے ہو، نا، میں نے کہا جی، شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا، کہنے لگے اور سنو:

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

بولے: یہ شخص چھوٹی بحر میں کہنے کا بادشاہ ہے، میں نے کہا درست 'بادشاہوں' کا کیا کہنا، بے اختیار ہو کر فرمایا: وہ بھی ٹھیک کہتے ہو، ہاں ہاں ہم سمجھے، بادشاہوں کا کیا کہنا؟

عرض کیا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا؟ فرمایا نہیں یہ نہیں، ایک اشتہار تھا میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے قوم کے رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ یہ دوا کا اشتہار تھا۔ دنیا میں اور امراض کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی مرض ہے، جدھر دیکھو قوتِ مردمی کا ماتم، جہاں دیکھو مایوس العلاج، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کرتوت ہیں، کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری اردو کہاں

جارہی ہے۔شروع سے آخر تک یہی اشتہارات، یہی امراض۔عرض کیا جی ہاں! فرمایا: اچھا کھانا کھالیا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں، کہنے لگے: یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھالوں تو گپ ہوگی، تمھیں نہیں کھلاؤں گا۔آج کل صرف ایک پھلکا اور کدّو گوشت کا سیٹھا پھیکا شوربا ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ تو قائم سی ہوگئی ہے، ہنسے، آواز دی چُمّا! نکلیتوں کے لڈّ ولاؤ!

لڈّو آئے تو بولے کھالو منیر کے ہیں منیر کے — منیر کا نام سُنا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں، خط وکتابت بھی رہی ہے، بولے ہائیں یہ کیا؟ میں نے کہا، وہی برادرم شمس الدین وزین الدین، ہنسے، فرمایا: خوب یاد رکھا اور ہاں ایک کدو کے لیے لیتے جانا۔ کدّو اب بڑا ہوگیا۔ ہاکی کھیلتا ہے، خوب ناچتا تھا۔ کدّو کہیں کا!

کھانے سے فارغ ہوئے، حسبِ معمول صراحی سے براہِ راست حلق میں پانی انڈیل کر پیا، ہاتھ دھوئے اور سُرخ لمبے چوڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر چبوترے پر مونڈھے پر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر تک خلال کرتے رہے، میں نے پان بنا کر دیا، اسے لے کر منہ میں رکھا، مونڈھے سے ذرا ایک طرف مائل ہوکر پہلی پیک براہِ راست پیتل کے چمک دار اُگال دان میں ڈالی جو ٹھیک اُگال دان کے سوراخ میں جا گری لیکن اُگال دان کے حاشیہ پر چھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح اپنی اونچی کرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اُگال دان میں پیک ڈالتے تھے اور اس کے حاشیے تک پر چھینٹ نہ پڑتی تھی۔

چاند کا غالباً تیسرا ہفتہ، اکتوبر کا مہینہ، رات کسی قدر بھیگنے لگی تھی چاند افق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا لیکن اس کا مدّھم ٹھنڈا اُجالا درختوں کی پتّیوں اور عمارات کے کنگروں پر نمایاں ہو چکا تھا بولے: کل رات میری طبیعت گھبرائی، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بالآخر دل میں آیا کہ مُردوں سے گفتگو کروں، کہو کیا سمجھے، میں نے کہا بالکل نہیں سمجھا، کہا ہاں مُردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی۔ فرمایا: وہ پلندا نکالا جس میں 30-25 برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں میں سے جو وفات پا چکے ہیں ان کے خطوط، وہ خطوط جو انھوں نے زندگی میں لکھے تھے ان سب کو نکالا۔ بعض بالکل شکستہ تھے۔ بعض کی سوادِ تحریر بے نور ہو چکی تھی۔ بعض اس طرح لفافوں میں رکھے ملے جیسے ان کو کھولا ہی نہیں تھا۔ مہریں تک پھیکی پڑ گئی ہیں۔ بڑی احتیاط سے

کھولا۔ ذرکر محبت سے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی جھجک کر، ان سے باتیں کیں۔ وہ زمانہ یاد آ گیا، جب زندگی عبارت تھی ان کے خلوص سے ان کے جھگڑوں سے ان کی فرمائشات سے کسی میں کسی کے آنے کا مژدہ تھا، کسی نے بلایا تھا کسی نے مجھے پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں۔ پھر محسوس ہونے لگا کہ سب زندہ ہیں، میں ہی مر چکا ہوں۔

پھر رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے، تم تو جانتے ہو بھائی صاحب مرحوم پورے پاگل تھے........ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں، اس وقت ناواقف مجھ سے آزردہ ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن تم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سریع السیر، ایسا شفاف اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس........ اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے۔ تم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا خوش ہو گئے، کہا ایک پان بناؤ، میں ذرا پانی پی لوں، پان کھا کر اور پانی پی کر تھوڑا ٹہلے، پھر بیٹھ گئے، کہنے لگے: یہ ذہن اور اس کے تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے۔ بہت واضح اور نہایت بامعنی۔ وہ تمہاری عقل اور تمہارے اکتسابات شعوری و غیر شعوری سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے تصورات زیادہ مخلصانہ ہوتے ہیں وہ حقیقت پالیتا ہے۔ نتیجے نہیں استنباط کرتا، اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

.... کا خط دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا سامنے موجود ہے۔ میں نے اسے چھوا۔ میرا گھر بنوار ہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ کر جاتا ہے وہاں سے آواز دے رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ پھر بولے........ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے طور پر یاد نہیں۔ کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لفافے میں بند پھر رُکے، کہنے لگے سب موجود ہیں۔ خوب بات کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ اب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں ہنستے بولتے ہیں۔ سبھوں کو بند کر رکھا ہے۔''

اتنے میں ایک تانگا آیا۔ ایک صاحب نے اُتر کر کسی کا پتا دریافت کیا۔ معلوم ہوا جیسے مرحوم کے اردگرد تصورات کی کچھ مرئی کچھ غیر مرئی بھول بھلیاں قائم ہو گئی تھیں۔ وہ یک بہ یک

فضا میں تحلیل ہوگئیں۔ بولے، بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں۔ میں نے کہا رات زیادہ آئی۔ اب گھر جاؤں گا۔ کہا جاؤ!

عرصہ کی بات ہے ایک دن فرمانے لگے، ''اب تک اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ ہم جیسا خبطی شاید ہی کہیں ملے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بگڑے دل نکلے۔ صبح کمرے میں سو رہا تھا حسبِ معمول رضائی اوڑھ کر اور کمرہ بند کر کے۔ ایک صاحب نشست کے کمرے میں آئے، دیکھا کوئی نہیں ہے سونے کے کمرے پر آکر دستک دی اور سلام علیک کچھ اس انداز ولہجہ سے کیا کہ میں چونک پڑا۔ رضائی کے اندر ہی سے جواب دیا ''وعلیکم السلام۔'' فرمایا، 'مزاج شریف'، میں نے کہا، ابھی آنکھ لگی تھی، فرمایا۔'' آپ کے ملاحظہ کے لیے ایک کتاب بھیجی تھی، جواب میں عرض کیا گیا، ''بھیجی ہوگی آتی ہی رہتی ہیں، بولے،'' آپ نے مطالعہ کیا؟'' میں نے کہا،'' یہ کیا ضرور ہے کہ مطالعہ کی جائے۔'' یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی، '' آپ کی دو باتوں کی شہرت سنی تھی۔ ایک اخلاق کی اور دوسرے علم کی۔ اخلاق کا تو حال معلوم ہوگیا علم کی بھی کسی دن تصدیق ہو جائے گی۔ سلام علیکم!'' میں گڑبڑا کر چارپائی سے اُٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرے میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔''

دوست بنانے اور معالج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے سنو جی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا، معالج سے فائدہ ہوتا ہے۔ جب تک معالج ٹکر کا نہ ہو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلے میں ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ دلّی کے کسی اصلی حکیم سے رجوع کروں۔ بہت غور وفکر اور تلاش کے بعد ایک ایسے طبیب کا انتخاب کیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور اطبا کے استاد رہ چکے تھے۔ اسّی پچاسی کا سن بڑے متدّین، پرہیزگار اور صاحبِ کمال تھے۔ خیالات بھی عجیب وغریب تھے، یہ ناممکن تھا کہ ان کے مطب میں کوئی ترکی شخص ٹوپی اوڑھ کر چلا جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آگئے تھے تو ایسے بپھرے کہ سارا مطب زیر زبر ہونے لگا اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں نماز پڑھتا ہوں وہاں یہ مسخرہ تُرکی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہن کر چلا آیا۔ مرحوم

نے حکیم صاحب سے ملاقات کی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی، قبض رہتا ہے، تبخیر کی شکایت ہے، خیالات منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں، اختلاج کی تکلیف ہو جاتی ہے، کبھی کبھی خفقانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، نیند بہت کم آتی ہے، وغیرہ۔

حکیم صاحب غور سے سنتے رہے اور سر اس طور پر ہلاتے گویا ہر بات دل نشیں ہوتی جارہی ہے کہنا ختم ہوا تو حکیم صاحب بولے، ٹھیک ہے، بالکل بجا فرمایا، ایسا ہی ہوتا ہے، ایسا ہونا چاہیے۔ مرحوم نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجیے۔ بولے، جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، شرفا کا مرض ہے، شریفوں کو یہی شکایت لاحق ہوتی ہے، مرحوم نے فرمایا آخر کوئی علاج؟ بولے بالکل نہیں کوئی مرض ہو تو علاج کیا جائے۔ اشراف ان ہی شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں!

میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کالج کھلنے والا تھا، مرحوم وطن سے تشریف لارہے تھے، میں الٰہ آباد میں ملا، مرحوم سکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اور مرحوم کے بڑے بھائی جو عرصہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے ہمراہ تھے، مجھے دیکھا، بولے یہیں آجاؤ، کھانا کھایا جائے گا۔ عرض کیا۔ سکنڈ کلاس میں کیسے بیٹھوں؟ کہنے لگے کھانا کھانے کے لیے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا، تم تو آہی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈبے میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ 'فورٹ ولیم' بیٹھا ہوا ہے، کہنے لگے گھبراؤ نہیں یار ہے آجاؤ۔ میں اندر آگیا۔ انگریز نے مولانا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولانا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو، سب ٹھیک ہے۔ سمجھے نا کھانا کھائے گا؟ اس نے اشارے سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح راضی وخوش نود ہے۔ دعوت قبول کرنے سے البتہ معذور ہے۔

نصف ڈبے میں مولانا کا سامان پھیلا ہوا تھا، ہر طرح کے بکس، بستر، ٹوکریاں، ڈبے، گٹھریاں، صراحی، پان دان۔ کھانے کا سامان نکالا گیا، پوری برتھ کھانوں سے بھر گئی، ہر طرح کے کھانے، ہر ذائقے کے حلوے، مٹھائیاں ان کے علاوہ، کہنے لگے یہ کھاؤ ہماری طرف کی خاص چیز ہے، نیب کی کونپل اور کلیاں قیمہ کے ساتھ پکائی گئی تھیں۔ بڑی مرچیں تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچوں کا تھا، پراٹھے، خستہ، ٹکیاں اور پوریاں

علاحدہ۔ بڑے مزے سے کھانا کھایا گیا۔ کہنے لگے خوب کھاؤ، والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے؟ سمجھتے ہو، ماں نے پکایا ہے۔ وہ یہ خیال کرکے کیسی خوش ہوتی ہوں گی کہ سلیمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفر حضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں شریک ہوئے۔ کیسی ہی پُرتکلف دعوت یا معزز مہمان کیوں نہ ہوتے۔ یہ ضرور ہوتے اور نہ ہوتے تو بُلائے جاتے۔ مرحوم ان کو 'بھائی جان' کہتے تھے۔ بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے، دسترخوان پر یک بہ یک آجاتے اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور دفعتاً اُٹھ کر چل دیتے، بھائی جان کی طرف دیکھ کر کہتے! کیوں بھائی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسب معمول، بالکل جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور غالباً مرحوم کی جوش اور محبت بھری باتیں سن کر پہلو بدل لیتے اور جلدی جلدی ہر چیز میں ہاتھ ڈالتے کچھ ٹٹولتے اور تھوڑا بہت اُٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانے میں میری والدہ نے رحلت فرمائی تھی، مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ اس وارفتگی سے سنائیں کہ میری طبیعت بھر آئی، مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کیے ہوئے، یا کھانے کی طرف سے توجہ ہٹائے ہوئے کہا: ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے، لیکن ہو نہ چکا، خیال فرماتے ہو بس ہو چکا، بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمہارے سامنے مریں، تم ان کے سامنے نہ مرے، ان کو یاد رکھو، ہمیشہ یاد رکھو، ماں کو کون بھولتا ہے۔ جب تک نہ بھولو گے لڑکپن کی خوش دلی اور حوصلہ باقی رہے گا۔ یہ لو پانی پیو۔ سب کچھ ماں کا دیا ہوا ہے اور ہاں یہ لینا۔ یہ آم... کے باپ نے دیا تھا۔ کہتا ہے اس کے باغ کے درخت کا پہلا پھل ہے جب تک میں نہ چکھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں تمہارا بھی حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارے بہار کا آم ہے۔ اتنے میں فتح پور آ گیا، کہنے لگے جاؤ، اٹاوہ پر پھر ملنا چائے پی جائے گی۔

مرحوم ہمیشہ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے۔ بڑے سامان و اہتمام کے ساتھ سیٹ ہمیشہ ریزرو کرا لیتے۔ مرحوم اس زمانے سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سکنڈ کلاس میں سفر کرنا ایک منزلت سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سیلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا تھا کوئی صاحبِ وقار سفر کر رہا ہے۔ آسائش کی ہر چیز

بڑھیا اور ستھری، ہم سفروں کا رکھ رکھاؤ، لباس و اطوار میں صفائی اور خوش سلیقگی۔ جس غرض سے سفر کرتے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آ جاتے ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ جس غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آئے ہوں۔

کچھ دن ہوئے۔ رات کا وقت تھا، باہر چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ ایک بات پوچھتا ہوں۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا ہے۔ میں نے کہا، سوال کی نوعیت نہ سمجھا۔ خطرے سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگے مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے فلاں اچھا کام نہ ہو سکا حالاں کہ ہم ایسا کر سکتے تھے۔ عرض کیا۔ آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا ہوں ہمیشہ ہر وہ نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے جو اکثر کھٹکتی ہے۔ کہنے لگے، ہاں ہاں وہی تو پوچھتا ہوں۔

عرض کیا آج علی گڑھ آئے ہوئے 24-23 سال ہوئے گھر سے پہلے پہل نکلا تو زندگی کچھ اور تھی اب کچھ اور، پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو آج سے 24-23 سال پہلے موجود تھے سوا والدہ مرحومہ کے سب بقیدِ حیات ہیں اور میری کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی، یہاں کی ہماہمی، بیوی بچے، دوست احباب، وطن سے دوری اور اس قسم کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور شہرت میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے، مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں، ان حقوق کو میں تھوڑا بہت ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن دل گواہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہیے اور جتنا کرنا چاہیے اس سے جی چُراتا ہوں۔ بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں، بھائی بھی برسر کار ہیں۔ ان میں کوئی آرام سے بسر کر رہا ہے اور کوئی تنگی تُرشی سے۔ والد گھر پر ہیں اور باوجود پیرانہ سالی اب بھی دوسروں سے خدمت لینے کے بجائے ان ہی کو آرام پہنچاتے ہیں۔ پہنچ جاتا ہوں تو پھولے نہیں سماتے، اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لیے اور اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ہیں جو بچپن میں میرے لیے روا رکھتے تھے۔ میں تھوڑے ہی عرصہ کے

لیے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد واپس آجاتا ہوں۔ اگر ان سے ملنے کے لیے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہو۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں بیوی بچوں میں جلد سے جلد پہنچ جانا زیادہ عزیز رکھتا ہوں، اس لیے اشارۃً کنایۃً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ تھوڑے عرصہ کے لیے اور ٹھہر جاؤں!

ذرا دیر کے لیے رُک گیا۔ پھر کہنے لگا آپ کے سوال نے دل کے مدتوں کے اَنے ہوئے سوتے کھول دیے، ایسا تو نہیں کہ اُکتانے لگے، علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ آپ کے سوال نے معلوم نہیں دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی کہ طبیعت بے قابو ہوگئی۔ اس گفتگو کو یہیں کیوں نہ ختم کردوں۔ مرحوم پر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ چونک پڑے، کہا۔ نہیں نہیں، کہے چلو۔ ختم کیے بغیر نہ رُکنا!

میں نے کہنا شروع کیا۔ سارا قصہ اس اندیشے سے نہیں دُہرانا چاہتا کہ دوسروں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ باتیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اس عمل ذہنی کا اندازہ نہیں ہوسکتا جو یہاں بتانا چاہتا تھا داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اس زندگی سے بالکل مختلف ہوگئی تھی جو والدین اور اعزا کے ساتھ وطن میں بسر کرچکا تھا۔ علی گڑھ کی زندگی میں جہاں گذشتہ آلام مصائب کو بھول چکا تھا وہاں ان ذمے داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کرگیا جو بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج و راحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا ان کے رنج و راحت سے میں نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہوجاتی ہے۔ بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کہ ان کے مسرّت کے پیالے کو جو بہت ہی اتھلا ہے، اپنی ادنیٰ توجہ سے لبریز کردوں لیکن یہ ہو نہیں پاتا۔ نفس حیلے تراشتا ہے تو اپنی جگہ مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہوں۔

مرحوم گردن جھکائے ساری داستان سنا کیے، خاموش ہوگیا تو چونک پڑے۔ فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی، اللہ بخشنے والا ہے خوب کہی، ٹھیک کہی، میرے دل کی بات کہہ دی۔ اللہ خوش رکھے، پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کیے دیر تک ٹہلا کیے۔ تھوڑی دیر بعد

کہہ دیتے، ٹھیک کہی، بڑے پتے کی بات کہی، بڑی مبارک بات ہے۔ نئی بات کہی، مرحوم کی اس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالمِ جذب طاری ہے۔ کبھی ایسا جیسے مسرور و مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ دفعتاً بولے، اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر گفتگو ہوگی۔

مرحوم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پکّی کچّی[1] بارکوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے، اور آمد و رفت کے لیے صرف وکٹوریہ گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جس پر دربان مقرر تھا اور آنے جانے والوں کے نام اور پتے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر بھائی منزل (دومنزلہ) کے دروازے جس میں مرحوم تمام عمر مقیم رہے ماریسن روڈ پر کھلتے تھے۔ مرحوم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سید محمود کورٹ میں آ جا سکے۔ مسجد سے عشا کی نماز پڑھ کر واپس آتے اور کچھ لوگ ساتھ ہوتے تو مرحوم ان کو بھی اپنی طرف سے باہر نکلنے نہ دیتے۔ ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریہ گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلبا یا غیر طلبا کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس پر طلبا یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوئی لیکن مرحوم نے اس اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

کم و بیش تیس سال تک دومنزلہ میں مقیم رہے۔ مرحوم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو دومنزلہ میں ان کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ممکن تھا کہ مرحوم محض تفریحاً یا اخلاقاً کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں۔ ہمیشہ اپنے مستقر پر ملے۔ سوا اس کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو۔ بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مرحوم نے کالج کا سوئمنگ باتھ نہیں دیکھا تھا، کہتے تھے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا جلسے ہوتے، مرحوم ان میں کبھی نہیں شریک ہوئے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا ادھر اُدھر نہ ہوئے۔ کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا ہیچ۔ ایسے لوگوں کے لیے ساری دنیا

---

1. طلبا کی اقامت گاہیں (ہاسٹل کے نام)

پڑی ہے، وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم وفضل دیکھا جاتا ہے۔کوئی صاحب فضل وکمال آئے تو البتہ!

ایک بار کوئی میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز تیز ہونی شروع ہوئی، ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے۔بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے مولانا کو دبایا کہ خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔مرحوم نے چمک کر کہا: خاموش کیسے ہو جاؤں وائسرائے کو ایڈریس نہیں دیا جارہا ہے۔علم و ایمان کے مسائل ہیں۔خیال فرماتے ہو نا۔علم و ایمان کی آزمائش ہے۔ نیازمندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کیوں جی یہ تم بھیگی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے، میں نے کہا بس تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی ورنہ آپ دیکھئے کہ بھیگی بلی گربہ عاجز بن جاتی۔زور سے ہنسے، پھر فرمایا۔''لیکن رہتے بلی ہی۔''

مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے۔ بایں ہمہ مختلف الخیال لوگوں سے بقول ان کے کھاتا کھلا ہوا تھا۔ خانقاہِ سلیمانیہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابوبکر صاحب، محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، نواب صدر یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔باہر والوں میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بہاء الدین صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا۔مولانا ابوبکر صاحب کے بڑے مداح تھے، ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔تم تو جانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے جدا ہے، میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔

مولانا ابوبکر صاحب کو کلے کے سرطان کی تکلیف ہوئی اور علالت تشویش ناک صورت اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بے قراری سے فرمایا: اللہ شفا دے، دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔علوم پر بڑی اچھی نظر ہے، بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے، بڑی متوازن شخصیت ہے، نہ رعب کھاتا ہے نہ رعب ڈالتا ہے، یہ بات مولویوں میں ناپید ہے پھر یاروں کا یار ہے۔ کہتے کہتے ایسا معلوم ہوا جیسے طبیعت میں گدگدی پیدا ہوگئی۔ کہنے لگے، عجیب آدمی ہیں۔کوئی کام ہو، کسی کا کام ہو، کسی سے ہو، عبا پہنی رومال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر سے نکل پڑے۔ یہ شخص

فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اُٹھاتا ہے۔ آج کل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہے لیکن نہ معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا اضمحلال، کتنوں کی ان کے دم سے پرورش ہے۔ ہاتھ کھلا، دل غنی۔ بڑا سردار آدمی ہے!

ذاکر صاحب[1] سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا۔ چلیے مولانا سے مل آئیں۔ ہم جیسے پہنچے مرحوم استنجا کرنے جارہے تھے، میں کمرے میں داخل ہوا، کہنے لگے: ''اخوہ یہ سواری بادِ بہاری کہاں سے آئی'' اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آؤں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرے میں داخل ہوئے دیکھتے ہی مسرّت سے چہرہ جگمگا اُٹھا۔ ایک خاص انداز ترنّم سے بولے، ''اہو ہو ہو، ڈاکٹر تم کہاں! اہلاً و سہلاً۔'' ذاکر صاحب نے فرمایا: عرصہ سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کرلیا کہ ضرور جاؤں گا۔ بولے: جزاک اللہ! جزاک اللہ۔ میری طرف مخاطب ہوکر بولے، خدا خوش رکھے، انھیں خوب لائے، خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا۔ میں نے کہا فارغ ہو آیئے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ڈاکٹر سے بات ہوگی۔ اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جاکر دوزانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولانا کم بیٹھتے تھے۔ کوئی ہوتا یا آتا مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میز کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے رہتے یا بیٹھتے۔ تخت پر دوزانو بیٹھنا خاص مواقع پر ہوتا۔ طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر آجاتے اور دوزانو بیٹھتے۔ یہ ان ہی کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ لطفِ صحبت میں کسی قسم کا خلل آنے نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طور پر گرم ہوگی۔ چائے تیار کی گئی۔ شفاف سبزی مائل چائے، عنبر کی خوشبو سے معطّر، تھوڑی شکر ملی ہوئی بغیر دودھ کے، خوش نما بلوریں فنجان میں۔ اس درمیان میں کوئی دوسرے درجے کا آدمی آجاتا تو اسے فوراً رخصت کردیتے، اور کہہ دیتے اس وقت جاؤ پھر کبھی آنا۔ اس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی بڑے لطف کی باتیں بڑی محبت کی باتیں اور بڑے پتے کی باتیں!

بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پُر لطف باتیں کرتے سنا ہے۔ برمحل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفے خواہ کیسے ہی ہوں ''بے ضبط زبان'' کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر ثقہ

---

1 ڈاکٹر ذاکر حسین (1897-1969)

فقرے بھی بڑے مزے کے معلوم ہوتے۔ بڑے عرصہ تک ساتھ رہا۔ شاید ہی کبھی کسی لطیفے یا فقرے کو دُہراتے سنا۔ ایسوں سے بھی واقف ہوں جو بڑے لسّان اور طرّار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار صحبتوں کے بعد اکثر یہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع بے موقع دُہرا دیے جاتے ہیں، برمحل اور اچھوتا فقرہ چُست کرنا آسان نہیں۔ مرحوم کو اس میں خالص درک تھا۔

دینیات کے گھنٹے میں اکثر طلبا لکچر کم سنتے، حاضری کی زیادہ فکر رکھتے اور تھوڑی بہت تفریح سے بھی باز نہ آتے۔ لیکن مولانا کی کلاس میں نظم و سکوت قائم رہتا۔ مرحوم سے طلبا مسرور بھی رہتے اور مرعوب بھی۔ ایک دن طالب علم نے کلاس میں دریافت کیا۔ جناب والا! حضرت عمر نے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی سرداری سے معزول کر دیا تو حضرت خالد نے حضرت عمر سے معزولی کے وجوہ کیوں نہ دریافت کیے۔ اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ''حضرت خالد نے تو جب وجوہ دریافت نہیں کیے تیرہ سو سال بعد اب آپ کو وجوہ دریافت کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی، سمجھے نا، بندہ نواز، ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالا کیجیے، آگے بڑھیے!''

اپنی کلاس کے تقریباً تمام لڑکوں سے باخبر رہتے۔ ایک طالب علم کالج میں بہت مشہور تھے۔ مولانا کی کلاس میں کئی باریوں سے نہیں آئے تھے۔ دریافت کیا ''کہاں ہیں وہ بندہ نواز گیسو دراز؟'' ایک طالب علم نے جواب دیا کہ وہ آج کل بہت مصروف رہتے ہیں اور کمرے سے کم برآمد ہوتے ہیں۔ دوسرے نے کہا فلاں فلاں کلاس میں تو دیکھے گئے تھے۔ مولانا نے فرمایا۔ ''جی ہاں، ذرا کہہ دیجیے گا کہ آجایا کریں۔ ع

میرے غم خانہ میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

مرحوم کو برہمی کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آجاتے، لیکن اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا مذہب کے بل پر یا اُن کے ناموس کی حفاظت میں آمادۂ جہاد ہیں۔ تکبّر یا تبحر کا شائبہ تک نہ ہوتا لیکن جب بے تکلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی، رنگینی و زیبائی ہوتی، مرحوم یاد آتے ہیں تو ذہن میں!

''عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں''

کا نقشہ پھر جاتا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دو سال پہلے علی گڑھ میں ہوا ان کو مرحوم 'بھائی جان' یا بھیا کہتے تھے۔ مدتوں سے جنون میں مبتلا تھے، بولنا ترک کر دیا تھا چپ چاپ ادھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعرض نہ کرتے اور نہ کسی کے لیے تکلیف دہ تھے۔ بڑے بھائی سے اس حال میں جتنی محبت کرتے تھے اور ان کی راحت کی جزئیات پر جیسی ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ سفر میں سکنڈ کلاس میں ان کو ساتھ رکھتے۔ دستر خوان پر معزز سے معزز مہمان کیوں نہ ہو، بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے کھاتے، ان کے لیے سردی گرمی کا لباس بڑی محبت اور تکلف سے بنواتے۔ بھائی جان ہی کے لیے آدم جی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک احاطہ بنوا دیا تھا جس میں ہر طرح کے پھولوں کے درخت لگوا دیے تھے۔ برآمدے میں پھولوں کے گملے تھے۔

بھائی بیمار ہوتے تو مرحوم کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض اپنا حال نہیں بتا سکتا تھا، معدہ کی تکلیف تھی، حکیم[1] صاحب معالج تھے۔ مشکل یہ تھی کہ معدہ کو آلائش سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب ہو سکتا تھا مثلاً عمل دینا، اسے مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے کہتے تھے بھیا نے جو بات تمام عمر گوارا نہ کی اسے آخر وقت میں کیسے ہونے دوں۔ معلوم نہیں وہ کس عالم میں ہوں۔ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ بول براز کا امتحان یا ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا خود مولانا مرحوم بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔

بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سونے بیٹھنے، کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میلا، خط بڑھا، اوقاتِ مقررہ میں گڑبڑ، گفتگو میں ناہمواری، کہتے تھے نفس نے اپنے مطالبات چھوڑ دیے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت، ہوشیاری اور جاں فشانی سے علاج کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، دوائیں آشِ جو، شربت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کرا کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پاکر مریض کے پاس آجاتے، ہر طرح کے جتن کیے لیکن ایک پیش نہ گئی اور 'بھائی جان' مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

---

[1] شفاء الملک حکیم محمد عبد اللطیف لکھنوی سابق وائس پرنسپل طبیہ کالج علی گڑھ (1970-1900)

کچھ عرصہ بعد ایک دن فرمانے لگے رشید! معلوم ہوتا ہے کہ میرا خمیر بھی علی گڑھ کا ہے۔ اکثر خیال آیا کہ اچھے برے دن سب دیکھ لیے اب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہو جاؤں اور وطن جا کر بزرگوں کی یاد میں بقیہ زندگی بسر کر دوں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ یہیں مکان بنوالوں اور رہ جاؤں، بھیا زندہ تھے تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دیے۔ بہت سی ذمے داریاں ختم ہو لیں تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھان لی ہے کہ بھیا کے قدموں میں جا بسوں۔ خدا سید زین الدین کا بھلا کرے انھوں نے اپنے قبرستان میں تھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں! ذمے داری ختم ہو جائے تو کمزوری سے مغلوب ہو جانا کوئی مضائقہ کی بات نہیں!

صحت عرصہ سے خراب چلی آتی تھی۔ بھائی کی وفات کے بعد تیزی سے گرنے لگی۔ رمضان میں بخار آیا، معالج کے اصرار کے باوجود روزے رکھنے سے باز نہ آئے۔ طبیعت زیادہ نڈھال ہونے لگی تو روزے ترک کر دیے۔ مرض نے طوالت پکڑی لیکن کچھ عرصہ بعد افاقہ کی صورت پیدا ہوئی۔ عرصے سے حاضر نہیں ہوا تھا، ایک دن کالج سے واپسی پر گیا تو سونے کے کمرے میں ملے۔ دروازے کے پاس ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے، کمزوری ضرور تھی لیکن چہرہ روشن تھا، گفتگو آہستہ کرتے تھے لیکن آواز میں خستگی نہ تھی۔ دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہراس یا مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ کہنے لگے: رشید! جو کچھ ہوا، ہوا۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ تمہارا حکیم[1] بڑا بے نظیر آدمی ہے، خدا اسے خوش رکھے، کیا کوئی عزیز کرے گا جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب کہاں؟ بہت سمجھ دار آدمی ہے، صاحب فن کی حیثیت سے میں نے اسے گھبراتے نہیں دیکھا۔ محبت کی وجہ سے البتہ پریشان ہونے لگتا ہے، نوجوان ہے نا، عمر گزرنے پر یہ بات جاتی رہے گی۔

وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو ہوئی تو وہ بھی تعجب کرتے تھے کہ ایسے پکے عقیدے کا مریض انھوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے مرحوم کے مزاج کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ ان کا علاج اس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک کہ ان کی عجیب وغریب

1۔ شفاملک حکیم محمد عبداللطیف صاحب مرحوم (1970-1900)

بسا اوقات متضاد اور جلد جلد بدلنے والی کیفیات سے پورے طور پر آشنا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہوگی اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے مزاج سے بے آہنگ ہو جائے گی۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ یہ محسوس کر کے کہ ممکن ہے مرحوم میرا لحاظ کر کے کچھ نہ کہتے ہوں ایک دن دبی زبان یہ کہہ دیا کہ مولانا اب معالج بدل کر دیکھا جائے کیا ہوتا ہے، ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو، یا میری تدابیر کارگر نہ ہوتی ہوں۔ مولانا پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی، کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو گے کہ مولوی مرگیا تو لوگ کہیں گے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مرا۔ خبردار خبردار مت گھبرانا۔ علاج تمہارا ہی رہے گا۔ مارنا جلانا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ علاج کیے جاؤ۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج قیامت تک نہیں بدلا جائے گا۔ سمجھے نا؟ ہاں!

ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہایت محترم و عزیز رکھتے تھے اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے لیکن نہ مانے اور یہی کہتے کہ تم لوگ حکیم کو کیا سمجھتے ہو، بڑے معرکے کا علاج کر رہا ہے، میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ مولانا نے ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جاں بر ہوگیا لیکن اب بخار آیا تو پھر نہ اُترے گا اور ایسا ہی ہوا۔

پچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں نماز پڑھی۔ کمزور ہو چکے تھے۔ میرا اور بعض دوستوں کا مدت سے یہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو جاتے۔ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کمرے میں احباب و عقیدت مندوں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آئے تھے۔ تھکن محسوس کر رہے تھے، فرمایا بھائی معانقہ سے معاف کرو، دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور مصافحہ کرنے لگے، میں پہنچا تو اُٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اپنے لمبے چوڑے سرخ ٹھپے دار رومال سے پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتے تھے، لیکن چہرے پر بشاشت تھی اور آواز میں کرارا پن، مرحوم آواز کے لیے اکثر یہ لفظ (کرارا پن) استعمال کرتے تھے۔

ماہِ صیام آ رہا ہے، عید بھی آئے گی۔ اس وقت جب کہ یہ سطر میں لکھ رہا ہوں رمضان کے کتنے مہینے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آ رہی ہیں۔ تراویح کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ صحبتیں جب چائے کا دور ہوتا تھا۔ مخلصین کا مجمع، لطف کی باتیں! مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد گزرتا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چُست کرتے۔ چائے کی پیالی پیش کی جاتی کسی کے بُشرے پر کوئی فقرہ کہہ دیتے کسی کے لباس کی تعریف کر دیتے، کسی کی کارگزاری کی داد دیتے۔ کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لیتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک پہلو اس طور پر بیان کر جاتے گویا وہ بات بھی جو اس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جز تھی۔ عید کی نماز سے واپسی پر حلقۂ احباب گرم ہوتا۔ چائے عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ ہر شخص کے مذاق کو مدِ نظر رکھ کر اس سے پرسش احوال کرتے۔ کالج پالیٹکس پر کبھی مجمع میں اظہار خیال نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار علیل ہوئے تو حالت گرتی ہی گئی۔ اس دوران عرصہ تک حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ میں اس حالت میں مرحوم کو دیکھ نہ سکتا تھا جس شخص کی تندرستی، زندہ دلی، استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ چکا تھا اسے بے بس و ناتواں دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف اور پرو وائس چانسلر صاحب کے خط کا منتظر تھا کہ نوکر نے آ کر خبر دی کہ مولانا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں زبان سے بے ساختہ اناللہ نکلا، گرتا، پڑتا دو منزلہ پہنچا، ہجوم دیکھ کر دل بیٹھ گیا کمرے میں سب لوگ جمع تھے۔ کئی ڈاکٹر بھی بلا لیے گئے تھے، مشورہ ہو رہا تھا، معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، غفلت طاری رہنے لگی ہے، کبھی کبھی ہوش میں آ جاتے ہیں، علاج بدلنے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ عرض کیا کہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے اب کوئی ٹال نہیں سکتا۔ علاج بدلنا نہ بدلنا دونوں برابر ہیں۔ دل البتہ نہیں مانتا۔ شاید ڈاکٹری علاج سے صورت حال بہتر ہو جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر[1] جو مرحوم کے سب سے مقرّب و محترم تھے اندر تشریف لے گئے میری اب بھی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا۔ مرحوم کی

1. مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ (1876-1951)

حالت غیر ہو چکی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب سے پوچھا، حکیم جی تم بھی چاہتے ہو کہ علاج بدل دیا جائے؟ حکیم صاحب نے کہا ہاں فرمایا: تو پھر جو چاہو کرو۔

یہ ہو چکا تو دل کڑا کر کے میں بھی حاضر ہوا۔ کسی نے میرا نام لے کر باآواز بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ مرحوم نے آنکھیں کھول دیں، یقین نہیں ہے کہ مرحوم نے پہچانا ہو۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا کہ فلاں آیا ہوا ہے، نہایت نحیف آواز میں فرمایا، اب آئے ہو...... بڑی دیر کر دی۔' اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں پھر ہوشیار ہوئے فرمایا: ''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' یہی تین فقرے تھے جو میں نے سُنے۔

کچھ دیر تک چار پائی سے لگا بیٹھا رہا۔ موت کا تصور کبھی کبھی ماضی کے مدھم نقوش کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتا ہے، اتنا نمایاں گویا ان میں از سرِ نو زندگی ڈال دی گئی ہے، پچھلا زمانہ ایک ایک کر کے یاد آنے لگا، یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھارہ سال قبل میں رہ چکا تھا، مرحوم نے ایک دن اس زمانے میں مجھ سے فرمایا کہ اس عمارت کے دو حصوں میں ہم اور تم آباد ہیں۔ میرے لیے موجودہ حصہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کو بھی تکلیف ہے، اگر یہ حصہ بھی مل جاتا تو ہم لوگوں کے لیے بڑی آسانی ہو جاتی۔ میں اسٹاف میں آ گیا تھا اس لیے آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ زمانہ یاد آ رہا تھا اس کمرے میں معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ باتیں یاد آنے لگیں جن سے زندگی کے بعض بڑے دل کش نشیب و فراز وابستہ تھے۔ اپنے ہی نہیں مرحوم کے بھی۔ ان کے دُہرانے سے کیا حاصل۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرحوم بڑے شوق سے آئے تھے۔ اس میں ان کے شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں، یہیں وہ بے تکلف اور مخلص احباب سے بڑے شوق سے ملتے تھے اور ---یہیں سے وہ آج ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو دوسروں کے لیے سہارا تھا آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں۔ جس سرچشمہ سے میں اور کتنے اور، تقویت اور بشاشت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لیے خشک!

بیٹھا رہا۔ مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ جی چاہتا کاش مولانا یک لخت تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے ''خوب آئے بیٹھو گپ ہو گی، کدّ و اب بڑا ہو گیا۔

ناچ گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی دینا۔'' میری وہ حالت تھی جب آدمی دعا نہیں مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری معلوم ہوتی ہے۔ میں چلا آیا اور پھر نہ گیا۔ دو دن بعد انتقال ہو گیا! اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اُٹھالیا!

جنازے کے ہجوم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل میدان میں نماز کے لیے جنازہ رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لیے دوڑتے بھاگتے چلے آرہے تھے۔ نماز پڑھانے کا سب سے زیادہ حق نواب صدر یار[1] جنگ بہادر کو پہنچتا تھا۔ اچانک علالت کے سبب سے موصوف تشریف نہ لا سکے۔ مولانا ابوبکر صاحب[2] منہ کے زخم رسنے کے سبب سے معذور تھے چنانچہ مولانا شفیع صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت جب کہ نمازِ جنازہ کا مسئلہ زیرِ غور تھا، مرحوم کی ایک بات یاد آئی عرصہ ہوا ایک بار فرمایا تھا۔ دیکھو دینیات کے پرچے میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں، اس کا سبب جانتے ہو۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے، وہ نمازِ جنازہ ہے۔ میں مرنے لگوں تو مجھے یہ تو اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نمازِ جنازہ پڑھائے گا۔

اس وقت جب کہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز کون پڑھائے مجھے مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہیے تھی، وہیں تعزیت کا رزولیوشن پڑھ کر گھر واپس آیا اور نماز جنازہ کا بدل تعزیت کا رزولیوشن رہ گیا۔

●●●

---

1 مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ (1876-1951)

2 مولانا ابوبکر شیث خاں فاروقی (1880-1940)

مولانا ابوبکر شیث فاروقی

(1880-1940)

مولانا ابوبکر شیث خاں جون پور کے محلہ قضانہ میں 1880 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ابوالخیر تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امین بن طٰہٰ شریف کی نگرانی میں ہوئی۔ آپ نے حفظِ قرآن کیا اور مچھلی شہر کے قاضی عبدالعزیز سے صحیح بخاری اور بلوغ الحرام کا درس لیا، اور جون پور واپس آن کر دو سال تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اصرار پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی نظامت کے لیے تیار ہوگئے، لیکن شرط یہ رکھی کہ کسی کے سامنے انٹرویو کے لیے حاضری نہ دوں گا۔

شعبۂ دینیات میں لائبریری کا قیام اور اس کے لیے کتابوں کی فراہمی کے لیے خصوصی توجہ دی۔ یونیورسٹی کے قبرستان میں جہاں آج ہر طرح کی سہولیات ہیں مولانا مرحوم کی وجہ سے ہیں۔ مولانا نے سایہ دار درخت لگوائے۔ یونیورسٹی کی بورڈنگ میں مساجد میں باجماعت نماز کا اہتمام کیا۔

مولانا کی طبیعت میں قناعت پسندی تھی۔ ان کی اصابت رائے اور اعلیٰ ظرفی کے سب معترف تھے۔ مولانا کا تصنیفی سرمایہ کم ہے، سیرت رسول، اصولِ حدیث اور چند رسائل ہیں۔

مولانا گلے کے کینسر میں مبتلا ہوئے اور 1940 میں جون پور میں انتقال کیا۔

مرگِ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے!

الحاج مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی جون پوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ نہ دعائیں مقبول ہوئیں نہ دوائیں کارگر۔ وقت ٹلتا رہا لیکن انجام وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دلی تمنا تھی کہ یہ نہ ہوتا لیکن مشیتِ الٰہی کون سمجھ یا ٹال سکا ہے!

آہ وہ زندانیِ تقدیر (انسان) جس پر 'بانیِ تقدیر' کا بھی اتہام لگایا جاتا ہے۔

میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ ان کو کب سے جانتا ہوں۔ ان کی شخصی خوبیوں کو بچشم خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سنی۔ کتابوں میں پڑھی اور دل میں پائی، ابتدائی باتیں تو حافظہ کے دور دراز افق پر کسی پرندے کی موہوم تھکی ہوئی پرواز کی مانند گم ہوتی جارہی ہیں۔ اب ان کو کون واپس بلائے کس دل سے بلائے اور اس کا حاصل کیا؟

علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اس نے اپنا بنا لیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کیا جائے اس نے مجھے میری نظر میں محترم کردیا۔ اس قید سے مخلصی کہاں بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ والوں سے بہتر و برتر لوگ۔ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی تو معاً دل میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں؟ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے

محروم رہا اور جب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرّت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔

پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی۔ ذہن میں یک لخت یہ بات آئی کہ مولانا یہاں آ جائیں تو خوب ہو۔ حسنِ اتفاق سے جلد ہی وطن جانے کا موقع ملا۔ مولانا سے استمزاج کیا۔ اب تک یاد ہے ایک کھرّی چارپائی پر بستر پر سر رکھے لیٹے عالمِ شوق میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے، پہنچ کر سلام کیا تو وعلیکم السلام اس لطف سے کہا جس سے محسوس ہوا کہ میرے آنے کی بڑی خوشی ہوئی اور سلام کا یہ جواب ایک طویل اور پُر خلوص صحت کی دعوت ہے۔ ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور نو وارد ہی کیوں نہ ہو مولانا کا یہی انداز پذیرائی تھا۔ اُٹھ بیٹھے اور اپنی ہی چارپائی پر بٹھالیا۔ اپنے لمبے رومال کو جو پاس ہی رکھا تھا اس طور پر گھسیٹتے اُٹھایا کہ جس جگہ میں بیٹھنے والا تھا اس کو جھاڑ پونچھ دینا مقصود تھا۔ قدیم زمانے کے بزرگوں کا یہ خاص انداز تھا۔ بولے کہو علی گڑھ کا کیا حال ہے۔ کب آئے؟ میں نے کہا ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ بولے کہو، ضرور کہو، وہ ان کا مستعدی اور ولولہ سے اس طور پر ہمہ تن تیار ہو جانا جیسے ضرورت ہو تو کام پورا کرنے کے لیے وہیں سے میرے ساتھ ہو جائیں گے۔

عرض کیا علی گڑھ میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہے۔ آپ قبول کر لیتے تو بہت اچھا ہوتا، کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا سیاسی مسلک اور ہے، علی گڑھ کا اور۔ فرمایا: مسلک کی تو کوئی بات نہیں، مسلک تو ایک ہی ہے اور وہ مسلک ہے اسلام کا۔ عرض کیا، یہ تو سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھائے اور سمجھے کہ کون سا مسلک کیا ہے۔ بولے سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا صحیح اور سچا راستہ دریافت کرنے اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے دقت ہو، لیکن صحیح اور سچا آدمی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا علی گڑھ مصالح کا شکار ہے۔ مصلحت اندیشی اچھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزل کی جڑ ہے۔ کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں رہیں، اس کے بعد عرض کیا تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلیے۔ آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ بولے: کیا مضائقہ، لیکن میں دوڑ دھوپ کرنے اور سفارش بہم پہنچانے کے چکّر میں نہ پڑوں گا۔ عرض کیا: یہ آپ مجھ پر چھوڑیے، میں تو آپ کا صرف عندیہ لینا چاہتا تھا۔

چلنے لگا تو بولے: دیکھو اس سلسلے میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمہارے یا میرے شایانِ شان نہ ہو، میرا اشمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے۔ لیکن روپے پیسے کے علاوہ اللہ کا دیا اور بزرگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے۔ نوکری کی خواہش ہے نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو کہ علی گڑھ چلوں۔ میں بھی سوچتا ہوں کچھ دن یہ شغل بھی رہے تو کیا ہرج، علی گڑھ والوں کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا، پھر تم ہو، ایوب ہیں، وغیرہ۔

یاد نہیں آتا کون لوگ اور موجود تھے، کسی نے کہا کہ مولانا آپ کی اور مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کیسے نبھے گی۔ فرمایا: بھائی ٹھیک کہتے ہو، یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میرے ان کے بعض امور میں اختلافات ضرور ہیں، لیکن وہ جون پور میں مدتوں رہے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی تو ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ علی گڑھ جا کر وہ کیا سے کیا ہو گئے لیکن اتنا اعتبار ضرور ہے کہ وہ مخالفت نہ کریں گے!

علی گڑھ واپس آیا۔ سب سے پہلے مولانا سلیمان اشرف[1] صاحب سے ملا۔ دیکھتے ہی بولے: کہو پاکٹ میں کیا ہے؟ اس سے مرحوم کا مطلب یہ ہوتا، کوئی لطیفہ ذہن میں ہے؟ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد عرض کیا: ایک بات آپ سے منوانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ بولے: شاباش! اچھے گھر نیوتا دیا ہے! ارے سلیمان اشرف سے بات منوانا، تم کو کسی نے بہکایا ہوگا۔ میں نے کہا: بہکایا کسی نے نہیں، یہ آپ یقین فرمایئے، بولے: تو پھر ٹھیک ہے، خود ہی بہکے ہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، میں نے کہا: یہ بہکنے بہکانے پر آپ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں، میں خود بہکا بہکا گیا لیکن آیا تو آپ ہی کے پاس، یہ بھی کوئی بہکنے میں بہکنا ہوا؟ مرحوم زور سے ہنسے، پھر فرمایا: اچھا اچھا کہو، باریش بابا ہم بازی۔ ہاں ہم سمجھا، کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے ناظم دینیات کے تقرر کے سلسلے میں ابو بکر صاحب کا نام لیا اور اس کے بعد اُن کے محاسن زبان پر لانا چاہتا تھا کہ بولے: اچھا اچھا ذرا چپ نہ ہو جاؤ۔ مولوی ابو بکر سے میں واقف ہوں، میرے ان کے مسلک میں فرق ہے، تم کو یہ باتیں معلوم نہیں، لیکن آدمی اونچے گھرانے کا ہے۔ پھر غور میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر تک ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلتے اور گنگناتے رہے، اس کے بعد بولے: اچھا جاؤ۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔

---

1. مولانا سلیمان اشرف (1939-1878)

کچھ ہی دن بعد مولانا ناظم دینیات مقرر ہو گئے، پندرہ سال تک جس لطف و ہمدردی، وسیع النظری، انتظامی قابلیت اور عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اس منصب کے فرائض انجام دیے اس کی نظیر علی گڑھ کے محکمۂ دینیات کی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ خواہ کوئی مشغولیت ہو، اور کیسا ہی موسم ہو، یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد میں پڑھائی، اس میں حتی الوسع شاید ہی کچھ فرق آیا ہو۔ دینیات کی لائبریری از سرِ نو مرتب کی، دینیات کے نصاب پر نظر ثانی کی، مسجد اور متعلقہ عمارات کو ستھرا اور دیکھنے کے لائق بنائے رکھا، جتنے دارالاقامے، یونیورسٹی اور اسکول سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے پڑھانے کا باضابطہ انتظام کیا۔ یونیورسٹی میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں بڑے خلوص اور تدبّر سے کام لیا۔

مذہبی و اخلاقی فضا ایک غیر متعیّن تصور ہے۔ مرحوم کا نظریہ اس بارے میں سب سے علاحدہ لیکن متعین اور واضح تھا۔ کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ ان معنوں میں کوئی دینی یا مذہبی ادارہ نہیں ہے جن معنوں میں دیوبند، سہارن پور وغیرہ کے مذہبی یا دینی ادارے ہیں۔ یہ ایک دنیوی تعلیم گاہ ہے جس میں طلبا کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو ضروریات زمانہ میں ان کی کفیل ہو اور دنیوی مطالبات کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مسلمانوں کا بھی ادارہ ہے اس لیے اس میں صرف اتنا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہمارے طلبا اسلام کے اعلیٰ تصوراتِ معاد و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرتِ حاضرہ کی زد میں آ کر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بے گانہ نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ اعتقاد کو صحیح رکھنے کا التزام رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہو جس اعتقاد پر عمل کا جامہ ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں ذہنی تعیّش یا گمراہی ہے۔ مسلمانوں کا عمل عبادت ہے۔ عبادت عمل نہیں، یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہے قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔ مسلمان بنے رہو مسلمان بنتے رہیں گے۔ قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مرحوم کا سیاسی مسلک جمعیۃ العلما کا تھا اور جہاں تک شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا وہ بدعات شرعیہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ، پیر پرستی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل

نہ تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے حامی تھے۔ تمام عمران کا لباس گزی گاڑھے کا رہا۔ سر پر عمامہ، پاؤں میں پنجابی جوتا، صرف سخت سردیوں میں کوئی معمولی سا موزہ پہن لیتے۔

یاد آتا ہے ایک صحبت میں جمعیۃ العلما اور کانگریس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی مرحوم چبوترے پر اپنی عبا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جو جمعیۃ العلما اور کانگریس دونوں سے بے زار تھا جمعیۃ کے سیاسی مسلک پر نکتہ چینی کی۔ مولانا اُٹھ بیٹھے، کہنے لگے: بھائی انصاف کرو اور حدود سے متجاوز نہ ہو۔ علما میں ہزار عیب سہی لیکن انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے، آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں تجویز پیش کر دیتے ہیں یا ستیہ گرہ میں شریک ہو جاتے ہیں، وہ بھی ایسے زمانے میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان رساں یا تکلیف دہ نہیں ہے، علما نے تو اس وقت سے آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ تھا اور آزادی و بغاوت ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس کے نام تک کوئی واقف نہ تھا، علما پھانسی پر چڑھائے گئے، ان کے گھر ڈھائے گئے، ان کو کالا پانی بھیجا گیا۔ ان کی عورتوں بچوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے، تم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہو، بے چارے علما کی بھی تاریخ پڑھی ہوتی، آج ہندو آزادی کے معاملہ میں علما سے آنکھ برابر نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی تاریخ جہاد پر مسلسل اور دل نشیں تقریر کی۔ علما کے بہت سے تباہ شدہ خاندانوں کا حال سنایا، جہاد پر جو نظمیں جب کبھی لکھی گئی تھیں اور ضبط ہوئیں ان سب کو سنایا، جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی جو لوگ شریک ہوئے اور جو کچھ انجام ہوا سب کہہ ڈالے۔ پھر بولے: دوستو بُرا نہ ماننا تمہارے مصالح یا تمہاری کمزوری اپنی اپنی جگہ پر چاہے جیسی ہو مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں، لیکن ایسا تو نہ کرو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصالح کو ٹھکرا دیا ان کو تم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اٹھاتے ہو، خوب اٹھاؤ، خدا مبارک کرے اور برکت دے، مگر ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے کبھی تم کو ائمہ و اسلاف کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے!

اس تقریر سے حاضرین پر اوس سی پڑ گئی۔ لیکن اس کے بعد ہی مرحوم نے گفتگو کا رُخ اس طور پر بدل دیا کہ بات آئی گئی ہوگئی اور سب لوگ ہنستے بولتے رخصت ہوئے۔ مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی نہیں کر دی تھی بلکہ اس کی تہہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض روایات بھی ہیں۔

مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی فاروقی محمدی مہاجر مکّی تھے ممدوح شاہ عبدالحیٔ صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید نبیرۂ حجۃ اللہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد تھے اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ۔ ان شہیدین سعیدین کے فیوض صحبت سے مولانا سخاوت علیؒ میں مجاہدانہ سرگرمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ چنانچہ 1856 میں یہ مرد مجاہد ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر مکّہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔ مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم کیا ہوا مدرسہ قرآنیہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و نگرانی بتدریج ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا محمد جنید صاحب مرحوم اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والد ماجد مشہور عالم باعمل حضرت مولانا ابوالخیر محمد مکی رحمتہ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی جن کے بعد مرحوم اس مدرسے کے مہتمم و ناظم ہوئے۔ مولانا سخاوت علی مرحوم نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازک موقع پر دین کی خدمت کی اور ان کے فیضِ صحبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوئے وہ پورب کے نواح میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا ہے میں اس میں موجود تھا اور پورے طور پر محسوس کر رہا تھا کہ مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں، اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مرحوم کو براہِ راست وراثتاً پہنچتی تھی۔

مرحوم کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے کبھی ناسازی طبع سے کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے۔ کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت وعظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے جس

کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے، لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں یا ان پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا، وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں بغیر کسی قسم کا اعلان کیے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے۔ بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبۂ فنون کے ایک طالب علم نے اکیڈمک کونسل سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مخل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اراکین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کی دقتوں میں اضافہ ہو اور نہ اس طالب علم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے۔ کافی بحث ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا: کونسل اجازت دے دے جس مضمون کی تعلیم کی گنجائش نظامِ اوقات میں نہیں نکلتی وہ ان کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیں گے۔ چنانچہ اس طالب علم کو مرحوم نے دو سال تک مسلسل انتہائی پابندی اور انہماک سے اپنی فرصت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملے میں مولانا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی سابقہ ہوا۔ لیکن وہ ان سے اس طور پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ موذّنوں اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے، ان سے عزّت اور محبت سے پیش آتے تھے، یہاں تک کہ ان سبھوں کو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ مولانا ان کے افسر تھے، ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا، ان کی ذاتی دقتوں کو اپنا لیتے۔ مولانا کے سپرد جو انتظامات تھے ان کا حلقہ بہت وسیع تھا، قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا، لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولانا کسی قسم کی تردد یا دوا دوش میں مبتلا ہوئے ہیں۔ کمیٹیاں ہو رہی ہیں، کاغذی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں، اور ایک ہنگامہ برپا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا جیسے مرحوم کا منشا خود بخود ہر جگہ پورا ہو رہا ہے اور ان کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین[1] صاحب مہتمم یونیورسٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا بھی اپنے خاص انداز دل آسائی وخود اعتمادی کے ساتھ آ گئے، سب لوگ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرحوم نے بغیر کسی تکلف یا مصنوعی اخلاق کے فرمایا: ارے میاں بیٹھے بھی رہو، کیا باتیں ہو رہی تھیں، اور کیوں بشیر! ہمارا 'صاحب' کہاں ہے؟ (یہ سید محمود حسین[2] صاحب لکچرار شعبۂ انگریزی کی طرف اشارہ تھا) بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی اور مشرقی نسخوں کو حال ہی میں نیو لکچرز روم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے، کتابیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ ان کتابوں کی باقاعدہ فہرست بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔

مرحوم نے فرمایا: فکر کی کوئی بات نہیں، یہ بھی کوئی کام ہوا، طفیل احمد[3] سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھادیں۔ فہرست تیار کردوں گا۔ بشیر صاحب نے کہا: بڑا پتہ مار کام ہے، آپ کیوں تکلیف کریں، فرمایا: بھئی ذرا دیکھوں تو سہی، جس کام کو نوجوان پتہ مار کہتے ہیں، اسے بوڑھوں کو کم سے کم دیکھ تو لینا چاہیے۔ غرض کام شروع کر دیا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، مدتوں مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک گوشے میں بیٹھے کام کرتے رہے اور بالآخر فہرست مکمل کر دی۔ مرحوم نے کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا کہ وہ کس کام میں مصروف تھے یہاں تک کہ کام بہ ہمہ وجوہ مکمل ہو گیا۔ پھر بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مرحوم نے فہرست مکمل کر دی تو میں نے عرض کیا یہ آپ خواہ مخواہ کا دردِ سر کیوں خریدتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے۔ تم بھی عجیب آدمی ہو یہ بھی کوئی کام ہوا، بشیر کو اس کی فکر تھی، میں نے کہا کام اچھا ہے فرصت بھی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے۔ فہرست کے مرتب کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ بعض نوادر کے دیکھنے کا مفت میں موقع مل گیا۔ اس ذخیرے میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں جن کو سمجھتا تھا کہ

---

1. سید بشیر الدین سابق لائبریرین (ف 1984)

2. سید محمود حسین مرحوم سابق لکچرار انگلش

3. مولانا طفیل احمد منگلوری (1946-1868) 'مسلمانوں کا روشن مستقبل' کے مصنف، مرحوم نے اپنا کتب خانہ مسلم یونیورسٹی کو عطیہ کیا۔

ناپید ہیں، کسی کا صرف نام سنا تھا، ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا!

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے از سرِ نو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخاب میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم اسلامیہ پر جو کتابیں بیرونِ ہندوستان شائع ہوتیں ان پر خاص نظر ہوتی۔ اس فکر میں رہتے کہ کون سی کتاب کہاں شائع ہوئی، اکثر پوچھتے رہتے کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب، شاعری یا اس قبیل کے کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ ان کتابوں سے خاص دل چسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اردو میں شائع ہوتیں۔

کہا کرتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو اردو ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ براہِ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو تحقیقات علمیہ کا کام کرتے ہیں ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اردو ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مرحوم کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان تمام اردو کتابوں کو دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے، جو فلسفہ مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمے سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا اس سے کہیں دوررس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں کیوں کہ فلسفہ کی ترقی سائنس کے انکشافات، مطبوعات کی اشاعت، ملنے ملانے کی سہولتیں، عوام و خواص دونوں کے ذہن و افکار کو بڑی سرعت اور شدت سے متاثر کر رہی ہیں۔ اس لیے ان مطبوعات پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب و گیاہ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت، نہ وہاں پہنچنے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ نہ نماز جنازہ پڑھنے کی کوئی ستھری معقول جگہ، نہ محافظ قبرستان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام، نہ میت کے لے جانے کے لیے کوئی تابوت۔ اسی طور پر یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضوخانہ نہ تھا۔ لوگ حوض کے گرد بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میّت کو غسل دینے اور

کفنانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مرحوم نے نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ ان سب کا معقول انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سرسبز اور سایہ دار جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں۔ صاف پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظ گورستان مع تمام ضروری سامان کے چوبیس گھنٹہ وہیں موجود رہتا ہے۔ نماز جنازہ کی جگہ متعین ہے۔ صفیں بنی ہوئی ہیں، اس کا بھی انتظام ہے کہ دفعتاً کوئی موقع آ جائے اور معقول انتظام جلد اور بروقت نہ ہو سکے تو تکفین و تدفین کا پورا سامان موجود رہے۔ مسجد میں ستھرا اور خوب صورت وضوخانہ ایک کھلے ہوئے کشادہ برآمدے میں بنا دیا گیا ہے غسلِ میت اور تجہیز و تکفین کے لیے مسجد سے ملحق لیکن الگ ایک جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔ یہ انتظامات جتنے ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف ذہن کم منتقل ہوتا تھا۔ مرحوم کو ان کا پورا احساس تھا اور انھوں نے بعض دشواریوں کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کر کے ان سب کا مناسب انتظام کر دیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بڑا چرچا تھا کہ لڑکے کثرت سے سینما دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس سے باہر، شہر کے اندر، رات کے وقت نوجوان طلبا کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا اچھا نہیں، اس سے ان کے خصائل و اخلاق پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے اور حکام یونیورسٹی کے انتظامی در و بست میں بھی خلل پڑتا ہے۔ اس سے یہ بہتر ہوگا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سینما ہال کھولنے کی اجازت دی جائے جس پر یونیورسٹی کی نگرانی ہو۔ دوسرے یہ کہتے تھے کہ سینما مخربِ اخلاق ہے اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دینا غلط فہمیوں کا باعث ہوگا یونیورسٹی میں 'ڈرامیٹک سوسائٹی' پر بھی اعتراضات کیے جا رہے تھے کہ یہ چیز اسلامی درس گاہ میں نہ ہونی چاہیے۔

ایک دن عرض کیا مولانا اس سینما اور ڈرامیٹک سوسائٹی کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے۔ فرمایا: مذہبی نقطۂ نظر کی فکر کیوں ہے۔ تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سوا مذہبی نقطۂ نظر کے کسی اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا اور نہ خود اپنی کوئی رائے رکھتا ہے، اچھا یہ تو بتاؤ مذہبی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی اتنی فکر کیوں ہے، اس پر عمل کرو گے؟ ہندوستان میں بہ حالت موجودہ عمل

کیا بھی جا سکتا ہے؟ آخر اس پر کیوں نہیں راضی ہو جاتے کہ مذہبی نقطۂ نظر کا انکشاف کیے بغیر معقول پسندی اور حسنِ تدبیر کو دخل دیا جائے۔

عرض کیا: بات تو ٹھیک ہے لیکن ذرا گند ذہن اور صلح جو واقع ہوا ہوں، معقول پسندی سے بڑی ذمے داریاں پیدا ہوتی ہیں، ان سے کون نپٹے۔ مذہبی نقطۂ نظر میں یہ آسانی ہے کہ جب جی میں آیا خود جامہ سے باہر ہو گئے اور جب جی چاہا کسی کی پگڑی اُچھال دی۔ مولانا اپنے خاص انداز میں بغیر آواز کی ہنسی ہنسے، رومال سے چہرہ پونچھتے اور پھر اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے: دیکھو اسلام ایک مجموعہ ہے مخصوص معتقدات اور مکمل اعمال کا۔ اس کے ہر جزو کو کل میں دیکھنا چاہیے، نہ یہ کہ کل کو نظر انداز کر کے جزو میں الجھ جائے۔ جہاں اسلام کا مکمل، مستقل و موثر نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر تحریک کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا بے کار اور اس کے بروے کار لانے کی کوشش مضر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بحث نازک اور طویل ہے، کسی مستقل صحبت میں اس پر مفصل گفتگو ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قباحت کا انسداد ناممکن ہو تو انسداد کی اتنی نہیں جتنی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈرامے میں سوانگ بھرنا، گانا گانا، ناچنا اور مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں بالخصوص مسلمانوں کو زیب نہیں دیتیں۔ ورزش، تفریح، تعلیم، یا اظہارِ کمال کی اور بہت سی معقول صورتیں ہیں۔ آخر ڈراما ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جائے، اچھے ڈرامے لکھو اور اپنی فکر کی زیبائی ورسائی کا ثبوت دو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسے کرنے بھی لگو۔ فنونِ لطیفہ کی تعبیر میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں، اسلام طبیعت کی اُپج کو نہیں روکتا البتہ اس کی نامعقول تعبیر و تشکیل کا احتساب کرتا ہے مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم نہیں۔ انسانی اعمال و افکار کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سروپا نہیں ہے۔

مرحوم اتفاق سے بھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی مخل صحبت ہوا ہے چہ جائیکہ وہ مولوی ہو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چول کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑ ہے، کوئی سنجیدہ، کسی کو

سیاسی مسئلہ سے دلچسپی ہے تو کسی کو مذہبی باتوں سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویے سے دیکھتا ہے، کوئی کسی سے۔ کوئی کچھ ہے کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ یونیورسٹی کے ناظمِ دینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے چند پابندیاں عائد تھیں اور ان کے اعتبار سے اس کے رہن سہن کے طورطریقے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیرمتوقع آمد پر بھی لوگ شادوشگفتہ ہوجاتے تھے۔ گفتگو کی بےتکلفی اور روانی میں کوئی فرق نہ آتا اور جی چاہتا کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔

مرحوم کی سیرت وشخصیت کا کمال یہ تھا کہ کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے اور نہ دوسرا متجاوز ہوسکتا تھا۔ خدا نے ایسا متوازن دل ودماغ دیا تھا اور شخصیت اتنی دل آویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی نہ انھوں نے اپنے طورطریقوں سے کبھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظمِ دینیات یا عالمِ دین تھے۔ یا دین کے پابند لوگوں سے جو چاہے ناروا حد تک بےتکلف ہوجائے۔

فرض کیجیے کسی مذہبی یا اخلاقی یا اختلافی مسئلہ پر گفتگو ہورہی ہو، مولانا کبھی کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے اور نہ ائمہ واکابر کے قول پیش کریں گے بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطۂ نظر اس طور پر پیش کریں گے کہ بحث میں آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی، اور آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس سے بہتر اور کوئی موقع اس مسئلہ کے سلجھانے کا نہیں مل سکتا تھا۔

اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے۔ مرحوم کی خدمت میں راقم بطور ایک حد تک بےباک تھا۔ ایک بار ایک طویل 'علمی مذاکرہ' کے بعد عرض کیا: مولانا بات تو آپ ٹھیک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدیہہ گوئی وبدیہہ آفرینی کے سلسلے میں تھیں یا اللہ اور رسول کے کلام سے بھی ان کی سند ملتی ہے۔ مرحوم اپنی ذہین اور دل نشیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہی اپنی مخصوص ہنسی ہنسے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، لیکن ہنسی کے زور سے سارا جسم جھٹکے کھانے لگتا تھا، فرمایا: تمہارے سوالات بھی خوب ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ رسول کے بارے میں آج کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنے والے ہو۔

عرض کیا: فیصلہ کن، نہیں فیصلہ ہی کہیے اس لیے کہ میں فیصلہ تو اکثر کرلیا کرتا ہوں البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ فرمایا: میں جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق ''کلامِ الٰہی اور حدیث نبویؐ'' سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مرحوم نے آیات قرآنی سنائیں، احادیث کا حوالہ دیا، غرض ہر بات پورے طور پر منقح کردی۔

مرحوم کا یہ خاص وتیرہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو جب تک ان سے خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا وہ کبھی مباحثہ میں شریک نہ ہوتے۔ برخلاف محض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ جانتے ہیں اسے بے تکان بتانا شروع کردیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ لوگ ان کے فکر ونظر کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس وقت تک نہ چپ ہوں گے جب تک ان کا مبلغ علم ختم نہ ہو جائے یا لوگ حفاظتِ خود اختیاری میں بھاگ نہ کھڑے ہوں۔

لیکن جب کوئی بات مرحوم سے براہِ راست رجوع کی جاتی تو نہایت خوشی، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے اور علوم و احکام دینیہ کے تمام نکات وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے جن پر ائمہ کو اختلاف ہوتا، اسے بھی صفائی وصداقت کے ساتھ واضح کردیتے مرحوم کو علوم دینیہ پر بڑا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور اکابر کے اقوال دیانت اور وثوق سے پیش کرتے اس وقت یہ حیرت ہوتی کہ یہی مولانا جواب تک سب کے ساتھ خوش گپّی میں مصروف تھے ایک متبحر عالم کے فرائض کس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے سہتے دیکھ کر کسی کو بہ مشکل یہ گمان ہوتا کہ مرحوم کا علم کتنا حاضر، کتنا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علوم جدیدہ سے آشنا ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتا لگا ہی سکتے ہیں کس مبحث میں کس کا کون پہلو کمزور ہے۔

ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ مولانا مذہبی نقطۂ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں گویا وہ خالص مذہبی نقطۂ نظر نہ تھا بلکہ ان کے مدّنظر ہمارا ہی اصول بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے

مرحوم ہمیں لوگوں میں سے ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرتے تھے جو موجودہ دور میں مسائل مبہمہ نہیں بلکہ مسلّمہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی مہرِ استناد لگی ہوئی تھی۔

علوم اسلامیہ میں جو تبحر مرحوم کو تھا اس سے قطع نظر دیگر علوم وفنون سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں بڑا درک تھا۔ ریاضیات جدیدہ کے بعض کاملین کو یہ کہتے سنا کہ مولانا کو ریاضی اور اقلیدس پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں ریاضی کا جو سرمایہ ہے اس کا معقول حصہ مرحوم کی نظر سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات میں چبوترے پر لیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب وغریب نام عربی فارسی میں آئے ہیں، ان سب کو دکھاتے بتاتے۔ ایک دفعہ سمت قبلہ کی بحث آگئی قطب تارے کا مقام اور مختلف متعلقہ ستاروں کو ایک ایک کر کے بتایا۔ عہد پیشیں کے ماہرین فلکیات نے اپنے حساب کی رو سے جن ستاروں کا جو محل یا مقام بتایا تھا اور امتداد زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے ان سب کو بڑے لطف و وضاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلے میں جنتریوں کی مفصل تاریخ اور ان کے اصول ترتیب وتدوین بھی سنائے۔

ایک دن کہنے لگے: اور کیوں جی! غالبؔ کے کلام میں بنات النعش کا نام آیا ہے، ان کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: جی نہیں۔ فرمایا دیکھو گے۔ میں نے کہا: اب کیا دیکھوں، ان کے دیکھنے کا لطف تو غالبؔ ہی کے زمانہ میں تھا یونیورسٹی کے عہد میں دیکھ کر کیا کروں گا، ہوں گی بھی تو یونی فارم ہی میں ہوں گی۔ ورنہ آپ دعوتِ دید کیوں دیتے! مرحوم بہت لطف اندوز ہوئے۔

اکثر صحبتوں میں نظیریؔ اور غالبؔ کے کلام پر محاکمہ کرتے۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ مرحوم کا فارسی شاعری اور فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور سلجھا ہوا تھا۔ مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی اچھا شعر پڑھا جاتا تو اکثر وہ اس سے ملتے جلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر سنا دیتے۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اردو اساتذہ کے بھی اَن گنت اشعار یاد تھے، اشعار مزے لے لے کر پڑھتے تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہبی معتقدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسنؔ نے سمویا اور بنایا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانونِ وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی۔ قانون کے اکثر طلبا فرائض کی تقسیم سمجھنے کے لیے مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے اور ان مضامین کے طلبا کو پورے طور پر مطمئن کر دیتے تھے۔

عرصہ کی بات ہے یونیورسٹی میں ایک بنوٹ ماسٹر رکھے گئے تھے، بڑے شریف اور محبت کرنے والے انسان اور اس فن کے امامِ وقت تھے، مولانا سلیمان اشرف مرحوم ان پر بہت مہربان تھے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی بنوٹ سیکھیں۔ اکثر اصحاب نے سیکھنا شروع کر دیا تھا، ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ سطور یقیناً گزریں گی اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نماز فجر کے بعد مرحوم گھومتے گھامتے ان کے گھر جا پہنچے۔ جہاں اور باتیں ہوئیں وہاں ضمناً یہ بھی پوچھا اور کیوں صاحب کچھ بنوٹ کی بھی مشق بہم پہنچائی؟ فرمایا: جی ہاں دو چار ہاتھ سیکھے تھے لیکن ادھر ناغہ ہوتا رہا اس لیے مشق و صفائی کی نوبت نہ آئی، پینچ اور پینترے بھی کچھ بھولنے لگا ہوں۔

فرمایا: اچھا مجھے بتایئے کیا سیکھا تھا، چنانچہ انھوں نے دو چار ہاتھ دکھائے مرحوم نے فرمایا: آؤ میں مشق کرادوں...... صاحب کا بیان ہے کہ مرحوم نے اس سلسلے میں جو داؤں پیچ بتائے اور جس صفائی سے لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی، وہ ہر اعتبار سے استادانہ تھی اور ثابت ہوتا تھا کہ بنوٹ کے فن میں بھی مرحوم طاق تھے۔

مردانہ کھیل پسند تھے، شکار کے بڑے شائق تھے۔ گولی بھی خاصی چلا لیتے تھے، شکار میں 'چلائی' تو وہ ایسی کر لیتے تھے کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے۔ غلیل چلانے کی بڑی اچھی مشق تھی، اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے۔ غلیل دیکھ کر بتا دیتے تھے کہاں کی بنی ہوئی ہے، کس زمانے کی ہے اور کس کوٹھی کا بانس ہے۔ بانس کی چھڑی بہت پسند کرتے تھے۔ بانس پہچاننے کا عجیب ملکہ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی یا ڈنڈا پا لیتے تو ہاتھ میں لے کر بڑے شوق سے دیکھتے بھالتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی سدھاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کیسے بنائی جاتی ہیں، کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے، کس طرح پختہ کرتے ہیں، اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ایک بار اُبھرے ہوئے حروف (ریلیف) کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ فرمانے لگے: طالب علمی کے زمانے میں اس قسم کی چیز رائج تھی۔ اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے یہ چیز بنا لیتے تھے اور یہ ایک طرح کا فن تصور کیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا اب مشق تو رہی نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں، شاید کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد ایک معمولی سے کاغذ کے پُرزے چٹکیوں کی گرفت میں لے کر تلے اوپر کچھ اس طرح ناخن سے کچوکے دیے کہ تھوڑی ہی دیر میں چند حروف اُبھر آئے جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ڈائی سے اُبھرے ہوئے حروف چھاپ دیے گئے ہیں۔ فرمایا: مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تو پوچھتے کہاں تھے کیسے ہو، مسکرا کر اور دوستی کے لہجہ میں شفقت کے انداز سے دوستوں کے بارے میں لطف و مزاحمت کا کوئی جملہ کہتے، کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ و زندگی کی عارضی یا مسلسل مکروہات یا سیرت کے بعض داغ دھبّے دُھل جاتے یا مدّھم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت، اولوالعزمی، خلق و خدمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑا انعام تھیں!

میرا پہلا مکان مرحوم کے مکان سے بالکل قریب تھا۔ ممتاز ہاؤس کے پورب میں ایک بڑا میدان ہے۔ اس سے گزر کر مولانا کالج اور مسجد جاتے۔ مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی میں آگ برستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا تیرہ و تار ہوتی۔ مولانا ظہر کی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے۔ اسی پابندی وقت سے جیسے گھڑی چلتی ہے۔ بالکل جیسے کوئی مجاہد میدانِ جنگ میں جاتا ہے، نہایت ہی معمولی قسم کی کھدّر کی صدری، کھدّر ہی کا لمبا کرتا اور ٹخنوں سے اونچا پائجامہ۔ ایک لمبا سا رومال کاندھے پر۔ موسم کی شدت سے گلا اور کان چھپائے ہوئے، سر پر عمامہ پاؤں میں سرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پنجابی وضع کا جوتا۔

عمر غالباً 55 سال ہوگی، جسم و جسامت کے اعتبار سے ممتاز نہ تھے، بال کافی سفید ہو چکے تھے، لیکن طبیعت ایسی مردانہ پائی تھی کہ ان کے کسی فعل سے کبھی یہ نہ محسوس ہوا کہ رفتار گفتار یا کردار میں تھکن کا کوئی شائبہ بھی تھا۔ منزلیں مارتے پیدل آئے ہیں اور اپنے لمبے رومال سے پاؤں کے گرد طاقت و اعتماد سے جھاڑ کر کرسی مونڈھے یا چارپائی پر بیٹھ گئے۔ نہ زبان سے

کوئی ایسا فقرہ کہیں اور نہ تیور سے اس کا پتا لگے گا کہ تکان غالب ہے۔ اسی طور پر جب اٹھ کر کھڑے ہوتے تو نہ بوڑھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر کسل مند ہو کر یا آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم اٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدّر کا لباس، سپاہیانہ عمامہ، ہاتھ میں ڈنڈا، قدم لمبے اور ہموار جیسے کوئی قواعد پریڈ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ ہو کسی حال میں ہوں یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں ایک انچ کی کمی بیشی ہو جائے یا رفتار میں جھول آ جائے، مسجد جا رہے ہوں، کلاس پڑھا کر نکلے ہوں، دوستوں کے ساتھ ہوں یا جنازے کے ہمراہ، اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی ہو یا غمی لب ولہجہ کے مردانہ پن میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی محفل ہو، کسی شخص کا سامنا ہو مرحوم کہیں جھجکتے نہ تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو، گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری، بات میں صفائی، چہرہ پر مردانگی، انداز میں شگفتہ سنجیدگی۔ آتے تو لوگ خوش ہو جاتے، جاتے تو بڑی خوش آئند فضا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ بالعموم کھلا رہتا تھا۔ مرحوم کا معمول تھا کسی نہ کسی وقت ضرور آ جاتے، کوئی مہمان ہوا تو اس سے تھوڑی دیر تک گفتگو کی، میں آ گیا تو خیر ورنہ اطلاع کبھی نہ کرائی۔ اندر بچے سن پاتے کہ مولانا تشریف لائے ہیں بھاگ کر باہر آتے۔ مرحوم بھی اسی انتظار میں ہوتے۔ دور ہی سے کہتے بھاگ آ بھاگ آ اور عبا میں چھپ جا۔ میں آتا تو پوچھتے بتاؤ منّی کہاں گئی، میں کہتا معلوم نہیں البتہ آپ کے عبا کے نیچے دو پاؤں نظر آ رہے ہیں۔ کہتے ارے وہ تو چلی گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کہتے اور اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھانکتے جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں، بچوں نے دیکھ پایا۔ سب کے سب شور مچاتے۔ پہنچ جاتے اور کہتے عبا میں چھپائیے۔ مولانا کتنے ہی ضروری کام سے جاتے ہوں، ٹھہر جاتے۔ ہر چہار طرف طلبا اور لوگ آتے جاتے ہوتے۔ مولانا ان بچوں کی فرمائش کو پورا کرتے اور آئندرونداگان سے پوچھتے بتاؤ فلاں بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے اور مرحوم کی اس تفریح کا تماشا دیکھتے۔ کئی بچے ہوتے اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو اپنا ڈنڈا دے

دیتے کہ لے اسے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کاندھے سے رومال اُتار کر اس پر ڈال دیتے اور اسے بھی چھپا لیتے۔

جاڑے میں کھدّر کی پوری آستین کا شلوکا پہنتے اور نہایت سستے داموں کا کمبل نما کپڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر لمبے کُرتے پر ایک صدری استعمال کرتے لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بے تکلف دوستوں کے ہاں جاتے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمامہ، البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔ ڈنڈے کے سہارے کبھی نہیں چلتے بلکہ اسے اس انداز سے لے کر چلتے تھے گویا سہارا مقصود نہ تھا بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

چندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بڑا شوق تھا، روپے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن موقع آن پڑتا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے۔ ایک دفعہ کسی قدر آزردہ ہو کر مرحوم سے عرض کیا کہ آخر آپ اس قدر شاہ خرچی پر کیوں اُتر آتے ہیں۔ مسکرائے فرمانے لگے، بھائی دیکھو تو کوئی مانگتا ہے جبھی تو دیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا۔ عرض کیا آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو گئے ہیں اس لیے بے تکلف مانگ بیٹھتے ہیں، کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا قصہ سناؤں۔

ایک عرب کی مڈبھیڑ اپنے جانی دشمن سے ہوگئی، عرب کے پاس نہایت اچھی تلوار تھی، دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کر دی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالے کر دی۔ بات آئی گئی ہوگئی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ حماقت کیوں کی، تم تو نہتّے ہو گئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا ہوتا تو کیا کرتے، کہا ٹھیک کہتے ہو اتنی سی بات تو میں بھی سمجھتا تھا لیکن اس کو کیا کروں۔ جب وہ مانگ بیٹھا تو کیسے نہ دیتا۔ غور تو کر وہ مانگ بیٹھا!!

میں نے کم لوگوں کو مرحوم جیسا کنبہ پرور اور مہمان نواز پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے مہمانوں عزیزوں اور نو واردوں سے بھرا رہتا۔ آج تک نہ دیکھا کہ دو چار اجنبی یا مہمان نہ موجود ہوں۔ جو خود کھاتے وہ سب کو کھلاتے، چائے، کھانا، فواکہات غرض اس قسم کی تمام چیزیں سب کے ساتھ باہر مردانہ میں صرف ہوتیں۔ یہ خاندانی روایات میں سے تھا۔ وطن میں بھی مولانا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا ماویٰ و ملجا تھا۔ جس کا جی چاہے چلا آئے۔ گھر والوں کی طرح

رہے سہے، کوئی نہ پوچھے گا کہ آپ کون ہیں، کیسے آئے کب تک رہیے گا، اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا۔ جو خاندان کے اعزا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اُس سے کوئی تکلف نہ برتا جائے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر صحبت میں ہر گفتگو میں بلا تکلف شریک ہو۔ بالکل یہی نقشہ علی گڑھ میں پندرہ سال تک مرحوم کے دم سے قائم رہا۔

ایک دن علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار بزرگ مولانا کے ہاں اتفاقاً آ گئے، سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی۔ مجمع دیکھ کر جھجھکے دریافت کیا کہ کس کا 'ایٹ ہوم' ہے۔ مولانا بھی مجمع ہی میں ملے جلے ایک طرف بیٹھے تھے بولے آ جایئے آ جایئے یہاں ہر شخص ایٹ ہوم ہے۔ ان بزرگ کو اب تک اس پر تعجب ہے کہ ایک مولوی جس کی آمدنی یا تنخواہ بالکل معمولی تھی اتنا شاہ خرچ کیسے ہو سکتا ہے۔

مرحوم کو چائے کا بہت شوق تھا۔ تکلف اور اہتمام سے چائے پیتے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرے میں کچھ دیر قیام فرماتے۔ مرحوم کے احباب اور معتقدین بھی آ جاتے، چائے کا دور ہوتا، سب لوگ لطف و اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مرحوم کی سنجیدہ پُر خلوص اور شگفتہ باتوں کے مزے لیتے۔ یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اس حلقے میں بیٹھنے والے اس بات کا فخر و مسرت کے ساتھ اظہار کرتے کہ نماز جمعہ کے بعد مولانا کے ہاں بیٹھے، چائے پی اور گفتگو کی۔

رمضان شریف میں جب مرحوم مسجد میں معتکف ہوتے تو بھی ایک خاص بات سمجھی جاتی کہ مولانا سے اعتکاف میں ملاقات ہوئی۔ ہم کلامی و ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا کہ لوگ اس کو دن کا بہت اچھا واقعہ خیال کرتے تھے۔ مسجد کے شمالی سرے کی آخری محراب میں معتکف ہوتے اور چوں کہ اس زمانے میں کہیں ملنے ملانے جا نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس ہوتا اس لیے بالالتزام مولانا سے ملنے مسجد میں جاتا۔ ہر شخص سے اس کے مذاق کی گفتگو کرتے، عطر پیش کرتے، دو چار باتیں ہنسی کی بھی کرتے اور ایسا ظاہر کرتے کہ نہ روزہ کی کوئی تکلیف ہے اور نہ اعتکاف کی پابندی گراں ہے بلکہ ان دونوں کو وہ ایک ایسا رنگ دے دیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آئند اور قابلِ قدر معلوم ہونے لگتیں اور لوگ مولانا کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھتے جیسے سیر و تفریح کے لیے جانا، یہ ان کی سیرت کا عجیب پہلو تھا کہ ان

کے 'معمولات' دوسروں کے لیے ادارہ بن جاتے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد اپنے دفتر میں ٹھہرنا اور چائے پینا یا اعتکاف میں بیٹھنا معمولات میں سے تھا لیکن دوسروں کے لیے یہی صحبت ایک معاشرتی ادارہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور جب تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھ نہ لیتے جیسے ان کے روزانہ پروگرام کی تکمیل نہ ہوتی!

موسم سے کبھی متاثر نہ ہوئے۔ پنج وقتہ نماز مسجد میں پڑھی اور پڑھائی علی گڑھ کے جاڑوں میں فجر کی نماز اوّل وقت مسجد میں جا کر پڑھانا معمولی بات نہیں ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کر دوستوں میں آ بیٹھتے اور عشا کے وقت رخصت ہو جاتے، اکثر ہم لوگ عرض کرتے مولانا کہاں جایئے گا، آج تو منشی جی ہی کو کرامات کا افتخار حاصل کرنے دیجیے۔ کہتے نہیں بھائی منشی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوگ گھبراتے ہیں طلبا کا سابقہ ایسے سے نہ ہونا چاہیے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو، میں نماز کے بعد آ جاؤں گا۔ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دے دیتے یہ محض ہم لوگوں کا دل رکھ لینے کے لیے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا کسل محسوس کر رہے ہیں، یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہے یا کسی کام میں بڑے انہماک سے مشغول ہیں کہ نماز کا وقت آ گیا۔ مرحوم چاق ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے، اور نماز پڑھانے چل دیتے، اس طور پر جیسے ان میں نئے سرے سے توانائی پیدا ہو گئی یا کوئی بڑا خوش گوار فرض یاد آ گیا ہو۔ لطف یہ کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو ندامت میں مبتلا نہ ہونے دیتے اور یہ محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ نماز پڑھانے جا رہے اور دوسرے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ بعضوں کا رویہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شرعی فرض بجا لائیں گے تو اس طور پر کہ دوسروں کو نہ جائے فرار ملے نہ جائے عافیت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو مذہبی فریضے ادا کرنے کے لیے اس طور پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا اس کے لیے آمادہ ہونا دوسروں پر عذابِ الٰہی نازل ہونے کا موجب ہوگا۔ عبادت یہ ضرور کرتے ہیں لیکن دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تمجید و تسبیح سمجھنے کے علاوہ غافلوں کے خلاف مقدس چغلی سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنّت میں شریف انسان کے بجائے سرکاری گواہ بن کر جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مرحوم ایسے نہ تھے۔ انھوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا دنیوی امور میں خوش طبعی یا سہل انگاری کو دخل دے جاتے تو مرحوم ہنس کر لطف و مرحمت سے فرماتے۔ ''ارے بس کر بھائی بس کر،'' بڑا شریر ہے اس سے جان بچانی مشکل ہے، لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مرحوم ہم کو اور ہم مرحوم کو عزیز تھے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ کیا ہے مرحوم ہم کو ناظمِ دینیات کی حیثیت سے نہیں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز تھے اور وہ بھی ہم کو انسان ہی سمجھتے تھے اور یہ وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان دو قالب بنا رکھا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں کہہ گئے۔ میاں دوسرے مذاہب عقائد پر زور دیتے ہیں اسلام اخلاق و اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ مسلمان کا ہر فعل گناہ ہے یا ثواب، اس نکتے کو پیشِ نظر رکھو پھر جو جی چاہے کرو!

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت نماز نہ ادا کرنے پر جرمانہ ہوتا ہے، جن طلبا پر جرمانہ کی سزا عائد کی جاتی وہ معاف کرانے کے لیے مرحوم کے پاس آتے ان سے لطف و شفقت سے پیش آتے، نہ جھڑکتے نہ گھڑکتے، نہ شرمندہ کرتے۔ باتوں باتوں میں نماز نہ پڑھنے کے وجوہ دریافت کرتے پھر کہتے میاں تمہارا یہ زمانہ بے فکری اور آزادی کا بھی ہے اور پابندی و ریاضت کا بھی، بڑے ہو گے تو اس زمانے کی فراغتوں یا غفلتوں کو یاد کر کے مسرور یا ملول ہو گے۔ اس لیے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مت گنواؤ۔ اس وقت دکھ درد میں اپنے ماں باپ یا سرپرستوں سے تقویت حاصل کرتے رہو جب بڑے ہو گے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہوگا اس وقت بھی سہارے کی ضرورت ہوگی وہ ایسا وقت ہوگا جب اس سہولت سے تم کو سہارا نہ ملے گا جو اس وقت میسّر ہے۔ اس لیے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈو تا کہ موقع پر پچھتاوا نہ ہو۔ جاؤ جرمانہ معاف کیا جاتا ہے۔

گلے کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا وہی جس کا یقین تھا۔ ایسا یقین جو ٹالنے بہلانے کی حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔ ڈاکٹر حکیم، وید، سیانے دوانے، سبھی سے رجوع کیا گیا۔ تکلیف میں تھوڑا بہت افاقہ ہو جاتا تھا لیکن قابلِ اطمینان صورت کبھی نہ ہوئی۔ لاعلاج مرض اور محبوب مریض کی مسلسل تیمارداری،

دوا دوش، زیر باری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندوہناک انجام قریب تر آتا جا رہا ہے کیسا مستقل ذہنی کرب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہو اور خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو۔

لیکن مرحوم اپنی جگہ تنہا کھڑے تھے جیسے کوئی مجاہد تنہا دشمنوں کے سامنے ہو، تلوار ٹوٹ چکی ہو، زخموں سے جسم پاش پاش ہو، پیچھے دیوار ہو، سورج ڈوبنے والا ہو اور موت کے پرندے دم بہ دم بڑھنے والی نو بہ نو اور تہہ بہ تہہ تاریکی میں چیخ چیخ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مدوجزر اُبھرتے مٹتے رہے ہوں گے لیکن لبوں پر شگفتگی، آواز میں امید و استقامت اور آنکھوں میں روشنی جھلکتی رہی، ہراس و ناامیدی کا کوئی اثر نہیں۔ تیمارداروں کو تھپکتے، ملنے والوں کو تسکین دیتے۔ نہ کراہتے نہ بیزار ہوتے نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ پگھل گئے لیکن ہلے نہیں۔

رخسارے میں سوراخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چبا نہیں سکتے تھے، صرف رقیق غذا پر مدار تھا وہ بھی کس مصیبت سے فرو کی جاتی تھی۔ ایک دن موجود تھا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے جو بار بار رخسارہ کے سوراخ سے نکل جاتا تھا کبھی ناک میں چڑھ جاتا کبھی چھینک یا کھانسی آنے لگتی۔ کپڑا تر بتر ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بھر آئی۔ لیکن مرحوم کے منھ سے کوئی کلمہ مایوسی یا بیزاری کا نہ نکلا اور نہ تھکنے ہارنے کا اظہار کیا۔ مشکل سے دو چار تولے دودھ کے فرو ہوئے ہوں گے لیکن مرحوم نے پیالہ اس انداز سے واپس کیا جیسے خوب آسودہ ہو چکے ہیں۔ یہ صرف تیمارداروں کی دل دہی کے لیے تھا۔ اتنا ضرور فرمایا، یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔

گذشتہ عید میں اس قابل نہیں رہے تھے کہ مسجد جا سکتے۔ چنانچہ مردانے میں چارپائی پر دھوپ میں لیٹے سامنے تین طرف کرسی اور مونڈھے دور دور تک بچھا دیے گئے۔ ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ جو آتا تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دور ہی بیٹھ جانا چاہتا اسے اپنے پاس بلاتے، مصافحہ کے لیے خود ہاتھ بڑھاتے، ان کی گرفت میں اب بھی توانائی تھی۔ پاس سے عطر اٹھا کر دیتے۔ اس وقت تک گفتگو کر لیتے تھے۔ ہر آنے والے کا خیر مقدم آنکھوں کی پُرمعنی و پُرمسرّت جنبش سے کرتے۔ لطف کے بھی دو چار کلمے کہتے گھر سے کوئی بچہ آ نکلتا تو اسے

اپنے پاس بلاتے اس کی آرائش وزیبائش کی خاص انداز سے داد دیتے خوش دلی اور خوش فعلی کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ کس اذیت میں مبتلا ہیں۔

مرحوم کا معمول تھا کہ عید و بقرعید کی نماز شروع ہونے سے ذرا پہلے جگہ جگہ کھڑے ہوکر تکبیروں کی تعداد اور قیام وقعدہ کے طریق بتاتے تھے ان کا ایک فقرہ اب بھی یاد آتا ہے..... 'بدوں ہاتھ باندھے رکوع میں چلے جایئے۔' ہر شخص سے معانقہ کرتے ہزاروں آدمیوں سے گلے ملنا اور خوش دلی کا دامن نہ چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مسکرا کر آزادی اور شفقت سے گلے ملتے، ملنے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن رسیدہ سنجیدہ متقشف یا متبحر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہے ہر شخص یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص وخوش باش دوست سے مل رہا ہے یا مل چکا ہے۔ گذشتہ عید کا موقع تھا حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا، مولانا آج عید میں آپ کو نہ دیکھ کر طبیعت بہت اُداس ہوئی، مسکرا کر فرمایا، انشاءاللہ آئندہ عید میں اس کا موقع ملے گا۔ اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ بے ساختگی سے کہہ سکتے ہیں!

قویٰ اتنے اچھے اور مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے شدائد کے آخری حدود تک پہنچ گیا لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے کسی کا سامنا نہ ہوا۔ کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی خلش نہیں پیدا ہوئی۔ مدتوں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے رہے اس دم خم کے ساتھ کہ کسی کو اصل مرض کا علم نہ ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کر سکتا کہ کوئی معمولی سا پھوڑا پھنسی ہے جس پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اس عمر اور اس مرض میں نظامِ جسمانی کا ایسا توازن اور قوتِ ارادی کی یہ پختگی حیرت انگیز ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحبِ فراش نہ ہو گئے متعلقہ فرائض پابندی اور تن دہی سے بجا لاتے رہے۔ ایک بار پروائس چانسلر صاحب دیکھنے گئے۔ مرض شدت پر تھا۔ گفتگو مشکل سے کر سکتے تھے۔ زنان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ پروائس چانسلر صاحب نے چاہا کہ کچھ تسکین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں۔ مولانا نے سبقت کی، اور مسجد کے جنوبی سلسلہ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا۔ اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھیڑ دیے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسا

ہوگیا تو اس کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ پرووائس چانسلر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے، مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی۔ لیکن اس طور پر بالکل نہیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے بلکہ اس بشاشت اور دلیری سے جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہی نہ تھے۔

مرحوم سید سلیمان اشرف صاحب کے جنازے کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے۔ نماز جنازہ پڑھانے کا سوال ہوا تو اس بنا پر معذوری کا اظہار کیا کہ رخسار کے زخم سے ریم آتی تھی لیکن بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس معذوری کا صدمہ تھا۔ قبرستان سے واپس ہوتے ہوئے فرمایا، اس آخری خدمت کے بجا نہ لانے کا افسوس ہے۔ سر دار اُٹھ گیا۔

اسٹریچی ہال[1] میں کسی کی پذیرائی کی تقریب تھی مرض کی ابتدائی حالت تھی۔ لیکن تکلیف بہت تھی۔ اس موقع پر مرحوم کو جلسہ کے افتتاح کے سلسلے میں کلام پاک کی تلاوت کرنی تھی۔ ہم سب نے عرض کیا کہ مولانا آپ تکلیف نہ فرمایئے کوئی اور تلاوت کر دے گا۔ فرمایا نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، ایسی بھی کیا تکلیف کہ کلامِ پاک کی چند آیات نہ تلاوت کر سکوں چنانچہ ٹھیک وقت پر اسٹریچی ہال پہنچے سر اور رخسار پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرہ تکلیف سے تمتمایا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ڈنڈا لیے ہوئے ڈائس پر پورے وقار اور مستعدی سے آئے۔ آواز میں کہیں تزلزل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور براہِ راست مکان واپس آ گئے۔

مرض بڑھ چکا تھا ایک دن شام قریب تھی سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم سب کے دیرینہ شناسا ایک افغانی پٹھان آ گئے جو مشک زعفران، بعض ادویات شال اور سمور وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے۔ حاضرین پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی، خان کا غیر متوقع ایسی حالت میں آنا ہم لوگوں کو گراں گزرا لیکن مولانا نے اس صورت حال کو لطف و ہمت کے ساتھ دور کیا۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد اشارے سے مزاج پُرسی کی اور لمحہ بھر بعد لڑکھڑاتی آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا، کیوں خان ہمارے لیے کیا لائے، خاں نے جواب دینے میں تامّل کیا تو بولے زعفران اور مشک لائے ہو۔ خان نے کہا، اللہ آپ کو شفا دے

---

1 اسٹریچی ہال۔ سر جان اسٹریچی، گورنر صوبہ متحدہ کے نام سے موسوم عمارت کا نام ہے۔

سب کچھ حاضر کروں گا۔ مرحوم نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں اور بہت کچھ خریدیں اسی لطف وشوق سے جیسا کہ تندرستی میں کیا کرتے تھے۔

مسلسل مصائب بالخصوص بیماری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ بعض انسانی کمزوریوں کو اُبھار دیتی ہے، آدمی زود رنج اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے۔ صحت و عافیت میں جن لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے، مرض و مصیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولانا کا مسلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولانا کسی پر برہم ہوئے ہوں یا زبان سے کوئی غیر ثقہ کلمہ نکلنے دیا ہو۔ بچوں پر، چھوٹوں پر، نوکروں پر، بعض نامعقول لوگوں پر آدمی کبھی نہ کبھی غصہ کرتا ہی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کسی حال میں آپے سے باہر نہیں ہوئے کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا ہمیشہ شگفتہ سنجیدہ اور متوازن پایا۔

اس مسلسل و مہلک بیماری میں وہ ہر مرحلے سے گزرے، ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، توقعات کے خلاف اس سلسلے میں مایوسی بھی ہوئی، سخت زیر بار ہوئے۔ بعض صدمے بھی اٹھائے لیکن کوئی ناملائم کلمہ زبان سے کبھی نہ نکالا۔ چہرے بشرے سے بھی مایوسی یا بے زاری کا اظہار نہ کیا۔ ایک دن تکلیف زیادہ تھی، تھوڑی بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے لیکن تکلیف کا ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا یارا نہ تھا۔ اتفاق سے اسی دن ایک معزز بزرگ ملنے تشریف لائے، اور ہمدردی کی گفتگو شروع کر دی۔ مرحوم نے فرمایا الحمدللہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ زبان سے نکلا مزید گفتگو ہوئی تو فرمایا، دیکھئے تو کتنی عمر پائی اور کس فراغت وعزّت سے زندگی بسر ہوئی۔ آخر کوئی وقت تو آتا جب یہ دور ختم ہوتا، اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں۔ ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر حالت ہوتی۔

جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو زنان خانہ سے نکلنا ترک کر دیا تھا۔ ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا یہ میری نامعقول کمزوری ہے کہ ایسی حالت میں کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیج کر بلوایا، اندر پہنچا تو تخلیہ تھا، ذرا دور بیٹھنا چاہا اشارے سے قریب بلایا اب گفتگو کرنے میں بڑی دقّت ہونے لگی تھی۔ ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے پوچھا کہاں تھے۔ میں نے عرض کیا بس یوں ہی نہیں آنا ہوا، خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا، حالاں کہ خیریت

دریافت کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لیے کوئی اطمینان بخش خبر کبھی نہ ملی، اور نہ اس کی توقع ہوتی لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے اسی پر اکتفا کر لیتا تھا اور چاہتا کہ یہ تذکرہ ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مرحوم تھوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے، پھر بڑی کوشش سے اٹک اٹک کر لیکن صاف لفظوں میں فرمایا، پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جاؤں گا۔

اب مجھ سے رہا نہ گیا بے اختیار کہنا شروع کیا، مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کر دیکھا۔ اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز ہو تو روپیہ پیسہ دوڑ دھوپ محنت محبت اور دعا مانگنا تھا۔ یہ سب بے کار ثابت ہوئے اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں رہی۔ غور سے سنتے رہے۔ ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا دیر تک پکڑے رہے۔ داہنا ہاتھ خالی تھا اسے اٹھایا اور انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے ہلکے سے کھانس کر گلا صاف کیا اور بولے ''وہ دیکھتا ہے۔''

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی، تعطیلوں میں پہاڑ چلا گیا۔ جس رات کو روانہ ہونے والا تھا، طبیعت کا عجب حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آخری بار دیکھ آؤں اس لیے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی ساعت دور نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے میں اس کی سکت نہ پاتا تھا کہ یادداشت کی اس نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جاسکے۔ دیر تک حیص بیص میں رہا۔ بالآخر اس فیصلے پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں۔ پہنچا تو در و دیوار اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں ایک غم ناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی دل و دماغ پر چھا گئیں جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا۔ ہمت چھوٹ گئی سلام کے بغیر لوٹ آیا۔ تعطیلوں بعد واپس ہوا تو مرحوم وطن جا چکے تھے اور وہیں سے مقررہ وقت پر ایک ساعت ادھر نہ ایک ساعت اُدھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

●●●

اصغر حسین گونڈوی

(1884-1936)

اصغر گونڈوی کا سال پیدائش 1884 ہے۔ ان کے والد کا نام منشی تفضل حسین تھا جو کچہری میں ملازم تھے۔ اصغر نے انٹرنس تک تعلیم گونڈہ ہی میں حاصل کی اور مالی پریشانی کی وجہ سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے اور ریلوے میں ملازمت کر لی۔ ان کو شراب نوشی کی عادت بھی پڑ گئی اور کسی عورت کے عشق میں بھی مبتلا ہو گئے، لیکن خوش قسمتی سے اصغر نے ایک بزرگ قاضی عبدالغنی صاحب سے بیعت کر لی اور شراب نوشی سے توبہ کر لی اور ان پر مذہبیت غالب آ گئی۔

جگر کے بہت عزیز دوست تھے۔ چشمہ کے کاروبار میں جگر کی مدد کی، لیکن جگر کی کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جگر کی طلاق شدہ بیوی نسیم سے انھوں نے شادی کر لی۔ اصغر کچھ عرصہ سر تیج بہادر سپرو کی ہندستانی اکادمی سے بھی وابستہ رہے۔ اصغر شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ان کی دونوں حیثیتوں سے اہمیت مسلّم ہے۔ 1936 میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے دو مجموعے 'نشاطِ روح' اور 'سرودِ زندگی' یادگار ہیں۔

رشید صاحب کے اصغر صاحب سے بہت قریبی مراسم تھے۔ رشید صاحب ان کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ اصغر صاحب جب بھی علی گڑھ آتے تھے تو رشید صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے۔

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا بُرے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں۔ ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں، ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لیے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات 1925 کے جاڑوں میں مدرستہ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد سہیل [1] ایم۔اے۔ایل۔بی (علیگ) ہی کے توسل سے ہوئی، جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات 1915 میں کرائی تھی۔ اس وقت میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا سہیل [2] صاحب کی اطلاع ہوئی

---

1. اقبال احمد سہیل (م۔1950)

2. آج جب کہ ان سطور پر نظر ثانی کر رہا ہوں، مولانا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں۔ جب سے اب تک کیسے کیسے دوستوں اور عزیزوں کو مرحوم کہنا پڑا ہے۔ اس محرومی سے اللہ بچائے یا نجات دلائے۔ (رشید)

تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے وردِ زبان کرتا آیا اس لیے کہ میں نے مولانا سہیل جیسا بے پناہ و برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا۔ وہ عالمانہ نکتوں اور مجلسی فقروں کو اس لطف کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے برمحل و مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے، کمرہ چھوٹا تھا، دروازے بند اور روشنی مدھم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلے میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بہ لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں۔ دراز قد، متوسط جسم، ستھری و خوش وضع پوشاک سر پر پتلے سڈول بھری بھری فرنچ کٹ داڑھی، سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی، چہرے پر اجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت، متوسط عمر، انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے، جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور کھلمنساہت سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا۔ مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولانا بولے، ملو ایک انسان لایا ہوں۔ میں نے کہا، شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو، ملو اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے۔ پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھالیا جیسے میرے ہاتھ اسے بیچنے والے تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو، اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے پیشہ وروں کے نہیں

بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سن کرنئی اور اچھوتی دنیائیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیوں کہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے۔

عرض کیا شعر بڑے مزے کا ہے۔ اسے بکس و بستر پر بیٹھ کر اور لوٹا ہاتھ میں لے کر غارت نہ کیجیے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا۔ اصغر صاحب ذرا 'روح نشاط'[1] تو نکالیے۔ ان کو اشعار سناؤں، میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجیے۔ جاڑا پڑ رہا ہے انگیٹھی آتی ہے۔ کھانا کھا کر چائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائے گا۔ آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قائل نہ عقبیٰ کا ڈر۔ مولانا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسے، دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے 'ابتہاج و اہتزاز' کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں۔ ابتہاج و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھ دار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں یا غیر مانوس ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس گیا، ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق عربی، فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر استعمال نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے منقح کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی

1۔ روحِ نشاط۔ اصغر گونڈوی کا مجموعہ کلام

سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دیے جائیں۔ عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہیے جب ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گزرنے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی۔ اندر سے پان آ گئے انگیٹھی سرد ہونے لگی ملازم نے اور کوئلے لا کر ڈال دیے، نہ اندر سے بلائے جانے کا خدشہ نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے جی چاہا سو گئے جی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولانا سہیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب 'روحِ نشاط'[1] تو نکالیے۔ مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے، آپ کو تو یوں ہی سب کچھ حفظ ہے۔ میں نے کہا، مولانا ذرا ٹھہریے ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا ہے۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا۔ جلدی کیجیے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا، رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد پینے اور مے خانہ بننے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متاعِ یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے، کہنے لگے۔ رشید صاحب ساغر و مے خانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے، کلال پیدا کرتے ہیں۔ شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد مے خانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے۔ علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی، کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا، ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتایئے مولانا سہیل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے، ان کی نہ پوچھیے تمام عمر میخانہ میں رہے، نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا، محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا، نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے۔

---

[1] روحِ نشاط۔ اصغر گونڈوی کے دیوان کا نام ہے۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے 'نشاطِ روح' کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا۔ آپ نے نشاطِ روح کا مطالعہ بھی کیا۔ میں نے کہا، اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے۔ یہ شخص بلائے بے درماں ہے، شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا، سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ دیکھیے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بزاخفش سے اُلجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون وارسطو سے کرنا چاہیے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا، متفرق اشعار نہ سناؤں گا، پوری غزل سنیے شاعر کو اسی طرح سننا چاہیے۔ تصور سے ہم کنار ہو جیے، تصویر دیکھ کر کیا کیجیے گا۔ پھر یہ غزل سنائی! کیسا نرم پر تمکین و گوارا لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی
گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے — جمالِ دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی
فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — اداؤ رسم بلالی و طرز بولہبی
سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں — حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں — جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی — جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے۔ لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحب فراش رہا۔ اس زمانے میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے، تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا، اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرے میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوش خبری سنا رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے، مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے۔ بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لیے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لیے آئے

تھے۔ میری طرف بھی آنکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانے میں میرا ایک مضمون 'شیطان کی آنت'[1] شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا۔ اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں کچھ سوچا، پھر مسکرا کر بولے۔ شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی؟ فرمایا، فرشتہ کو شیطان ہوجاتے بھی آپ نے سنا ہوگا! میں نے کہا۔ اصغر صاحب تکلیف نہ ہوتو کچھ سنائیے۔ اصغر صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف سے سنائی۔

سر گرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ
اڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بت خانہ

یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بت خانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

قربان ترے میکش ہاں اے نگہِ ساقی!
تو صورت مستی ہے تو معنی مے خانہ!

اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اس رخ خنداں کو
اک تار شعاعی سے الجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمی حسن شمع!
اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غم پروانہ

زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیّر ہے
صدر شکِ طریقت ہے یہ لغزش مستانہ

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ!

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے، وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہں ہو رہے بلکہ یوں ہی باہر جارہے ہیں۔ صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تو ایک عرصے کے بعد معلوم نہیں کس سلسلے میں پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی، میں نے آپ کو اخلاقاً بھی کبھی فکر مند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں۔ اچھا سنیے ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

ایک دن ہندستانی اکیڈمی سے مکان واپس آ رہا تھا... صاحب راستہ میں ملے اور نہایت غم ناک لہجے میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال

---

1. مضمون شیطان کی آنت مطبوعہ نگار۔ جولائی 1929 اور مشمولہ 'خنداں'

ہوگیا۔ ایسے تھے ویسے تھے میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجیے انتقال کرنا کیسا۔ میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے مجھے بدحواس یا بے وقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موافق ذرائع بتانے گنانے، میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں 'حیات' لکھی ہوئی ہے وہ نہ مانے۔ میں نے کہا، آپ نہیں مانتے تو آیئے تار دے کر دریافت کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش وتازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا، انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز ومحبوب رہتے، وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رساطبیعت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلے سے ان کا یہ سابقہ پہلی ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فنِ تنقید کے جدید ترین اصول سے آشنا تھے لیکن ہندستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن، مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اصل کا دھوکا ہوتا، پکے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن میں نے بڑے بڑے مغرب مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا۔ اردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریریں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لیے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اردو کے بعض مستند اہلِ قلم بھی الفِ لیلیٰ کے یکبارہ سے ملتے جلتے ہیں بات اتنی معمولی ہوگی کہ اسے نہ بھی کہیں تو ہرج نہیں۔ لکھیں گے اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ ہندو مارے ڈالتا ہے محبوبہ بھاگ گئی ہے، مرحوم تحریر وتقریر دونوں میں حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے، انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انھوں نے 'تحفوں' کا ایک سلسلہ بچوں کے لیے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دل نشیں انداز سے روشناس

کرایا ہے کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں علمی خدمت انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کیے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف 'اردو کی ذہنی تاریخ' شروع کی تھی کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

آمدنی بہت کم تھی، لیکن میں نے ان کو کبھی تنگ دستی کا شاکی نہ پایا، اجلا خرچ تھا۔ اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ ان سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے ان جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ ان کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجے کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق وسلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا نحیف فقرے زبان سے نہ نکالتے، گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے، لہجہ ہمیشہ نرم پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی مایوس، مضمحل یا مضطرب نہ پایا۔ ان کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا منغّص نہ ہوتا۔

الٰہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دکانوں کے ذیل میں لب سڑک لے لیا تھا۔ بیٹھک میں برّاق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے، الماریوں پر روغن، دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لیے اس جگہ کو چھوڑیے، لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ؟ مجھے تعجب ہے آس پاس کے دکان داروں نے آپ پر اب تک حملہ کیوں نہیں کر دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیو پیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجیے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے فرمایا۔ آپ نے بات ٹھیک کہی، مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظر یہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اسے فوراً خریدتے، دوستوں کو دکھاتے کوئی پسند کر لیتا تو اسی کو نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور نازک نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے، سینی دکھائی، پوچھا کہیے کیسی ہے۔ میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ ہے۔ 'فتوحات' میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گزر میں نہ ملا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، سنا نہیں۔ ع

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سینی اب تک میرے پاس ہے بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہوگئی ہے۔ کبھی نظر آ جاتی ہے تو اسے منگواتا ہوں اسی میں کھانا منگا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغؔر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں، بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو اگلے پچھلے زمانے کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خدوخال، رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسیں نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں۔

کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔ آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلویڈیر کے احاطے میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ مکان کے احاطے کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انھیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے پایا۔ اس میں کبھی فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے، بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرتا، سر پر سپید ٹوپی، ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹوں کے ڈبے، آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔ ہائے ان کا باغ باغ

ہوتا! زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادے یا اشارے تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہتے، جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمباکو فراہم رکھتا ہوں یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتا لاؤ۔ فرماتے یہ لیجیے میں نے ہارلکس مالٹیڈ مِلک شروع کر دیا ہے۔ یہ اووَلٹین کا گلاس ہے، یہ فورس ہے اور وہاں آپ نے کیونٹر کے مکھن کھائے ہیں، ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمایئے۔ غرض ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کہتے، ناشتا کر لیجیے وہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگِ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اسے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے، یہ مرغ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے۔ وہ زعفرانی پتّی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم... صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے ان کے مورث اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لیے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام 'آبروئے اودھ' ہے اسے ضرور چکھیے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جایئے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھیے گا دے دیجیے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطف بیان میرے لیے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انھیں کو بڑھا چڑھا کر کے اپنی طرف سے پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے ان کی اس حکمت عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب

کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لیے اور کچھ آپ لیتے جائیے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تھوڑے انھیں بھی بھیج دیجیے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آرہے تھے راستے میں چند گھنٹوں کے لیے الٰہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا۔ مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لیے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے۔ اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے کیوں کہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کردی تھی ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے۔ اس لیے بہت نحیف ہوگئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکر نے مانگا۔ لیکن بچہ کو گود سے نہ اُتارا۔ تھوڑی دیر بعد گود ہی میں لیے واپس ہوئے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے، حتیٰ کہ دودھ پینے کے لیے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں کے بعد پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا۔ بولے، آپ تو دیکھ چکے۔ بؔو (دوست کا بچہ) کتنا خوب صورت معصوم اور پیارا بچہ ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ بؔو سے مجھے کتنی اُلفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کرسکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ بھول گیا کہ بیمار نحیف ہوں، دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا کہ احمد بؔو سے زیادہ دل کش اور پیارا ہے بدحواسی تو دیکھیے میں نے بو کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ احمد نے بو کو زیر کردیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کردی۔ ایک بار خط آیا لکھا تھا۔ ''بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں دیکھیے کیا انجام ہو۔''

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی الٰہ آباد جاتا تو پتا لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتے تو رسم و راہ پیدا کرتے۔ مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے، ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے، مالک سے زیادہ خود

ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے، میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لیے ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ میں نے موقع نکال چپکے سے کہہ دیا اصغر صاحب فکر نہ کیجیے سب کے سب معمولی درجے کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی پر پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے، کہنے لگے کیا کہوں ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارے میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھیے۔ کم بخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا..... صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیوں کر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بد عادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آ جاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانے میں میرا جانا الہ آباد ہوا، صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہو جانا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقے سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہو گا۔ صبح چلے جایئے گا۔ میں ایسا بد بخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر بخ پڑ گئی۔ لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعے کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

دو ہی ایک روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلوڈیر کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا، سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے سان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو کی اُمنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں، بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارے میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لیے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔

فالج کے حملے کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا حکم تھا ورنہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا، اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو، لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گُر ہیں۔ زندہ رہنے میں ارادہ کو بڑا

دخل ہوتا ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مروں گا نہیں، بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجیے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید یک لخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغؔر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انھوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا۔ وہ کچھ ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش، قلندر، اربابِ علم و فکر، صاحبِ باطن، اربابِ دول، بکواسی و بے بہرہ طالب علم، کاروباری لوگ۔ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغؔر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

ان کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ جن کی قابلیت اور شخصیت مسلّم تھی وہ بھی بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہیے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں۔ مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ ان کو ہر حال میں عزیز رکھتے تھے، اور ان کی عزت کرتے تھے! ان کی ایک خاص طرح کی بڑائی تھی جس کا ہر کسی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا!

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں طرحی مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی، مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی۔ شعر پڑھنے شروع کیے تو مجمع میں انتشار سا پیدا ہوا، مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یک بہ یک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دیے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

ز لا تسخیر کردم ایں جہان مہر و انجم را
ز جوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا[1]

---

1 ترجمہ: میں نے 'لا' کے نتیجے میں مہر و انجم تک کو مسخر کر لیا ہے، اور میں نے جوش عبودیت سے اپنے پروردگار کو متوجہ کر لیا ہے۔

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژادِنو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں کے بالکل دل دادہ نہ تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہوگئی ہے، لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر وفکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو نژادِنو کی رہبری کر سکے!

جگر[1] صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے، مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کرلو آنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے۔ جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں، اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانے میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے۔ بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ وشہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں اپنی اس اُفتادِ طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کردیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالم ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کردی ہے۔ میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشک بار پایا اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز واطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض تنقید نگاروں نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے۔ لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا بھلا کہتے نہ سُنا۔ کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطِ کہ وہ مخلص اور

---

1. جگر مرادآبادی (1890-1960)

سمجھ دار ہوں۔ خدا کا مفسّر شاعر ہے اور شاعر کا مفسّر نقاد ہوتا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کیے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بے زار ہیں۔ اس لیے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے حالاں کہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ بُرے غزل گویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا اور کر سکتے ہیں۔

اکثر کہا کرتے میں غزل کو مدِ نظر رکھ کر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گہرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ کاش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے، مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں۔

ایک دفعہ عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اوّل درجے کے شعر تو رہنے دیا کیجیے بقیہ کو حذف کر دیا کیجیے۔ مرحوم پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا، رشید صاحب آپ ایسی باتیں کہتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اوّل ہی درجے کے شعر کہتا ہے سننے والے کے نزدیک وہ اوّل درجہ کا ہو یا دوم درجے کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ کچھ دن اور گزریں گے تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

سجاد انصاری[1] مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ ہم میں ایسے نقاد اور مفکّر کی بڑی ضرورت ہے کیوں کہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہار نو جوانوں پر زندگی تنگ ہو جائے گی۔

سر تیج بہادر[2] کا بڑا احترام کرتے تھے، کہتے تھے سر تیج کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اُتریں گے نہ حاضرین میں

1۔ سجاد انصاری مرحوم، محشرِ خیال کے مصنف۔

2۔ سر تیج بہادر سپرو (1872-1949)

سے کسی کو اس کی حدود سے گزرنے دیں گے۔ اردو ہندی کے سلسلے میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر تیج اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے بربنائے اردو الفت ہے، دونوں میں پرانے زمانے کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔ ایک بار ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو آئی تو فرمایا ہندوستان میں سر تیج ہی ایسے شخص ہیں جو جماعتی تعصب سے بلند ہیں۔ ہندوستان ایسے ملک کے لیے سر تیج ہی جیسے سردار کی ضرورت ہے۔

اونچی جماعت کے مختلف الخیال طلبا اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلموں سے ہوتی ہے، آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری علم (مسکرا کر) بزرگوں کے تصرف کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔

مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا محل نہیں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علاحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع کرتا ہوں تو اصغؔر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجیے تو اصغؔر صاحب اور اصغؔر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجیے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ جمال و کمال کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انھیں کی طرح محبت کرنے والا رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغؔر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغؔر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

یہاں ضمناً اقبالؔ کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ کیجیے۔ حاتم طائی کے کوہِ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے

اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغرؔ سے رجوع کیجیے وہ آپ کے ساتھ ہولیں گے اقبال آپ کو سرمو ادھر اُدھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغرؔ سے آپ خود علاحدہ نہ ہوں گے۔ اقبالؔ کے ہاں تصوراتِ جمیل اور دعوت دید۔ اقبالؔ حکومت کرتے ہیں، اصغرؔ رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے درو بست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ وشرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اصغرؔ کی زندگی ہی سلیقہ، شرافت اور صداقت میں گزری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خامکاری نہ ملے گی۔ آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقے سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رفعتیں اور ان کی ذمہ داریاں ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے۔ کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ ومعنی کیف وکم، رنگ وآہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خدو خال نظر آتا ہے۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن وتاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ صاحبِ ذوق بھی ہوں۔ شاعری نہیں، دنیا کا ہر شریف فن، ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے۔ اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اس مقصد ومعیار کا ہے جس کے اصغر واضع تھے نہ مقلد نہ مداح!

اصغرؔ صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں! اور اچھے شاعر کی یہ سب سے بڑی پہچان ہے۔

●●●

محمد ایوب عبّاسی

محمد ایوب عبّاسی کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکی کہ یہ کہاں کے باشندہ تھے اور کس سن میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ **مرتب**

o

تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی[1]

محمد ایوب عباسی مرحوم کے بارے میں کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں وہ اتنے اچھے تھے۔ اتنے ارزاں اور اتنے ناگزیر کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ۔ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگے چل کر۔ یوں نہیں دوں۔

موجود تھے تو ان کی مثال نعائم فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے کسی میں کہیں کوئی کمی آجائے تو پھر دیکھیے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی نا قابلِ التفات چیزیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوب ایسے ہی تھے۔ وہ دوستوں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم سب کو ان کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ ہم سے جدا ہو گئے تو ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ جو چیز اتنی ارزاں و عام معلوم و محسوس ہوتی تھی وہ کس نا قابلِ بیان حد تک اچھی، ضروری اور نایاب تھی۔

ہم سب کی زندگی میں مرحوم کے گھل مل جانے کا راز یہ تھا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی وہ کچھ عالم فاضل نہ تھے۔ دولت مند نہ تھے۔ ایسے نباع اور ذہین بھی نہ تھے۔

---

1. ہو تم زندوں کے زندہ، تم کو مردہ کون کہتا ہے
تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی   حالی

نہ انھیں توڑ جوڑ آتا تھا، نہ خوش پوشاک نہ خوش گفتار، نہ خوش باش، نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی کچھ زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی شاید ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور نہ اب ڈھونڈے سے بھی شاید کوئی ایسا ملے!

سیاہ فام چیچک رو، پستہ قد، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیر لے۔ برت لے تو غلام بن جائے۔ بتا نہیں سکتا کہ ایوب کی خوبیوں نے ان کی بدہیئتی کو کس درجہ دل کش بنا دیا تھا۔ فطرت اپنی چوک کی بسا اوقات کسی بے دریغ بخشی سے تلافی کرتی ہے۔ میری ہی نہیں میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی ان سے پرانی ملاقات چلی آتی تھی اور بتا نہیں سکتا کہ ہماری زندگی میں وہ کس قدر دخیل تھے اور ان کی جدائی نے ہم سب کو کیسا بے قرار و مایوس اور کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ میرے ہی دیار کے تھے۔ ایک بڑے قدیم شریف ذی علم اور صاحب خیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھرڈ ایر میں تھا جب وہ یہاں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے، بی۔اے، ایل۔ایل۔بی ہو کر پرودسٹ آفس میں ملازمت کر لی اور علی گڑھ ہی میں وہ بس گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیزوں وخُردوں کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ آئے تو ہم سب ایک ہو گئے اور سترہ اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کے اوروں سے بھی تھے اور سب جانتے ہیں کہ ان کی مفارقت کا جو الم مجھے ہے اس سے کم دوسروں کو نہیں ہے! خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس پیکر حقیر میں دل سوزی و خودسپاری کا کیسا بیکراں و بیش قیمت خزانہ ودیعت تھا!

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ خوشی کی بات ہو تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش۔ رنج و تردّد کا موقع ہو تو سب سے پہلے حاضر، بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر رہے ہیں۔ خوشی میں ہر طرح کے فقرے سر کر رہے ہیں اور اپنی مسرّت کا طرح طرح سے اظہار کر رہے ہیں۔ رنج و مایوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں، نہ تسکین کا نہ تقویت کا چپ چاپ بیٹھے سراپا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا محبت و ہمدردی سے بے اختیار ہو کر

منہ تک رہے ہیں۔ ذرا بھی احتمال ہوا کہ کسی کا آنا میرے لیے تکلیف دہ ہوگا تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سد باب کر دینا اور اس طرح کرنا کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو۔

میرا اور دوستوں کا یہ وتیرہ تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہوا اور ایوب سب کام کر دیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تر ذمے داری ہمیں پر ہوتی تھی، لیکن اس سے بذاتِ خود عہدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب ہی پر بگڑتے تھے اور بہانے نکال نکال کر انھیں سخت سست کہتے تھے وہ معمولی ملگجی شیروانی پہنے۔ ٹوٹا پھوٹا جوتا۔ میلا سا مفلر گلے میں لپیٹے جلدی جلدی چلے آ رہے ہیں۔ ہائے ان کا وہ چھوٹا سا قد۔ مشکل سے پانچ فٹ کا۔ کسی فکر یا مہم میں مبتلا، مفلر جلد جلد کھولتے لپیٹتے راستے میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سنتے، گرتے پڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی فاصلے ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آ رہے ہیں اس نے صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ آ پہنچے تو سخت سست کی بوچھار، ایوب صاحب ہیں کہ نادم ہیں ہنستے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلوٰتیں خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کر دیں گے نہ کریں تو جو چاہے کر ڈالیے۔ چلنے لگے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پانچ سات صلوٰتیں سنا دی گئیں اور اتنی ہی سن لی گئیں۔

ان کا گھر بارہ مہینے تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا۔ ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوتے ہیں۔ بالخصوص اعزّا اور دوستوں کے لڑکے۔ مجھے یقین ہے بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب کے گھر میں قیام کر کے، ان کے خرچ سے ان کی توجہ و محبت سے اعزّا و احباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہوگی، اتنا کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوا اور نہ شاید آئندہ ہو!

گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھلانا پلانا، سامان دینا، ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا، اس کے بعد آفس کا کام، دوستوں کا کام، غرض اس شخص کی مشغولیتیں دیکھ کر ہم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے ہے اور اس کے حواس کیوں کر بجا ہیں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ مرحوم نے شاید ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو۔ یا دو روز مسلسل اپنے گھر سوئے ہوں جہاں مل گیا وہیں کھا لیا۔ ہو سکا تو وہیں رات بھر کے لیے

پڑ رہے چارپائی بستر میسّر آئے یا نہ آئے، آرام کرسی پر سو رہے۔ میز پر لیٹ گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش ہی پر ایک طرف سکڑ سکڑا کر رات بسر کر دی۔ مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے۔ اتنا کم کھانے والا شاید ہی کہیں ملے، کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے پر ہی اکتفا کر لیتے۔

سگریٹ اور حقہ کے شائق تھے۔ بیڑی، سگریٹ، سگار، حقہ جو مل جائے ان کے لیے کفایت کرتا تھا۔ دوستوں میں کوئی بیمار پڑا اور یہ آموجود ہوئے، رات دن کا مسلسل قیام، پاؤں دبا رہے ہیں، سر میں تیل ڈال رہے ہیں، دوا لا رہے ہیں، کھانا تیار کر رہے ہیں اور بقول ہم پورب والوں کے اس کا گوموت کر رہے ہیں۔ بیماری میں آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے رہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت سست ہی کلمات ملے! ایوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں۔ لیکن ان کو جو لوگ صلوٰتیں سناتے تھے وہ سب ان کے گرویدۂ احسان ہو کر! شعرا اور بے فکروں نے لطف و تشکّر کے جتنے الفاظ وضع کیے تھے، وہ سب اس سخت سست کے سامنے ہیچ تھے جو ہم سب ایوب کو کہتے اور ان سے سنتے تھے!

ایک دفعہ بیوی بچے مکان چلے گئے، میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی یک بہ یک چلا گیا۔ برسات کا موسم تھا میں دن بھر ادھر اُدھر مارا پھرا تھا۔ کوئی 6-5 بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینے سے لگی ہوئی ہے۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ اتنے میں ایوب صاحب آنکھ ملتے، راکھ میں لت پت باورچی خانہ سے ڈانٹ کر بولے، جی **گلچھرّے** اڑائیے۔ لکڑیاں بھیگی ہوئی ہیں چولہا ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا (کچھ سخت وسست الفاظ کے بعد) آخر ڈائننگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتظام کر لیا ہوتا۔ بولے، جی شام کے 6-5 بجے آپ کے لیے ڈائننگ ہال سے باقر خانیاں نہ آجاتیں۔ بچیاں کیا کرتیں، بعد میں معلوم ہوا کہ آفس سے براہِ راست شہر گئے۔ وہاں سے آم اور پکانے کے لیے کچھ ساگ ترکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا بھئی ایوب خدا کے لیے کچھ تو ٹھکانے کی چیز کھا پی لیا کرو ورنہ آنکھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے جناب نے بھی تو منجن ہی کھا کھا کر عینک کے نمبر بڑھائے ہیں!

کھانا پینا ہو چکا تو آم نکالے۔ میرے سامنے تو قلمی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے آم لیے۔ میں نے کہا یہ کیا یہ کیوں نہیں لیتے، کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہوں مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں۔ میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھائیے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قوی حرکت کروگے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں۔ کھانا پینا ختم ہوا تو اپنی کھرّی چارپائی بچیوں کی چارپائی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے اور ان سے انھیں کی دلچسپی کی ادھر اُدھر کی باتیں کرنی شروع کردیں۔ جب وہ سوگئیں تو سر سے پاؤں تک کمل تان کر خاموش ہوگئے۔ میں نے دیکھا تو کہا۔ ایوب تم اس گھر سے نکلو۔ اس سڑی گرمی میں کملی اوڑھ کر برآمدے میں سوؤ گے تو ظاہر ہے تمام رات میں صحن کے چبوترے پر رقص کروں گا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ پہنچایا جاؤں اور تم قبرستان۔ نہ مانے اور اسی طرح سوئے ان کا یہی معمول تھا!

صبح جیتے جاگتے اُٹھ بیٹھے اور دن کے دھندے میں لگ گئے۔ علی گڑھ میں طلبا کے داخلے کا زمانہ بڑے ہنگامے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگانِ قوم جو سال بھر ہم سب کو گالی اور اخبارات کو پیام دیتے رہتے ہیں نئے سشن کے شروع ہوتے ہی ہم کو قرونِ اولیٰ کا مسلمان قرار دے دیتے ہیں۔ پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے، اس کے بعد تار، اس کے بعد تانگے۔ 'خلاصہ فریاد' ایک ہی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے حکومت ہندوؤں کی۔ لڑکا کہاں جائے! لڑکے کو داخل کرائیے، جتنی مراعات ہوسکیں دلوائیے۔ بقیہ خود پوری کیجیے۔ چال چلن اور خواندگی کی نگرانی کیجیے، پاس کرائیے، نوکری دلوائیے اور ہم دونوں کو اس وقت تک مہمان رکھیے جب تک صاحب زادے علی گڑھ کے ماحول سے آشنا اور خود ان سے متنفر نہ ہوجائیں! حج اور تیرتھ کے بارے میں یہ سنا جاتا ہے کہ ملکوں کے مختلف حلقے مطوّف اور پنڈتوں نے بانٹ لیے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان و مال کے ذمے دار! خدائی فوج دار ہیں۔ جان کے کم، مال کے زیادہ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا جی چاہے جس مطوّف یا پنڈے کے ہاں ٹھہر جائے، اور اس کی جان مال و ناموس کا لاگو بن جائے۔ یہ زمانہ عین برسات کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے برسات میں اپنی شکم پروری اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو اور کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ ہو تو معدہ کب تک ساتھ دے گا

والدین[1] میں سے کوئی پیچش میں مبتلا ہے، کوئی اسہال میں، کسی کو یونانی علاج راس نہیں آتا، کسی کو ڈاکٹر دوا سے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا ناشتا سب کو موافق آتا ہے۔ حکیم صاحب کے ہاں لے جائیے یا انھیں بلائیے تو بتائیں گے موجودہ تکلیف اور علاج کرائیں گے، دیرینہ ناگفتہ بہ شکایات کا!

اس زمانے میں اور ایسے مواقع پر ایوب مرحوم کام آتے تھے۔ کسی کے لیے چارپائی کی ضرورت ہے، تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سارٹیفکٹ نہیں ہے۔ اس کی سبیل نکال رہے ہیں کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لیے دوڑ دھوپ کررہے ہیں۔ کسی کے پاس روپے نہیں ہیں تو ادائیگی 'بالاقساط' کی کوشش کررہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اس کا بندوبست کررہے ہیں۔ کوئی اسٹریچی ہال کے محشرستان میں کھو یا گیا ہے تو اسے راستہ پر لگا رہے ہیں۔ 'والدین' یا سرپرستوں کے لیے حقّہ یا پرانے اردو ناولوں کی ضرورت ہے تو اسے فراہم کررہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کنایہ سے، حیلہ حوالہ سے خوشامد کرکے رو پیٹ کر جھنجھلا کر آمادۂ قتل یا خودکشی ہو کر مہمان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے ٹھکانے پہنچنے کا مرحلہ طے کررہے ہیں۔ یہ سب اپنے گھر نہیں میرے گھر، آپ کے گھر، دوستوں کے گھر، اور خدا جانے کہاں کہاں یہی ڈراما ہو رہا ہے۔ مرحوم ہیں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظرانداز کرکے دوستوں اور دوسروں کی مشکلات میں شریک ہیں۔ میزبان مہمانوں سے شریف آدمی تو کچھ کہتا

---

1. یہ لفظ لغوی معنوں میں نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یادگار ہے۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھانے سنبھالنے علی گڑھ آیا تھا، اس زمانے میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ چنانچہ جس لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی لیکن چالیس سال سے زائد عمر کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا فوراً کہہ پڑتا 'تھوالوالدین' یہاں تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا نوکر بھی آئے تو لوگ کہتے فلاں صاحب کے ساتھ ایک والدین بھی ہے! ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں موزوں سمجھا جاتا ہے مثلاً میں فلاں جگہ جارہا تھا۔ راستے میں ایک والدین ملے۔ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں، بلکہ کوئی بزرگ نما صورت کا اجنبی جو کسی طالب علم سے وابستہ نظر آئے 'والدین' ہے۔

نہیں لیکن غم وغصہ نکالنے کا کوئی موقع تو ہو۔ اس کے لیے مرحوم تھے انھیں بلایا گیا، پہنچے تو کچھ متردّد ہوئے کچھ نادم اور کبھی تالی بجا کر قہقہہ لگانے لگے، پھر بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے کوئی اور آیا کسی اور کو دست آئے۔ رشید صاحب واللہ خوب ہوا بڑا مزہ آ رہا ہے اور لکھیے مزاحیہ [1] مضمون۔''

ایوب مرحوم کو برج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی زندگی میں اور کچھ ان ہی کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے بازی نہیں لگائی جاتی تھی، اس لیے کہ ہم میں ایک سے ایک اناڑی کھیلنے والا تھا۔ جتنا کھیلتے اتنا ہی کھیل میں تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ جیتے یا ہارے سخت سست اتنا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اس زمانے میں ہریجن کا لفظ اخبار میں آیا تھا۔ بے تکلف صحبتوں میں اب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا۔ مرحوم بھی کچھ کم نہ تھے، ہم سب کو ایسے ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوتے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش پھینک دیے کہ بغیر ہریجن کے کوئی لطف نہیں۔ رات زیادہ گزر چکی ہے، ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کہ ان کو آج مرحوم لکھنا پڑتا ہے، کی موٹر پر ہم سب ان کی تلاش میں نکلے، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے۔ اپنے گھر چوں کہ رہتے ہی نہ تھے، اس لیے وہاں ہم سب کبھی نہ گئے دوست کے ہاں بھی رونق محفل وہی تھے، اس لیے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار ہوتے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے بڑی خوشامد سے یا جھگڑ کر انھیں لائے اور محفل پھر سے جمی۔

تاش کے اتنے شائق تھے، لیکن براہِ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلیے تاش کھیلا جائے۔ آئے اور بیٹھ گئے، ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں، میں سمجھتا تھا کہ مطلب کیا ہے۔ اس

---

1. ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک اجنبی بزرگ ملنے آئے مشکل سے قومی کچھ علمی اور تھوڑے بہت سزایافتہ معلوم ہوتے تھے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرفِ مطلب زبان پر لائے، یہ بھی ہو گیا تو اور باتیں شروع کر دیں۔ بالآخر رخصت ہونے لگے تو بولے: رشید صاحب آپ جیسا مزاحیہ مضمون لکھنے والا کوئی اور نہیں ایوب صاحب اُٹھ کر کمرے میں بھاگے بڑی دیر میں برآمد ہوئے ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے اور لکھیے مزاحیہ مضمون!!

لیے عمداً غیر متعلق باتیں چھیڑتا رہا، یہ برابر وار خالی دیتے رہے۔ آخر کار کہا: ''ایوب تم کو تو تاش کا ہیضہ ہے۔'' نہایت سنجیدگی سے بولے: ''جی ہاں، آپ لوگوں کو تو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔''

میں تیار ہوا، دونوں ڈاکٹر اصغر (مرحوم) کے ہاں پہنچے۔ ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی للکارے ہریجن دروازہ کے اندر قدم نہ رکھنا، مرحوم بولے: بس بس ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھیے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم باہر نکالنے کی ہمت نہیں ہوتی اور بھبکی یہ! دیکھیے (اتنے میں ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں بھی آگئے) معززینِ شہر تشریف لائے ہیں۔ اصغر صاحب بولے: ''لعنت ہے معززینِ شہر پر اور آپ پر بھی۔'' اسی سانس میں نوکر کو آواز دی۔ ''میز بچھاؤ، پان دان لے چلو۔'' ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے: ''کیوں جی باورچی تلاش کیا؟'' مرحوم بولے: ''بھیجا تو تھا، آپ کو ملا نہیں؟'' بولے: ''لعنت ہے، باورچی بھیجا تھا یا بھنگی! اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے ہو۔'' مرحوم نے نہایت سنجیدہ ہو کر جواب دیا! ''ڈاکٹر صاحب! کیا کروں، آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی والے نہیں چھوڑتے، کیا کیا جائے۔''

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب و نادر پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزّت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے میں اسے لطف آتا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی۔ ایک طرح کی پُر افتخار اور اطمینان بخش تسکین۔ جیسے یہ احساس کہ ہم میں بھلائی کرنے یا بلند ہونے کا جذبہ یا استعداد ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ اپنے کُتّے سے کرتے ہیں۔ یعنی اسے سمجھتے کتا ہی ہیں، لیکن چومتے چمکارتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت بالعموم بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں۔ لیکن ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انھیں انسان سمجھیں، لیکن خود ان کے جذبۂ فرعونیت کی تسکین ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طور پر اس کی زندگی میں امید و فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر ہم چشموں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کی محبت یا عزّت ایوب سے کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وہ تھے جن کے لیے ہر شخص اپنی عزّت یا شہرت کو داؤں پر لگا دینے کے لیے بے تامل تیار ہو سکتا تھا اور ہو جاتا تھا!

ایوب سے محبت نہ کیجیے یا ان کی عزّت نہ کیجیے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفانہ جذبات یا احساسِ ذمے داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مدّنظر رکھیے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی نہیں گزری کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و تن دہی سے کرتے تھے۔ پرووسٹ کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب ان کا سابقہ طلبا، اساتذہ، بیرا، باورچی، نائی، چپراسی، بھنگی، بھشتی، سب ہی سے براہِ راست پڑتا تھا۔ طلبا کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے، اور اسی اعتبار سے ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس لیے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹرائک ہے، لڑکے بے قابو ہیں، لیکن ایوب صاحب کا جادو برابر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانے میں ان کا طرزِ عمل لڑکوں سے وہی ہوتا جو میدانِ جنگ میں صلیبِ احمر کا ہوتا ہے۔

ادنیٰ درجے کے ملازمین سے ان کا سلوک مساوات اور ہمدردی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں رفیق سمجھتے تھے۔ ایک دن دیکھا کہ بھشتیوں کی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہیں اور جیسا کہ ایسی کانفرنس میں ہوتا ہے! ہر بہشتی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سگریٹ پیتے اور بار بار پائجامہ اونچا کرتے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے۔ کبھی خود جامے سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے ہیں ادھر سے نکلا تو کچھ سٹ پٹائے اور شرمائے، میں نے کہا: ''واللہ ایوب آج تو پہچاننا دشوار ہو گیا۔ جا کر مولانا[1] سے کہوں گا کہ نوح کا پسر معلوم نہیں کہاں کہاں بیٹھتے بیٹھتے بھشتیوں میں بیٹھنے لگا ہے!'' ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے ہنسے کہنے لگے: ''ہاتھ جوڑتا ہوں، ذرا بیٹھ جایئے واللہ بڑا مزہ آئے گا۔'' میں نے کہا: ''جی نہیں، آپ کو کیا، آج یہ ہے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے۔'' فرمایا: ''ہرج کیا، پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں۔'' میں چلا آیا، ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت تک پہنچ گئے۔

---

[1] مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی مرحوم ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایوب صاحب کے عزیز قریب اور بزرگ۔

ایوب صاحب یونیورسٹی کے جھگڑوں سے ہمیشہ علاحدہ رہتے اور حتی المقدور اپنے دوستوں کو بھی علاحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انھوں نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی کبھی فرصت ہوئی اور یقین ہوا کہ میں گھبراؤں گا نہیں تو وہ اپنے خاندانی قضیوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں ان کی الجھنوں کو ہمدردی اور توجہ سے سنتا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا اور ان کے دکھ درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے، سب کے سب ایوب کی شرافت اور کشادہ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انھیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے ایک دن بہت اُداس تھے، آئے تو بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بہل جائے معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک بہ یک آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا تو بڑے تامل کے بعد واقعہ سنایا۔ وہی عزیزوں کی دنائت اور شقاوت کا قصہ۔ میں نے کہا، ایوب صاحب آپ بددل نہ ہوں، آپ کا کوئی قصور نہیں، قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ خوش حال اور نیک نام ہیں۔ ہمارے آپ کے اعزّا کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اُٹھالی گئی ہے، اغیار کو تو یہ مسرور اور بافراغت دیکھ کر خوش ہوں گے اور فخر کریں گے، لیکن اپنوں کو کھاتا پیتا یا ہنستا بولتا دیکھ کر غم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے، یہ اپنے نکمے پن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا حربہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کھاتے کماتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان تمام نعمتوں پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے جو بہ صورت دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت، نام وری اور نیک نامی سے رہ رہا ہے، اس نے کتنی محنت کی ہے اور اذیت اُٹھائی ہے، اور یہ کچھ ہمارے بیش تر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اس انفرادی کمزوری اور کمینگی نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی۔ سرمایہ دار مزدور کی جنگ اپنی جگہ پر حق بجانب ہے، اور جہاں تک اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے اس کے معقول ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس اسکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے درپے بیش تر وہی لوگ ہیں جو نکمّے، برخود غلط اور کنبہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا مطالعہ کیجیے آپ کو بیش تر یہی معلوم ہوگا کہ معقول نظام یا تحریک

نامعقولوں کے ہاتھ میں تھی۔ آپ ہی سوچیے کیا مزدور اور کاریگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابلِ عزّت و لحاظ نہیں ہے۔ دنیا کی نجات دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں ہے بلکہ محنت اور قابلیت کے صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آج کل بازی گروں کے اصولِ تقسیم کا بالکل قائل نہیں جس سے دولت ان کے ہاتھ میں جائے اور 'مساوی' میرے ہاتھ میں رہ جائے!

آخر میں کہا: ''ایوب صاحب! اپنا کام کیے جایئے، دولت و شہرت کا حساب عزیزوں کو نہیں اللہ تعالیٰ کو دیا جائے گا۔ البتہ آپ اس کے لیے تیار رہیے کہ جتنا اللہ آپ کو کارگزار، فارغ البال، نیک نام اور بھلا مانس بنائے گا، اتنا ہی شیطنت آپ کی دشمن بنتی جائے گی۔

مرحوم اپنے جن بزرگوں یا دوستوں کو عزیز رکھتے تھے انھیں میرے ہاں ضرور لاتے اور مجھ سے ملا کر بہت خوش ہوتے۔ پھر بڑا اصرار کرتے کہ میں ان سے ان کے گھر یا جائے قیام پر جا کر مل آؤں۔ یہی نہیں بلکہ جس کسی کو تکلیف یا مصیبت میں دیکھتے یا اس کے ہاں خوشی کی کوئی بات ہوتی تو خبر دیتے کہ میں وہاں ہو آؤں۔ ایسا کر دیتا تو ان پر مسرّت و شکرگزاری کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ ظاہر ہے اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ میری اس بھلمنساہٹ کی لوگ قدر کریں۔ لیکن یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی، واقعہ یہ ہے کہ جس شخص یا جس بات سے انھیں تقویت یا مسرّت پہنچتی تھی اس میں وہ مجھے بھی شریک کر لینا چاہتے تھے دوسرے یہ کہ میں نے ان کے انتخاب کو پسند کر لیا تو اس پر استناد کی مہر لگ گئی۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے جس کو مجھ سے ملایا اس کے ساتھ بہت بڑا سلوک یہ کیا کہ مجھ ایسے (بزعمِ خود) معقول آدمی سے اسے متعارف کیا۔ بظاہر یہ باتیں دور از کار اور خود میرے برخود غلط ہونے پر دال ہیں اور اپنے منہ سے ان کا تذکرہ کرنا بڑی بھدّی بات ہے لیکن میں مرحوم کی بعض تحت الشعوری صلاحیتوں سے واقف ہوں۔ ان کا مقصد وہی تھا جو بیان کیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سُنیے۔ ایک دن بڑے اصرار سے کہنے لگے کہ رشید صاحب پتلون پہنا کیجیے۔ دریافت کیا آخر کیوں کہنے لگے ہرج ہی کیا ہے۔ میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ آخر اس فرمائش کی تک کیا ہے کہنے لگے، جی چاہنے میں تک کو کیا دخل، میرے ان کے ایک بے تکلف دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ ردّ و قدح سنی تو معاملہ کی نوعیت

دریافت کرنے لگے۔ میں نے بتایا تو اُچھل پڑے کہنے لگے، رشید صاحب قیامت تک نہ پہنیے گا۔ اس نے ایک پتلون سلوائی ہے۔ اسے پہننا چاہتا ہے۔ آپ سے ڈرتا ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آیئے گا۔ دیکھوں تو کس طرح پہنتا ہے۔

یونیورسٹی کے کرم سے ایک قطعۂ زمین مکان بنانے کے لیے مجھے پٹے پر مل گیا تھا۔ ایوب صاحب کے جائے قیام سے یہ زمین متصل تھی۔ برسوں افتادہ پڑی رہی۔ مرحوم کا مسلسل اصرار رہا کہ رشید صاحب مکان بنوا لیجیے ہر شخص بنوا رہا ہے۔ آخر آپ کیوں نہ بنوائیں، تھوڑا سا حصہ چھوڑ دیجیے گا۔ اس میں میں ایک جھونپڑا ڈال لوں گا، مویشی پالوں گا، مرغیاں رکھوں گا اور کھیتی کیا کروں گا۔ میں نے کہا۔ میں مکان نہ بنواؤں گا۔ ساری زمین آپ کی ہے جو چاہے کیجیے، مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ سے کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے جی نہیں آپ مکان بنوایئے میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ یہاں آپ کا مکان ہو، آپ تمام روپیہ خرافات میں اٹھاتے ہیں، مکان ہوگا تو ایک چیز ہو جائے گی۔ آپ قریب ہو جائیں گے وسیع عالی شان مکان، میں سمجھوں گا میرا ہی مکان ہے، جب چاہوں گا چلا جایا کروں گا۔ ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔

مکان بنا لیکن ایوب کا ارمان پورا نہ ہوا۔ اب وہ اور ان کا ارمان دونوں یونیورسٹی کے گورستان میں آسودۂ راحت ہیں۔ یہاں پہنچ کر بے اختیار اپنا چھوٹا چچازاد بھائی جواں مرگ رفیق یاد آگیا۔ جس نے بارہ تیرہ سال تک مرتے دم تک مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر اپنی روشن و بہادرانہ زندگی کی وہ تمام متاع نثار کردی جس کی قیمت اس دنیا میں آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ آہ کیا نثار ہونا اور کس کس طرح نثار ہونا! جس نے تمام عمر یہ خیال دل میں نہ آنے دیا کہ اپنی استعداد سے اپنے آپ کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنا چاہیے۔ بلکہ اسی کا قائل رہنا اور اسی پر مرمٹا کہ اس کی ہر نعمت اور اس کی ہر متاع میرے اور میرے بیوی بچوں ہی کو راحت و فائدہ پہنچانے کے لیے تھی۔

بہادر اور باوفا رفیق بھی مکان کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ اپنا مکان دیکھ کر مسرور اور مطمئن ضرور ہوتا ہوں، لیکن جب رفیق اور ایوب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہو کر ناممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انھیں اسی مکان میں گلے لگاتا ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھتا اور فخر کرتا کہ میں نے بھی کچھ کام کیا!

سردی کا زور اور دوستوں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ ایوب مرحوم نے کہا۔ سردی لگ رہی ہے کسی نے توجہ نہ کی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لیکن کسی قدر بے قرار ہو کر کہا۔ بڑی سردی ہے رشید صاحب میں چلا۔ ڈاکٹر عباد نے کہا۔ نہ ٹھکانے سے کھاتے ہو نہ شریفوں کی طرح رہتے ہو سردی کیوں نہ لگے۔ یہ کہہ کر اندر سے اپنا بھاری گرم اوورکوٹ لائے اور مرحوم کو اچھی طرح اوڑھا دیا۔ چائے منگائی اور پلائی اس کے بعد بھی مرحوم نے کہا۔ ''رشید صاحب میں چلا۔'' میں ان کے لہجے سے اور ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونکا۔ کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب انھیں اوڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آئے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کیے گئے لیکن بخار اور کمزوری بڑھتی گئی۔ دوستوں کی تشویش بڑھی مایوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا تھا۔ سب نے یہی کہا کہ وقت آ پہنچا تھا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر یونیورسٹی کے طلبا اور عمائدین کا مجمع تھا لیکن ان سے قریب اور ان ہی میں ملا جلا ایک ہجوم تھا۔ بھنگی، بہشتی، چپراسی، نائی، دھوبی، بیرے، باورچی، خانساماں، خوانچہ والے اور ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے خاموش مایوس سر جھکائے! اور وہ یہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازے پر (جب کہ وہ اس جہاں سے گزرنے والا ہو) میں نے گذشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مرحوم کو سپردِ خاک کیا گیا۔ مولانا ابوبکر صاحب نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فرمایا:

''بھائیو! ایوب اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے اگر ان سے تم کو کوئی
تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔''

گریہ سب کے گلو گیر ہوا۔ کسی نے روکا اور کسی سے نہ رُکا!

ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک دردناک صدا بلند ہوئی۔

''کیا یہاں کوئی ایسا بھی موجود ہے جس پر ایوب کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو۔'' اس آواز کو سنا کسی نے نہیں، محسوس سب نے کیا!

●●●

ڈاکٹر سر محمد اقبال

(1877-1938)

سر محمد اقبال، شاعر مشرق 1877 میں سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا۔ سیال کوٹ سے ایف۔ اے کیا اور لاہور گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے امتیاز کے ساتھ پاس کیے، ان کا مضمون 'فلسفہ' تھا۔ پروفیسر آرنلڈ ان کے استاد تھے۔ 1905 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمرج میں داخلہ لیا۔ بعدہ میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے 1908 میں ہندوستان واپس آئے۔ چند سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر رہے۔

علامہ اقبال کو علی گڑھ اور سرسید سے عشق تھا۔ وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اردو و فارسی، فلسفہ کے ممتحن بھی رہے۔ وہ کئی بار علی گڑھ آئے، ہر بار ان کا پُر جوش استقبال ہوا۔ علی گڑھ کے طلبا کو وہ قوم کا بہترین سرمایہ تصور کرتے تھے۔ علی گڑھ طلبا کے نام اور سرسید کی موت پر ان کا مرثیہ ان کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

رشید صاحب اقبال کے پرستاروں میں سے تھے۔ لاہور جا کر ان سے ملاقات کر چکے تھے۔ اقبال رشید صاحب کی ادبی صلاحیتوں کے معترف تھے، رشید صاحب کی

ریڈرشپ کے لیے انھوں نے پُر زور سفارش کی تھی ۔ علامہ کے بچوں جاوید اور بانو کی نگہ داشت کے لیے رشید صاحب نے علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون جو آپا ڈورس کہلاتی تھیں بھیجا تھا۔ جنہوں نے ان دونوں کی بڑی دردمندی اور خلوص کے ساتھ تمام عمر خدمت کی اس کا اعتراف اقبال نے رشید صاحب کے شکریہ کے ساتھ کیا ہے۔

رشید صاحب نے علامہ کے نام پر اپنے سب سے بڑے بیٹے کا نام اقبال رشید (پ۔1924) رکھا۔ نیز اقبال پر کئی تحقیقی مضامین تحریر کیے جو کتابی صورت میں دانائے راز، اقبال شخصیت اور شاعری، کے عنوان سے اقبال اکادمی لاہور نے 1976 میں شائع کیے ہیں۔

علامہ اقبال کا انتقال 1938 میں ہوا۔

O

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے لیے، بہت تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے ورنہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی، ''آسیائے گردش ایام'' ایک آن کے لیے رُک سی گئی لیکن فوراً ہی پھر رواں ہوگئی۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ رواں دواں نظر آنے لگی۔ مکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کو جی ہوا، ہر چیز ہر شخص اجنبی سا معلوم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر دیے۔ طفلی کا زمانہ یاد آیا، جب اقبال کے اشعار چھٹ پنے کی دوستی کی طرح مزے دار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور قبال کے بارے میں یہ تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں ان ہی میں رہتے بستے ہیں، اقبال کی مورت وہی ہوگی جو میرے اپنے تصورات میں بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی، جادوگروں جیسی کچھ عجیب سی!

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ اب بھی جب کہ ادراک وشعور ایک حد تک مکمل ہو چکا ہے، اچھے شعر کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ اچھا شعر ذہن میں آیا نہیں کہ تھوڑی

دیر کے لیے معلوم نہیں کیا چیز، تصورات کو کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ وہی افسانہ وافسوں، وہی روشنی وتاریکی، لذت واذیت، خوف وامید جو بچپن میں پیدا ہوتے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں لیے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

1925 میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسّس میں دلچسپ معلوم ہوتی تھیں اب تجزیہ وتجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ پڑھانے کو پُر لطف بنانے کا فرض عائد ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر ہی نہیں بلکہ فکر وتجربہ کی صحت صداقت پر منحصر معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں محسوس ہوا کہ خود شاعر کو دیکھا جائے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا تذبذب سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتا ہے یا دوسروں کی تشفی بھی۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، لاہور مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا، کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے برآمد ہوئے، گٹھا ہوا جسم، چوڑی چکلی ہڈیاں مردانہ انداز آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھرّیاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت ومحبت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے رہے، بھاری بھرکم لہجے میں بولے، آپ ہیں جی، صدیقی صاحب میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور حلیہ دیکھ کر متحیّر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجہ سے کسی قدر متعجب، اتنے میں نوکر کو آواز دی اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ ق کا تلفظ سن کر پھر پریشان سا ہوا۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا لیکن ذہن میں معلوم نہیں، کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوری سے مستثنیٰ ہوں گے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا، مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابل بیان مروّت و مرحمت تھی کہ سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ، بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا گو منتظر نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے کمرہ میں آ بیٹھے۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے، آواز بھاری تھی اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بڑھتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے۔ مرحوم کی باتیں سنیے، بشرطے کہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتیں۔ وہ صرف الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسا کرتے تھے۔ بلکہ وہ باتیں کہیں دور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی اور بحث اتنی واضح اور جامع ہوتی کہ وضاحت و جامعیت بجائے صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر گرمی و روشنی کے آثار نظر آنے لگتے۔

شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوجوان شاعر آ گئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے، ان کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی، ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خاموشی کسی قدر بے زاری میں تبدیل ہونے لگی۔ کچھ دیر بیٹھے رہے دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے، صحبت ختم ہوگئی۔ صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے، اندر سے دیر میں برآمد ہوئے چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ تھوڑی دیر تک حقّہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے، اس کے بعد فرمایا، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے۔ اب طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ ہر ایک سے پرسشِ حال کرتے وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے یا بُرا۔

رسمی باتیں تو وہ کرنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دُکھ سُکھ سنتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص ان کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بے تکلفی سے اپنی سناتا۔

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا۔ اس لیے اطمینان اور شفقت کے ساتھ باتیں شروع کیں۔ اس زمانے میں مرحوم کے نظریہ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لیے ان پر خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مرحوم نے بڑے عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی اور خود اعتمادی کے ساتھ جوان کی سیرت کا بڑا گراں قدر پہلو تھا اظہار خیال کرنا شروع کیا اس وقت جو چیز سب سے عجیب اور اچھی معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو مرحوم کس خوبی سے واضح کر دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے مسئلہ میں پیچیدگی تھی ہی نہیں۔ عالمانہ و مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ بہت پیچیدگیوں اور غیر متوقع مسائل کا حل آسانی سے سامنے آجاتا ہے۔ اسی صحبت میں عورتوں کا درجہ، فوق البشر، بعثت نبوی کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے۔ میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا ذکر بار بار کروں گا وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں، غلطی ہے۔ مرحوم کی فکر و نظر کا کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دوران گفتگو میں ان پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہوگئی ہوں۔

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے، مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا۔ فرمایا ان مسائل پر بعض مستند علما سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں، کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سودمند ہوگا عرض کیا کہ اس کوچہ سے نابلد ہوں اس کے علاوہ کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیش تر علما علم دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اس

لیے ان پر ہمارے علمائے کرام صحیح رائے قائم کرنے سے معذور ہیں تو کچھ تعجب نہیں۔ جب تک مسئلہ کی اہمیت و مصلحت نہ معلوم ہو اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جاسکتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارے میں مرحوم نے بڑے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔

مرحوم کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا۔ ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی صاف گوئی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ فلسفی، مفکّر اور متدین ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبر کو دخل ہوتا۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون شناس اور اچھی وکالت کرنے والے کا واضح ربط ہوتا۔

ان کا شاعری کا امتیازی پہلو بھی یہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبّر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبّر حکیم یا فلسفی کی بڑائی اور کامیابی کی دلیل ہے۔ اسی طور پر جذبات کا احتساب کرنا اور اس کو مناسب و موزوں اسالیب میں ڈھالنا شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری، شاعری کی معراج ہے۔ انھوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور اعتقاد دوش بدوش کارفرما ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ حکیم اور شاعر (البتہ کہیں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں) ایک دوسرے میں ممزوج یا ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اقبال نے ملکات فطری کو بشری ریاضتوں اور ماورائی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت

بخشی۔شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکّر کا طبعاً مفکر ہونا کوئی بہت بڑی بات نہیں۔نعمت تو وہ توفیق ہے جوفطری استعداد کو بشری نعمت بناتی ہے اور غالباً یہی توفیق الٰہی انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ انسانیت کو فوز عظیم پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک دن دوستوں کی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر ؎

صد بادِ صبا ایں جا بے سلسلہ می رقصد
این است حریف اے دل تا باد یہ پیمائی[1]

پر گفتگو ہونے لگی۔اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر ایک نے موشگافیاں کیں۔بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جائے، چنانچہ مرحوم سے استصواب رائے کیا گیا۔فوراً ہی جواب لکھ بھیجا۔ ہر رائے پر محاکمہ کیا اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول مدّ نظر رکھ کر پیش کرے۔اس لیے شعر کے مطالب جدا گانہ بھی ہو سکتے ہیں البتہ متضاد نہ ہوں، آگے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی واردات کا پورے طور پر خود استبصار نہیں کر سکتا۔ایسی حالت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو اور جہاں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنا اطمینان کر لے۔آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان رموز سے اپنا لے جو اس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں شاعرانہ رموز منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، بلکہ کچھ اور ہوتے ہیں۔

1930 میں مَیں بہت بیمار تھا۔ڈاکٹر صاحب ان ہی دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ایک دن صبح غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا اس روز خاص طور پر بڑی تکلیف تھی مشکل سے باہر آیا۔ بڑے افسردہ لہجے میں رک رک کر عرض کیا۔ڈاکٹر صاحب کاش

---

1. یعنی صحرا میں یہ سیکڑوں تیز ہوا کے بگولے تیرے حریف ہیں اور تیرے حوصلہ بڑھانے کے لیے ہیں تاکہ تو ہمت نہ ہار بیٹھے اور صحرا کو پار کر لے۔

اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ ہائے ان کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا، نہیں جی صدیقی صاحب کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا، اچھے ہو جاؤ گے، پھر لاہور آنا، مایوس کیوں ہوتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے، کاش کسی وقت حاضر خدمت ہو کر ان کے لیے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں مرحوم بہت بڑے آدمی تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا۔ وہ خاصان بارگاہ سے تھے۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ گو معجزے کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کون سی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے زائل نہیں کر سکتے!

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا توسّل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا۔ اسی تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید[1] راس مسعود مرحوم کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہو گئی تھی، دور آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی میعاد ہے تو اسی ایک نام کے صلے میں بھوپال کی نجاتِ اخروی متیقن ہے۔ اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی

1۔ سید راس مسعود (1889-1931) سر سید کے پوتے اور سید محمود کے بیٹے۔

منزلتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شیکسپیئر کو چھوڑنا گوارا نہ کرے گی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا گوارا نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی اسی طرح سر راس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا جو ہر صبح آدھ گھنٹہ تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے، یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچے پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارمغانِ حجاز میں دخترانِ ملّت کو یوں مخاطب کیا ہے۔

زشامِ ما بروں آور سحر را   بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو ی دانی کہ سوزِ قرآتِ تو   دگرگوں کرد تقدیر عمر را! [1]

مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلامِ پاک سننے کے لیے فوراً آمادہ کرے۔ مرحوم خود بھی خیال رکھتے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں۔ ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود کہاں ہیں۔ علی بخش نے کسی قدر آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا، قرآن کیا سنیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول توڑنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے، فرمایا صبر، علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے!

اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی ماورائی بصیرت کا ترجمان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور

1۔ قرآن کی تلاوت کے اثر نے حضرت عمر کی تقدیر بدل ڈالی تھی۔ اشارہ ہے اس روایت کی طرف کہ حضرت عمرؓ پر قرآن شریف کی آیۂ کریمہ سن کر دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ایمان لے آئے۔

بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں منفرد و ممتاز ہو جاتے ہیں اور ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو در کنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے۔

یہاں ایک واقعہ مولانا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کروں گا۔ مرحوم تحریک خلافت کے سلسلے میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے سوال کیا، اور کیوں جناب، راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، فرمایا کیوں نہیں، پوچھا معاف فرمایئے گا کیا دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کون سی کتابیں ہیں۔ مرحوم نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی رکھ لی ہیں۔ حاضرین ان کتابوں کا نام سننے کے لیے سراپا اشتیاق بن گئے، مرحوم نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے اور دوسرا، دیوانِ داغ!

اسے ایک لطیفہ ہی کیوں نہ سمجھ لیا جائے تب بھی اس سے مولانا کی پُر تجمل شخصیت کی دل رُبائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز و پرداخت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لیڈی مسعود کے پہلے بچے کی شیر خوارگی میں وفات پا جانے پر رنجور ماں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

در چمن بود و لیکن نتواں گفت کہ بود
آہ! ازاں غنچہ کہ بادِ سحر او را نہ کشود![1]

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو ڈاکٹر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے ڈاکٹر صاحب بڑے مسرور تھے اور اس کے دیکھنے کے بے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دیے بغیر بھوپال آ گئیں۔ اتفاق سے سر راس مسعود اور سر اقبال دونوں یکجا تھے۔ سر راس نے فرطِ اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو آغوش[2] میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی، نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

---

1. ''افسوس وہ ایسا غنچہ تھا جو باغ ٹہنی میں کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔''

2. نادرہ (مرحومہ) کی شادی رشید صاحب کے صاحب زادے احسان رشید (ف۔2002) سے ہوئی تھی۔

اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر غور کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی نفسیاتی پرداخت کا اہتمام اپنے زمانے میں اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور آغوشِ مادر سے سب سے پہلے براہِ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے لڑکے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہ داشت کے لیے ایک شریف جرمن خاتون[1] کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی، بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ سہہ چکی تھیں۔ مرحوم کے دریافت کرنے پر میں نے ہی تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ تک خط کتابت ہوتی رہی، میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے۔ ان کو معاوضہ کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے بہتر یہ ہوگا کہ امتحاناً انھیں دو ایک ہفتہ کے لیے اپنے ہاں بلالیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون جن کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے آپا جان کہا کرتے تھے، لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آتے، ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت، قابلیت، دیانت و امانت، محبت و مروّت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و بھروسا ہوا کہ رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں اور سارے گھر بار کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جرمن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات میں تذکرہ کیا۔

---

1 ان خاتون کا نام ڈورالنڈ ویر تھا۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد بھی وہ جاوید اور بانو کی نگہداشت اور خدمت کرتی رہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کے صلہ میں انعام سے بھی نوازا تھا۔ جاوید اقبال نے اپنی خودنوشت میں اُن خاتون کا محنت اور عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ شاید 1980 کے اوائل میں ان کا جرمنی میں انتقال ہوا۔

مرحوم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے جاوید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانا تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز، کھل کر ملنے یا بات کرنے میں بھی تکلف کرتا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس طرح جاری و ساری تھا۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بانو! مشکل سے 7-6 سال کی عمر ہوگی، کیسی تندرست، چنچل، ذہین، خوب صورت، بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات بانو حسبِ معمول میری چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی، باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی الجھن میں مبتلا ہو جاتی، پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان، ابا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمک دار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے!!

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانۂ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہوگئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی ہم جولی اور اس کا کھلونا سب ہی کچھ تھے۔ اس سلسلے میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرے میں بانو تک کا آنا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا، میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کے سینے پر بیٹھی ہوئی بے تکلف باتیں کیے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اُٹھی، سر اقبال کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی۔ میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا۔ سر اقبال بول بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لیے جوں کا توں رہنے دیا جائے اس کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان سا طاری

تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبۂ مسرّت سے ایک لمحہ کے لیے اور روشن کیے ہوئے رکھنا چاہتے تھے!

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ پہلے پہل پہنچی تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب پورے یورپین کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ پھر مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے ہی لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف بنیائن اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے۔ جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرے ہی میں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسا کرنے کا عجیب مادہ تھا۔ میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنّی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا، شاہی مسجد کے بائیں سمت اس مردِ قلندر کو آسودۂ خاک پایا۔ یقین نہ آیا کہ یہ اس اقبال کی آرام گاہ ہے۔

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ بادشاہی مسجد کی پُر وقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ بے اختیار دل یہ چاہنے لگا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیے جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نمایاں نہ ہو۔

مرحوم زندہ تھے تو اطمینان رہتا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر ان سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ

کرے گی اور دل کے ولولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انھیں سلجھادیں گے۔ کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لیے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کرلوں گا۔

وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تصورات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اُٹھ جانے سے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رہبر ملے گا جو ان کی تشکیل وتزئین میں مدد دے گا۔

مرحوم اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں از خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے میں ان کی اس بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر لطف یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہِ راست نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ ان راستوں پر مجاہدانہ و مجتہدانہ انداز سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دلچسپ ہو جاتا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ ہوں میرے لیے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو پیمبری کیا ہے؟ اور یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے؟

(مطبوعہ: جوہر۔ اقبال نمبر 1938، رسالہ جامعہ، اکتوبر 1941)

(مشمولہ: کتاب 'پیام اقبال، مرتبہ: م۔ ندیم علیگ ولطیف الزماں خاں، ناشر: میک برن ایجنسی (پرائیویٹ) لمٹیڈ، کراچی 1997)

اقبال شخصیت اور شاعری

●●●

مولانا احسن مارہروی

(1876-1940)

مولانا احسن مارہروی سید شاہ علی احسن مارہرہ کے مشہور بزرگ شاہ برکت اللہ کے خاندان سے تھے۔ 1876 میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا، لیکن مولانا کا رجحان شعروشاعری اور تحقیق تھا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ خانقاہ کی سجادہ نشینی قبول کرنے کے بجائے داغؔ کے شاگرد ہوگئے۔ 1897 میں حیدرآباد چلے گئے۔ 1903 میں واپس آئے اور لاہور میں لالہ سری رام جو خمخانۂ جاوید مرتب کررہے تھے، ان کے شریک کار رہے۔

داغؔ کی یاد میں ایک رسالہ 'فصیح الملک' جاری کیا۔ 1932 میں علی گڑھ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ سیکشن میں استاد مقرر ہوئے۔ 1935 میں شعبۂ اردو میں لکچرر ہوئے اور 1938 تک ایک لائق استاد کے فرائض انجام دے کر سبک دوش ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مارہرہ میں قیام پذیر ہوگئے۔ علاج کے لیے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل تھے جہاں 3/اگست 1940 کو ان کا انتقال ہوا۔ تدفین مارہرہ میں ہوئی۔

تصانیف: احسن الکلام، فصیح اللغات، منثورات، اردو الفاظ و محاورات وغیرہ۔

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گونالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں
(میرؔ)

مولانا سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو اُن سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر اُن کا نام بڑی عزّت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردوداں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارۂ خاص میں اُن کے فیصلے اکثر و بیش تر بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے۔

قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کی ان لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیش رووٴں سے ان تک پہنچی تھی۔ بایں ہمہ وہ اردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بے گانہ تھے نہ بے زار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے۔ خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مروّج و مقبول ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں

داد دینے میں ذرا تامّل نہ کرتے۔ اردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا، مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات وتصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو 'ترقی پذیر' اور ترقی پسند قرار دینے میں تامّل نہ کرنا چاہیے۔ ترقی پذیر یا ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سنے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھرکم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دل دادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آرا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں، بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے، مطلب برآوری نہ ہوتی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی اُدھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہوگئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔

اس بارۂ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنکو میں بھی پائی، جو کچھ دنوں کے لیے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہوکر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم تبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے، ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم، لمباقد، عینک لگائے ہوئے، اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لیے ضرور لائبریری پہنچتے۔ پروفیسر کرنکو کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے ہوئے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے ہوئے پاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (Model de Luxe) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی!!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر مرحوم ہی کے سپرد کیے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے۔ کہتے تھے استاد داغؔ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تانیث یا محل استعمال کے بارے میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے۔ اس سے داغؔ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اردو میں آتے اُن پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار پایا۔

اردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا[1]۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ

---

1 مولانا احسن مارہروی کا کتابوں کا ذخیرہ اب مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کا حصہ ہے اور 'احسن کلکشن' کے نام سے موسوم ہے۔ مرتب!

کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے ان میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارے میں کہیں تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبہ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداس پور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بستہ ساتھ تھا۔ اردو شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ مرتب فرمارہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نو وارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے مطلقاً التفات نہ کیا اس سے نہ تو نو وارد کی دل جمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اُکتا کر مسودہ کو بالکل یوں ہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہہ کر مسودہ واپس کر دیا، اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رُخ کیے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کی دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا، کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رُخی سے ہم سب بھی خفیف بنے۔ میں نے عرض کیا! مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چائے مفت میں پلوا دیں! بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نو وارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہوگئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔ اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا۔

ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی راز داں سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے۔ عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہوگیا ہے اور بقول غالب ''سینۂ بسمل سے پر افشاں'' نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنی اَن سنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگتا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھر کم جسم کو اس طرح تولایا، اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علاحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور تکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ ادھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں ان کے ارادہ سے واقف ہوگیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی اُن سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انھوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بدتمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے۔ چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اُٹھ کر بھاگا۔ مولانا بہ آں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی (Rear

(Guard Action) ''ریر گارڈ ایکشن''۔* (جنگ پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہی جواب دیا، جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے۔ میں دروازہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا تھا!

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمتہ سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے، اور اس خاندان کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جا کر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے پاجامے، سر پر بال باریک ترشے ہوئے، پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیص پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ

یہ قُل اعوذیت تھی، قُل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہد پن کے مقابلہ میں قُل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔ مسلمان مردوں کا یہ وتیرہ نہ ہونا چاہیے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے، پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی دینا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاست کا ثمرہ تھی۔ انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بندنہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی خوش دلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے اور تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے، نہیں کرسکتے تھے۔ اس کا ان کو دلی رنج تھا، لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی ان پر فقرے بھی چست کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا۔ بھائی دیکھو

تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ مرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو ہنستے کیوں ہو!

شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری تصنیف و تالیف، تحقیق و تدوین میں گزاری۔ اپنے استاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے، لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی، شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغؔ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا۔ لیکن فنِ شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جارہے ہیں۔ صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے۔ کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس بوتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جارہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی اہم چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے اس لیے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحۂ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کی پیرایہ میں قلم بند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبہ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں، ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جارہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہوگئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں۔

ایک دن شعروشاعری پر گفتگو ہورہی تھی۔حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دے دیا جائے اوران سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کرغزل مکمل کردیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کرآپے سے باہر ہوگئے۔آواز میں لکنت تھی اس لیے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو ان کالب ولہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہوجاتا تھا۔ململ کا ڈھیلی آستین کا کُرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔فوراً اُٹھ بیٹھے،آستین چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔میاں ہوش میں آؤ۔ یہ کیا بک گئے۔شاعرکویوں پہچانتے ہیں؟اصغر صاحب کوتمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے جس کوتم شاعر سمجھتے ہو،اس مسخرے کومیرے پاس لاؤاوراس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دواور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑتوڑ جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو۔پھر دیکھیں کون کیسے شعرکہتا ہے!

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا۔مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعرا کے صدر ہیں۔اگر مجوزہ آداب آئندہ سے مشاعروں میں نافذکردیے جائیں تو کیا ہو۔مرحوم قہقہہ مارکرکرسی پر لیٹ گئے،کہنے لگے۔ بڑااچھاہو،کم بخت گویوں سے نجات ہوجائے!

مسوری جانے والوں کومعلوم ہے کہ وہاں "فصل" میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھنچ کرآتے ہیں،اورصید وصیاد،دانہ ودوام،تمناوتماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔سامنے کی صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں یکہ بانوں میں بہت مقبول اورکچھ اس طرح کا تھا۔

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے
اُدھر حوروں کا مجمع ہے اِدھر پریوں کی محفل ہے

مولانا کی باری آئی بھلے مانسوں کے سیدھے سادھے لب ولہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں — بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائیں معاف نوجوانانِ سخن — بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی، جس کے اس شعر پر جو صف اوّل کو مدنظر رکھ کر پڑھا گیا۔ مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہو کر دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

بٹتی ہے امیروں میں تری حسن کی دولت
یہ مصرف خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انہاک سے اس کا اہتمام کرتے تھے، اور شعرا و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گزرتے ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔ چنانچہ رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمے سُنیے:

صاحب: (سخت برہم ہو کر اور مع کرسی میری طرف رخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں: (سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہو، جناب؟

صاحب: (تقریباً دانت پیس کر) بے شک۔ مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی، ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

میں: جناب والا! مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی، ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیے۔

صاحب: (بدستور لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں؟

میں: شعر پڑھنے۔

صاحب: شعر!

میں: جناب والا!

صاحب: اپنے شعر؟

میں: مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب: لیکن یہ ہوا کیا۔

میں: ہوتا کچھ نہیں عالی جاہ لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب: تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں: جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرمالیں۔ بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔

صاحب: بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر زہر خند فرما کر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرّت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ صاحب یک لخت جھجھکے، لیکن فوراً ہی سروقد ہو کر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سروقد کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہوگئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں

طلبا بھی آ گئے ۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے ۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے ۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی، فرمایا۔ رشید صاحب طلبا پڑھنے نہیں آتے ، وقت گزاری اور تفریح تفنن کے لیے آتے ہیں ۔ یہ دنیا میں جو چاہے کرلیں، علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے، لیکن کیا کیجیے گا ۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے، دنیا کا یہی رنگ ہے ۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں ۔ حفظ مراتب اُٹھ چکا ہے ۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے ۔ کڑھیے نہیں، لڑکوں کو معاف کر دیجیے ۔ ان کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں ۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا، بولے ۔ جی نہیں ! میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا ۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجیے ۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا ۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا فرض کیجیے، یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں ۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجیے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجیے ۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کرتے ہیں ۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انّا اللّٰہ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے ۔

چائے سے عشق تھا ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا ۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے ۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے ۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے ۔ لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو در کنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ۔ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے، لیکن اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے ۔ اس وضع داری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا ۔

مرحوم مقررہ میعادِ عمر ختم کر کے ملازمت سے سبک دوش ہوئے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو اُن سے بہت کم عمر والوں کے لیے مشکل تھا ۔ اُن کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے ۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا ۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں

بزرگ، کیسے کیسے زمانے، کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر 30/اگست 1940 کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہنچ گئی۔

مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی کہ مولانا احسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہوکر بولے اور کیوں حضور، سنتا ہوں 'خنداں' [1] شائع ہوگئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لیے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجیے، پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض کا یہ کرب، کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب، اللہ اکبر! میں مبہوت ہوگیا اور ایک لمحہ کے لیے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پنہائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہوگئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا -لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے، رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجیے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

(مطبوعہ 'علی گڑھ میگزین، ستمبر 1941)

●●●

---

1. 'خنداں' رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

سید محفوظ علی بدایونی

(1870-1943)

سید محفوظ علی 1870 میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر کاظم علی تھا۔ بریلی سے انٹرنس اور ایف۔اے پاس کرنے کے بعد 1895 میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔ ان کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق، شیخ عبداللہ اور ظفر علی خاں تھے۔ علی برادران سے ان کے خصوصی روابط تھے۔

بی۔اے کرنے کے بعد سید محمود کی سفارش پر ریاست خیر پور (سند) میں اسسٹنٹ جج کے عہدہ پر تقرر رہا۔ 1901 میں استعفیٰ دے کر بدایوں واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں رہے، 1904 میں افریقہ کے سومالی لینڈ میں جج کے عہدہ پر رہے۔ 1907 میں بمبئی آ گئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ تجارت میں شرکت کی، نقصان اُٹھایا۔ 1914 میں محمد علی نے کلکتہ سے کامریڈ نکالا تو آپ اس سے وابستہ ہو گئے۔ ہمدرد، میں تجاہل عارفانہ کے نام سے مضامین لکھے۔ بیوی کے انتقال کے بعد آپ بدایوں واپس آ گئے، اور زمین داری کے کام کی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ناموں سے مضامین لکھتے رہے۔ 1943 میں ان کا انتقال ہوا۔ تصانیف: مضامین میر محفوظ علی، مرتبہ: عبدالحق۔ طنزیات و مقالات، مرتبہ: محمد محی الدین بدایونی۔

سید محفوظ علی صاحب، بی۔ اے علیگ کا 20 اکتوبر 1943 کو انتقال ہو گیا۔

گدڑی کا یہ لعل بدایوں کی مردم خیز زمین سے اُٹھا اور کم و بیش 73 سال کی خزاں و بہار لیے ہوئے لالہ و گل میں نمایاں ہونے کے لیے بدایوں ہی کی خاک میں پنہاں ہو گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ تقریر جو اُن کی زندگی پر اور ان کی زندگی میں ہونے والی تھی آج 'خطبۂ میت' بن جائے گی۔ جو لوگ مرحوم سے واقف نہیں وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ پروانہ کی یہ خاک کس رونق محفل کی یادگار تھی۔

علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور مولانا شوکت علی اور محمد علی کے ساتھیوں میں تھے۔ بڑے بھائی سے چھوٹے اور چھوٹے سے بڑے۔ حیدر آباد میں مولوی عزیز مرزا، مولانا شبلی اور مولانا شرر مرحومین کی صحبتیں دیکھ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ ایسی ہستیوں کا گہوارہ تھا جن کے نام اور کام کی شہرت اب بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں گونج رہی ہے۔ سید صاحب کا علی برادران سے اوائل طالب علمی ہی سے نہایت گہرا اور مخلصانہ تعلق رہا جو بریلی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس سے شروع ہو کر علی گڑھ کالج پر ختم ہوا۔ محمد علی، سید محفوظ علی سے چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ سید صاحب ان کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے۔

سید صاحب نے عربی، فارسی میں تکمیل کرنے کے بعد انگریزی کی طرف رجوع کیا۔ انگریزی کے مدارج 1888 تک علی برادران کے ساتھ بریلی میں طے کیے، اور 1893 میں علی گڑھ آئے اور 1895 میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سید محمود مرحوم کی وساطت سے دربار خیر پور پہنچے۔ 1896 سے سلسلۂ ملازمت شروع ہوا۔ 1901 میں سندھ کو خیر باد کہہ کر بمبئی

آ گئے وہاں سے جلد ہی ترجمہ کی خدمت پر مامور ہو کر حیدر آباد پہنچے۔ 1904 میں علی گڑھ کے مشہور پرنسپل سر ماریسن[1] کے ایما سے شمالی لینڈ (افریقہ) میں ججی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہاں سید صاحب نے اپنے فرائض جس دلیری اور خوش اسلوبی سے ادا کیے، اس کا تذکرہ اس موقع پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ 1907 کے بعد ہندوستان آئے اور آخر وقت تک وطن میں رہے یا محمد علی مرحوم کے ساتھ دہلی میں ہمدرد کا کام سنبھالتے رہے۔

محمد علی کو سید صاحب سے جو شغف تھا، وہ شروع سے آخر تک قائم رہا۔ کامریڈ اور ہمدرد کا خواب دونوں نے مل کر دیکھا تھا اور اس کی تعبیر و تشکیل میں دونوں شریک رہے۔ ایک صحرا کو نکل گیا، دوسرا بدایوں کے گلی کوچوں میں رُسوا نہ ہوا۔ محمد علی کے مزاج میں جو بے پایاں شدت و حرارت تھی جس نے ان کو ہمیشہ نعل در آتش رکھا۔ جس کی وجہ سے کوئی شخص ان کے ساتھ یکسوئی اور استقلال کے ساتھ کام نہ کر سکتا تھا اور جس تپش و طوفان کے بالآخر وہ نذر ہو گئے اس نے سید محفوظ علی کو کبھی متزلزل نہ کیا۔ سید محفوظ علی نے اس مہر نیم روز سے روشنی اور حرارت بھی اکتساب نہ کی۔ محفوظ علی اپنے نظام شمسی خود تھے۔

محمد علی کامریڈ اور ہمدرد کا دفتر کلکتہ سے اور سید محفوظ علی کو بدایوں سے دتی لائے۔ اس زمانے میں ہمدرد میں مضامین کا ایک سلسلہ 'تجاہل عارفانہ' کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوا جس کے مصنف سید صاحب تھے۔ یہ مضامین اس زمانے میں اخباری طنز و ظرافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیے گئے۔ محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لیے لوگ جس طرح کامریڈ کے لیے بے تاب رہتے تھے، تجاہل عارفانہ کے مطالعہ اور پذیرائی کے لیے ہمدرد کے منتظر و مشتاق رہتے تھے۔ 'تجاہل عارفانہ' میں اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی مسائل پر بڑی لطیف تنقید ہوتی تھی۔ تجاہلِ عارفانہ کی تقلید میں مدتوں مضامین لکھے گئے اور سید صاحب کا یہ تصرف عرصہ تک ہمارے انشا پردازوں کے ذہن و قلم پر کارفرما رہا۔

سید محفوظ علی میں وہ تمام صفات نہ بھی موجود ہوتیں جن کا یہاں احاطہ کرنا نہایت مشکل ہے تو میرے نزدیک ان کی یہ صفت سب سے اونچی تھی کہ انھوں نے اس زمانے میں بھی

1. سر تھیوڈر ماریسن (1863-1936)

شہرت نہ چاہی، جب شہرت بڑی مشکل سے حاصل ہوتی تھی، حالاں کہ وہ بڑی آسانی سے مشہور ہو سکتے تھے، اور اب جب کہ شہرت ماری ماری پھرتی ہے وہ تقریباً گم نام ہو گئے تھے۔ میر صاحب کے بیش تر مضامین فرضی ناموں سے شائع ہوئے۔ کبھی مُلّا بودھا موی کے نام سے، کبھی آق منقال کے نام سے، یہ بھی ایک سبب ہے کہ میر صاحب کو عام طور پر لوگوں نے بہت کم جانا پہچانا۔ اکثر ہر بڑی شخصیت اور ہر بڑے کارنامے کے پیچھے عام نظروں سے اوجھل بظاہر ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات لیکن دراصل نہایت پختہ کار ہستی ہوتی ہے اور اس کو تقویت پہنچاتی رہتی ہے۔ یہ ہستی جدال وقتال کے میدان اور عیش طرب کی محفل دونوں سے علاحدہ رہتی ہے۔ لیکن میدان و محفل دونوں میں اس کے ذہن وفکر کی کارفرمائی رہتی ہے۔ ایک مدت تک محمد علی پر سید محفوظ علی کا اسی قسم کا اثر اور تسلط رہا۔ سید صاحب کے درجہ کو متعین کرنے کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ محمد علی، سید محفوظ علی صاحب سے بے جھجک ہونے کی بھی کبھی ہمت نہ کر سکے۔ جو لوگ مولانا محمد علی کی بت شکنی اور خود شکنی سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سید کا وہ کون سا سکوت ساحل تھا جو سمندر کی سطوت سے باخبر بھی تھا اور بے پروا بھی۔

علی گڑھ پر سے ترکِ موالات کا سیلاب گزر چکا تھا۔ موجودہ مسلم یونیورسٹی سے قریب ہی ایک وسیع بنگلہ میں مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا تھا۔ ایک بڑے ادارے کو وجود میں لانے کے لیے وہ بھی ایک بڑے ادارے کے مقابلے میں محمد علی ایسی بے پناہ ہستی کم سے کم مدت میں جو کچھ کر سکتی تھی یا نہ کر سکتی تھی وہ سب موجود تھا۔ ہر طرف ہر قسم کے آدمی اور ہر طرح کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن میں بھی جا نکلا، کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ کیا ہنگامہ بپا تھا، جب اس تمام ہنگامہ کا مرکز محمد علی کو قرار دے دیا جائے وہ بیک وقت طلبا، علما، والدین، باورچی، ٹھیکہ دار، قلی، تھانہ دار، اخبار کے نامہ نگار، کوے کتے، فقیر، خوانچہ والے سے مصروف کارزار تھے۔ اس رست خیز میں ایک طرف چاندنی کے فرش پر، سکوت ومتانت کے ساتھ ایک بزرگ دوزانو بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ چھوٹا سا قد، مختصر حجم کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی سفید گول مختصر سی داڑھی، آنکھوں میں بچوں کی معصومیت، جوانوں کی تازگی اور صاحب کرامت کی تب وتاب لیکن بحیثیت مجموعی مہر ووفا کی نرمی ونزاکت، میں ٹھٹک سا گیا اردگرد کا سارا ہنگامہ دل سے محو ہو گیا۔ یہ میر محفوظ علی تھے!

میر صاحب کی خلقی شگفتگی و ملاطفت سارے ہنگامے پر غالب تھی۔ پریس کا کام بھی جاری تھا۔کاپی اور پروف چلے آرہے تھے، کچھ لوگ ترجمہ کا کام کررہے تھے وہ بار بار میر صاحب سے رجوع کرتے تھے، بعض قلمی نسخوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف تھے وہ میر صاحب کے پاس آتے جاتے تھے۔ میر صاحب ہر ایک کو برجستہ اور بڑے لطف سے مطمئن کردیتے تھے، اس درمیان میں کبھی کبھی محمد علی بھی گرجتے برستے نکل آتے تھے۔ میر صاحب کے پاس پہنچتے ہی ''یہ شمشیر وسناں اوّل، طاؤس و رُباب آخر'' میں تبدیل ہوجاتا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے۔شعلہ و شبنم کا یہ قرآن بھی دیدنی ہوتا!

میر صاحب کی عربی فارسی کی قابلیت کا لوہا خود ان کے استاد طالب علمی کے زمانے میں مانتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور اور ہر ماخذ پر مرحوم کو پورا عبور تھا،محمد علی بھی تاریخ کے بڑے جید طالب علم تھے لیکن سید صاحب کی علمی معلومات اور مورّخانہ تعبیروں پر بڑا بھروسا کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں سید محفوظ علی کو بڑا درک تھا۔اس جہت میں بھی محمد علی ان کے قائل تھے،محمد علی کا 'بحـثنا' بھی ایک حادثہ ہوتا تھا اس پر سید صاحب کا مسکرانا اور چپکے سے کوئی لگتی ہوئی بات کہہ دینا اور اس طور پر کہنا کہ محمد علی کا جو ہاتھ گرز بن کر اُٹھا تھا وہ سید صاحب کے گلے میں حمائل ہوجاتا۔آخر عمر میں سید صاحب نے تفسیر کلام پاک کا ایک مخصوص اور مختصر حلقہ اپنے ہی گھر پر اپنے احباب اور عقیدت مندوں کے لیے قائم کرلیا تھا۔ جو لوگ کلام پاک کی تفسیر و تعبیر کی نزاکتوں کو جانتے ہیں وہی اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ سید صاحب نے یہ کام کس بل بوتے پر شروع کیا تھا،اور اس سے ان کی فضائل علمی اور واردات قلبی پر کیا اور کیسی روشنی پڑتی ہے۔

برمحل اشعار پڑھنے اور پیش کرنے کا جو کمال میں نے محمد علی اور ابوالکلام آزاد میں پایا وہ کہیں اور نہ ملا، معمولی سا شعر بھی یہ کسی موقع پر پیش کردیا کرتے ہیں تو موقع کی مناسبت اور استعمال کی برجستگی سے خود شعر کا پایہ بلند ہوجاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی بل کی موافقت و مخالفت میں دو گروہ بن گئے تھے۔مخالفین میں ابوالکلام اور مولانا محمد علی تھے۔ کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ مولانا محمد علی بل کی موافق جماعت میں شریک ہوگئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعے پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان یہ شعر تھا۔

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است

با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد[1]

محمد علی نے مضمون دیکھا تو تلملا اُٹھے، برق و باد بن کر سید محفوظ علی کے پاس پہنچے۔ دروازہ اس طور پر کھٹکھٹایا جیسے مکان کی چھت گرا اور بنیادیں ہلا دیں گے۔ سید صاحب کو پا کر بولے ابوالکلام کے شعر کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ۔ سید صاحب نے پوچھا کیا شعر ہے اور کس موقع پر پیش کیا گیا ہے۔ محمد علی نے جلدی جلدی شعر سنایا اور مضمون کی نوعیت بتائی۔ اس دوران میں سید صاحب کو جھنجھوڑتے بھی رہے سید صاحب نے برجستہ کہا، لکھو۔

برکفے جامِ شریعت برکفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن[2]

محمد علی جھومنے لگے۔ بولے معرکہ سر ہو گیا۔ اس موقع پر خود محمد علی نے اعتراف کیا کہ اس بارے میں سید کا دماغ کچھ کم رسا نہیں ہے!

پہلی جنگ عظیم کے سلسلے میں محمد علی کا ایک معرکتہ الآرا مضمون (Choice of the Truks) شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جا رہا تھا، بحث یہ تھی کہ Choice کا اردو مترادف اس موقع پر کیا ہوگا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہتا تھا لیکن اطمینان کسی کو نہ ہوتا تھا۔ بالآخر یہ مسئلہ سید صاحب سے رجوع کیا گیا سید صاحب نے موقع محل دریافت کر کے فوراً بتایا 'چارۂ کار' ظاہر ہے اس موقع پر چارۂ کار سے بہتر کوئی اور لفظ ہو نہیں سکتا۔

سید صاحب ہمیشہ اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے اور تقریباً ہمیشہ ہر موضوع کو ناتمام چھوڑتے یہ کسی معتقد کا کمال ہی ہوتا کہ وہ سید صاحب سے مکمل مضمون حاصل کر لیتا۔ ناتمام مضامین کا ایک مینا بازاران کے صندوق میں مقفل ہے۔ دیکھئے کب اور کس کو یہ توفیق ہوتی

1 سرخوش کا شعر ہے۔ میرا محبوب ہر شخص کے ساتھ اس کے مزاج کے مطابق برتاؤ کرتا ہے۔ میرے ساتھ تو شراب پی اور زاہد کے ساتھ اس نے نماز ادا کی۔ یعنی وہ موقع پرست ہے۔

2 سعدیؔ کا شعر ہے۔ ''ایک ہاتھ میں شریعت کا جام اور دوسرے ہاتھ میں عشق کی سندان سے کھیلنا ہوس ناک کے بس کا نہیں ہے''

ہے کہ وہ ان کو مرتب اور مدوّن کرتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اردو میں طنز وظرافت کو پھکڑ اور فحاشی سے نکال کر خاصا کی چیز بنانے میں سید مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ سید صاحب کا دماغ حاضر اور ذہن رسا تھا۔ وہ زندگی کے ان پہلوؤں کو فوراً تاڑ لیتے تھے جن پر طنز وظرافت کا وار ہو سکتا تھا۔

سید صاحب کی ظرافت میں ایک طرح کی Buoyancy ملتی ہے۔ بعضوں کی ظرافت 'ٹھوس اور ٹھس' جیسے پانی میں سیسے کا ٹکڑا گر کر تہ نشیں ہو جائے، بعضوں کی سیال ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر پھیل کر فضا میں غائب ہو گئی۔ سید کی ظرافت کی مثال کنول کے پھول سے دے سکتے ہیں پانی کا اُتار چڑھاؤ کیسا ہی ہو پھول برابر شگفتہ جھومتا اور تیرتا رہے گا۔ ان کی ظرافت میں ان کی شخصیت اُجاگر رہتی ہے وہ الفاظ سے بھی کھیلنے کے شائق تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین میں 'رعایت ومناسبات' کا اچھا خاصا عنصر ملتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اب قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ لیکن وہ ان رعایات کی خاطر کم استعمال کرتے تھے۔ وہ ان میں 'موقع و ماحول' کا ایسا رنگ بھر دیتے کہ ان میں واقعیت جھلکنے لگتی تھی۔ ایسی واقعیت جو آرٹ میں جان پیدا کر دیتی ہے۔

'شیخ سماء اللہ کی صاحب زادیاں[1] کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سید کے ذہن کی دراکی اور قلم کی شنگرف کاری کس کس طرح سے اور کن کن نازک اور دقیق لمحوں میں بروے کار آئی ہے۔ سید کا دور اودھ پنچ اور رعایات ومناسبات لفظی کے فوراً بعد کا دور ہے اس لیے سید اور ان کے پیش رووں کی صنائی وصنعت گری میں ربط ملتا ہے۔ البتہ یہ سید کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے پیش رووں کے زوال پذیر ٹیکنک کو ترقی دے کر اس طور سے ختم کر دیا کہ اس میں مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ چھوڑی لیکن سید کو جو چیز ایک طور پر ترکے میں ملی تھی اس کو انھوں نے ادبی وفنی نقطۂ عروج تک پہنچا کر بس نہیں کیا بلکہ 'رعایات ومناسبات' سے گزر کر مبصّرانہ ظرافت کی تخلیق کی اور ظرافت کے تانے بانے میں طنز کی ایسی دھوپ چھاؤں پیدا کر دی کہ فن کے ترقی کے امکانات بہت زیادہ وسیع ہو گئے۔ 'صاحب دین' میں اس مبصّرانہ ظرافت کے بڑے اچھے نمونے ملیں گے۔

---

1 سید محفوظ علی بدایونی کا ایک مضمون

مرحوم کو عورتوں کی صحیح و شستہ زبان لکھنے کا بڑا ملکہ تھا اور وہ اسی زبان میں بڑے پتے کی باتیں بڑے لطف سے بیان کر جاتے تھے۔ عورتوں کی زبان لکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا اس زبان میں پتے کی باتوں کو خوبی اور خوب صورتی سے سمونا مشکل ہے۔ شیخ سماء اللہ کی صاحب زادیوں پر جو مضمون سید صاحب نے لکھا ہے وہ ان کے گہرے مطالعہ اور صناعانہ چابک دستی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ سارے مضمون میں ایک طرح کی ڈرامائیت جاری و ساری ملتی ہے۔ اس طرح کے مواد کو اس انداز سے ڈھالنا اور یہ آب و رنگ پیدا کرنا ہمارے اردو ادب میں مدتوں یاد رہے گا۔ جو لوگ صحیح اور اچھی اردو لکھنے کے شائق ہوں ان کو ہماری عورتوں کی زبان کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، عورتوں کی زبان میں وہ عناصر و عوامل ملتے ہیں جو ہمارے تمدن میں کبھی قابلِ فخر سمجھے جاتے تھے۔

کئی سال ہوئے بدایوں جانے اور سید صاحب کا مہمان بننے کا اتفاق ہوا۔ شاید دو روز ٹھہرنا پڑا تھا۔ مہمان نوازی کے بارے میں تو مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کسی مسلمان کا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ یہ تو اس کی عرب سرشت میں داخل ہے مجھے جو چیز سید صاحب کی نہایت درجہ دل کش معلوم ہوئی وہ ان کی ذہانت و شگفتگی تھی جس میں محبت اور نفاست کا عجیب امتزاج ملتا تھا۔ ایک مصور یا نقاش کسی مثالی تصویر کے بنانے میں جس امید، حوصلہ، سلیقہ اور شغف کو برسرِ کار لاتا ہے، سید صاحب وہی باتیں اپنے مہمان کے لیے روا رکھتے تھے۔ وہ دوسرے کاموں میں پورے طور پر منہمک ہوتے لیکن مہمان کو ایک لمحہ کے لیے نہیں بھولتے تھے۔ یہ بات اتنی واضح ہوتی تھی کہ موٹی سے موٹی عقل والا مہمان بھی سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا تھا۔

ان کی صحبت میں ہر قماش کے لوگ موجود ہوتے جو ذہنی یا سماجی اعتبار سے مختلف سطح پر ہوتے لیکن ان میں سے کسی کو یہ شکایت کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ سید صاحب نے کسی کے لیے کوئی کمی یا زیادتی روا رکھی۔ یہی وہ عجیب و غریب ملکہ یا خلوص تھا جس نے مرحوم کو ہر ایک کا محبوب بنا رکھا تھا۔ بدایوں کے دورانِ قیام میں ایک موقع پر عرض کر دیا کہ سید صاحب بننے کو تو میں آپ کا مہمان بن گیا لیکن زمانہ پُر آشوب ہے خدا نہ کرے میرا آپ کا سابقہ کسی اور طرح سے ہو۔ سید صاحب کسی قدر متعجب ہو کر بولے کیوں کیوں خیر تو ہے۔ میں نے کہا آپ میری دیکھ بھال اس طور پر کرتے ہیں جیسے آپ کو میری ساری کمزوریاں معلوم ہیں اور یہ بات دیارِ غیر بالخصوص

بدایوں میں میرے حق میں کچھ اچھی نہیں ہے۔ سید صاحب محظوظ ہوئے اور فرمایا اس بات پر آپ کو بدایوں کے اصلی پیڑے انعام میں دیے جائیں گے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ بدایوں سے ریل زیادہ رات گئے روانہ ہوتی تھی۔ رخصت ہونے کا وقت قریب آیا تو معلوم ہوا سید صاحب غائب ہیں۔ تھوڑی دیر میں تشریف لائے۔ فرمانے لگے کم بخت دُکان بڑھا گیا ورنہ پیڑے ساتھ کر دیتا۔ خیر یہ پیڑے سید پر قرض ہیں۔ میں بہت نادم و متاثر ہوا۔ عرض کیا سید صاحب آپ ایسا کریں گے تو میں بدایوں میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔ فرمایا اور میں کب رہا۔ پھر گلے لگالیا اور اس طور پر ملے جیسے زندگی میں شاید پھر نہ ملنا ہو اور ہوا بھی ایسا ہی۔

کوئی کسی ذوق یا ذہن کا کیوں نہ ہو اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بعض احباب انگریزی تہذیب و معاشرت کے دل دادہ اور انگریزی حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے سبب سے زندگی و زمانے کا مخصوص تصور رکھتے تھے۔ ان کو مشرقی تصورات اور مشرقی آداب بود و ماند سے کوئی سروکار نہ تھا، یہاں تک کہ مشرقیت کا مذاق اُڑانا اپنی زندگی کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ایک ایسے دوست بدایوں پہنچ گئے۔ علی گڑھ آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مرحوم سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح سے سنایا جیسے زندگی میں ان کو ایسا عجیب وغریب واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ کہنے لگے، بھائی یہ سید تو کہیں بند نہ تھا۔ اس پر کسی بات کا رعب نہ پڑتا تھا۔ میں نے ایسا شریر و شگفتہ بڈھا کہیں نہ دیکھا۔ جو بات جہاں کہہ دیتا اور جتنا برجستہ کہتا وہ اٹھائے نہ اٹھتی تھی۔ ایسا باغی نہ دیکھا جس کی کہیں سے گرفت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بڈھا تو کسی حسین نوجوان اور ذہین عورت سے زیادہ کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے چپ بھی نہیں رہا جاتا تھا اور بے باک ہونے کی بھی جرأت نہ ہوتی۔ سید صاحب کی وفات کے بعد دوست کو یہ خبر سنائی تو وہ دم بخود ہو گئے، تھوڑی دیر بعد بولے، بھئی میں ہوتا تو اس کی میت دیکھنے ضرور جاتا۔ مرنے پر بھی اس کی دل فریبی نہ گئی ہو گی!

●●●

(یہ تقریر 'گدڑی کے لعل' کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی تھی اور نظر ثانی کے بعد اس مجموعہ میں پیش کی جا رہی ہے۔ رشید احمد صدیقی!)

سید نصیر الدین علوی

(1893-1938)

سید نصیر الدین علوی 1893 میں پیدا ہوئے۔ وہ جون پور کے سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سید زین العابدین منصرم تھے۔ جون پور میں نصیر الدین علوی اور رشید صاحب ایک ہی اسکول میں تھے۔ وہ علی گڑھ میں 1913 میں آئے جب کہ رشید صاحب 1915 میں۔ ذاکر صاحب، رشید صاحب اور نصیر الدین علوی ایک ہی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ نصیر الدین علوی بہت ذہین طالب علم تھے۔ ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کر کے چند سال وکالت کی۔ جنوری 1924 سے منصفی کے عہدہ پر فائز رہے۔ مختلف شہروں میں ان کا قیام رہا۔ ان کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ کچھ عرصہ علی گڑھ میں بھی منصف رہے۔ 14 اگست 1938 کو لکھنؤ جارج میڈیکل کالج میں انتقال ہوا۔ جون پور میں مدفون ہیں۔!

o

سید نصیرالدین علوی مرحوم ہنستے کھیلتے زندہ رہے اور ہنستے کھیلتے ہی اُٹھ گئے۔ آغاز اور انجام دونوں قابل رشک۔ ایسے شخص کی عاقبت بھی سب سے نہیں تو بہتوں سے یقیناً بہتر ہوگی۔ میرا ان کا اسکول میں بھی ساتھ رہا اور کالج میں بھی۔ وہ مجھ سے سینئر تھے لیکن نصیر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں نصیر صاحب رہے خواہ وہ اسکول میں رہے ہوں خواہ کالج میں خواہ سب ججی پر فائز۔

گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور میں ہم دونوں پڑھتے تھے۔ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا وہ اٹالہ مسجد کے پائیں اپنے آبائی مکان میں لیکن دن کا زیادہ حصہ ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ نصیر صاحب مٹھائی کے بڑے شائق تھے۔ مجھے بھی اس چیز سے کچھ دشمنی نہ تھی۔ گھر پر جب مٹھائی اچھی خاصی مقدار میں جمع ہو جاتی تو مرحوم بشارت دیتے کہ آ جاؤ۔ ایک دفعہ پوچھا (آج سے کوئی پچیس تیس سال پہلے) نصیر بھائی (مسلم بورڈنگ ہاؤس جون پور میں بڑوں کو 'صاحب' کے بجائے 'بھائی' سے مخاطب کیا جاتا تھا) اتنی مٹھائیاں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ جواب دیا، جنّات لاتے ہیں۔ تین چار سال ہوئے مرحوم علی گڑھ تبدیل ہو کر آئے تو ایک دن شکایتاً فرمایا۔ تم آتے نہیں۔ میں نے کہا۔ وہ جنات بھی آتے ہیں یا نہیں۔ بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے بھئی، پہلے جنات مٹھائی لاتے تھے اب سب کھاتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر مجھے کہاں بلاتے ہیں، میں اپنے جنات بھی آپ ہی کے ہاں بھیج دیا کروں گا۔

زبان میں کسی قدر لکنت تھی طبیعت میں بلا کی شوخی اور جولانی۔ جوش میں آ کر یا بے اختیار ہو کر گفتگو کرتے تو ان کا بات کرنے میں اٹکنا اور پھر یک لخت کہہ پڑنا مزا دے جاتا تھا۔ اسکول

میں ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں اور کالج میں یہاں کے منتظمین سے اُلجھے رہنے میں ان کو خاص لطف آتا۔ شوخی، شرارت، خوش طبعی اور وضع داری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اسکول میں ہاکی کھیلتے تھے کبھی کبھی ٹینس بھی۔ لیکن کھیل سے اتنی دل چسپی نہ تھی جتنا کھلاڑیوں میں گھلے ملے رہنے کا شوق تھا۔ انھیں کے ساتھ الہٰ آباد کی مشہور نمائش دیکھنے گیا تھا تین چار دن الہٰ آباد میں رہے، پاؤں سے جوتا نہیں اُتارا پہنے پہنے سو جاتے، لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے، بولے بھائی بڑا مزہ آتا ہے۔ لحاف کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نمائش میں گھوم رہے ہیں۔

عرصہ کی بات ہے جب سردیوں میں گوروں کی پلٹن دورہ پر نکلتی تھی۔ ہم لوگوں کو ان سے ہاکی، فٹ بال کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ مرحوم ایک بار مصر ہوئے کہ انھیں بھی ٹیم میں شامل کرلیا جائے۔ چنانچہ اسکول ٹیم کے ساتھ یہ بھی پولیس کے میدان میں ہاکی کھیلنے پہنچے کہنے لگے دیکھو جی ہمارا جہاں سے جی چاہے گا کھیلیں گے اور جیسا جی چاہے گا کھیلیں گے۔ بیچ میں ٹوکنا مت۔ میں نے کہا روئی کی مرزئی تو اُتار دیجیے کہنے لگے سردی لگتی ہے۔ جسم میں گرمی آجائے گی تو اُتار دوں گا۔ مرحوم کی پشت کا بالائی حصہ شانوں سے متصل نسبتاً زیادہ پُر گوشت تھا۔ جس کے سبب سے ان کی گردن پیچھے سے دیکھیے تو چھپی معلوم ہوتی تھی اس پر روئی کی یہ مرزئی، ہاف بیک کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اسٹک کندھے پر رکھے ہوئے کھیل شروع ہوا۔ نصیر صاحب کے پاس گیند آئی تو یہ اسے لے کر ایک خاص انداز سے بھاگے۔ حاضرین نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ سامنے سے ایک گورے نے آکر چاہا کہ گیند چھین لے نصیر صاحب نے گیند روک لی اور معاً گورے کے سر پر اسٹک تان کر کچھ اس قسم کی آمادگی ظاہر کی گویا اس کا سر بیچ سے دو لخت کر دیں گے۔ گورا غریب کچھ ایسا بھوچکّا ہوا کہ اضطراراً دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا، لیکن حریف نے موقع کی نزاکت فوراً محسوس کی اور اس طور پر بڑھا کہ نصیر صاحب کی خیر نہیں۔ ادھر یہ بھی غافل نہ تھے فوراً بڑھ کر شیک ہینڈ (مصافحہ) کیا۔

تمام مجمع اور خود گورے ہنستے ہنستے لوٹ گئے!

پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور نہ امتحان میں فیل پاس ہونے کو کچھ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ شوخی، شرارت اور اسی نوع کی معرکہ آرائیوں سے دلچسپی تھی۔ کالج میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا معرکہ تصنیف کرتے رہتے۔ لیکن اس طرح کے معرکے کبھی منتظمین کالج یا

اساتذہ کے خلاف نہ ہوتے نہ اس کا تعلق سیاسی یا جماعتی مناقشوں سے ہوتا۔ ان باتوں سے وہ بالکل ہی بے تعلق تھے۔ ان کی ریشہ دوانیاں یا تگ ودَو تمام تر اپنوں تک محدود رہتی۔ ایک بات پر، آج کل جہاں طلبہ قواعد پریڈ کرتے ہیں وہیں رات کے دو بجے دو جماعتوں میں جن میں کم و بیش سو آدمی تھے لاٹھی چلی، خوب خوب چوٹیں آئیں، مرحوم نے مارا بھی اور چوٹ بھی کھائی۔ میں نے نہ مارا نہ چوٹ کھائی۔ بھاگے دونوں۔ دوسرے دن بحث اس پر ہوئی کہ پرنسپل کے ہاں فریاد لے جائیں اور حریف کو سزائیں دلوائیں۔ نصیر صاحب نے کہا ہرگز نہیں۔ خوب پیٹا اور اچھی طرح پٹ لیے، پھر شکایت کیا اور سزا کیسی! چلو سب لوگ ہسپتال چلیں۔

فریقین نے اس فیصلہ کو تسلیم کیا اور اسی صبح کو ہر کلاس میں مضروب پٹیاں باندھے لکچر سن رہے تھے۔ جو اس قابل نہ تھے وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ اتنا بڑا ہنگامہ آٹھ دس گھنٹے کے اندر ہی اندر ختم ہو گیا!

کالج میں ہمیشہ کسی نہ کسی دُھن میں رہتے۔ کبھی الیکشن کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ کبھی خطابات تصنیف کر رہے ہیں، یا خاص خاص قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ کبھی کسی کمرے میں پڑے گنگنا رہے ہیں اور کبھی برآمدے میں کھڑے آنے جانے والوں کو گالی دے رہے ہیں اور سب کو ہنسا رہے ہیں۔ ان کے بغیر دوستوں کی محفل پھیکی رہتی۔ کبھی اپنے کمرے پر نہیں پائے گئے۔ ہمیشہ کسی دوسرے کے ہاں ملے اور کسی نہ کسی نئے مشغلے میں مصروف۔ دوست دشمن دونوں میں مقبول تھے اس لیے کہ منافق بالکل نہ تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ نصیر جتنی گالیاں دیتا ہے اتنا ہی سینہ سپر بھی رہتا ہے۔

کالج میں الیکشن کا زمانہ تھا۔ مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کے ہاتھ میں الیکشن کی باگ تھی۔ سمجھوتا کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے مرحوم نہ ماننا چاہتے تھے اور نہ منظور کرنے کی ذمے داری لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دہلی چلے گئے۔ خورجہ کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی، سامنے سے فریق ثانی کے وکیل آتے دکھائی دیے جنھوں نے مرحوم کو دیکھ کر جلد جلد قدم بڑھانے شروع کیے۔ مرحوم بہت سٹ پٹائے۔ کیوں کہ ملاقات ہو جانے پر ان کا سارا نقشہ جنگ درہم برہم ہو جاتا، ادھر اُدھر دیکھا، راہ فرار مسدود نظر آئی آخر ایک غریب کتے کا سہارا پکڑا۔ یہ بچارا قریب

ہی چپکے چپکے انتہائی ادب کے ساتھ وہی بڑے کے گرے پڑے پتے چاٹنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ اس کی شکل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مہینوں سے اُسے دہی بڑے کے پتے سونگھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ مرحوم نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا اور اس طور سے لپکے کہ اسے مار ہی ڈالیں گے۔ کتا غریب بھاگا اور یہ اس کے پیچھے ڈھیلا پھینکتے شور مچاتے بھاگے۔ اس کا خیال البتہ رکھا کہ بے خیال میں کہیں کتے سے آگے نہ نکل جائیں۔ جب تک گاڑی سیٹی دے کر متحرک نہیں ہوگئی یہ برابر اس کا تعاقب کرتے رہے یہاں تک گاڑی چل نکلی اور یہ لپک کر پاس والے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

1921 کا زمانہ ہے، ذاکر صاحب، میں اور نصیر صاحب قانون کے طالب علم تھے، قیام صاحب باغ کی دوسری منزل پر تھا۔ چھت پر صرف ایک غسل خانہ اور ایک ہی بیت الخلا وہ بھی انگریزی وضع کا۔ آبادی کافی تھی، مختلف ڈیل ڈول اور مختلف عادات و اطوار کے، پشاور، آسام، مدراس، سندھ، یوپی اور پنجاب کے خاص الخاص نمائندے جمع ہو گئے تھے۔ غسل خانہ اور بیت الخلا سے متعلق نت نئے پیچیدہ اور دلچسپ مسائل پیدا ہوتے رہتے، ذاکر صاحب اسسٹنٹ ٹیوٹر تھے لیکن انھوں نے اس طرح کے مسائل کا تصفیہ نصیر صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا تھا، جس طرح مناسب سمجھیں سلجھائیں کسی کو انحراف کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔ ہر شخص نے اس سے اتفاق کیا۔ نصیر صاحب حسب معمول بڑے شوق اور تن دہی سے اس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے ہر شخص کے بیانات سنے خوب خوب بحثیں کیں، یوں تو شاخ در شاخ بہت ساری باتیں پیدا ہوئیں جن کا تذکرہ نہ مناسب ہے نہ ممکن، صرف دو ایک کے بیان کر دینے میں مضائقہ نہیں۔

ایک صاحب کسی ریاست کے باشندے تھے۔ پکّی تول سے تقریباً تین من کے اسی حساب سے غذا اور اسی حساب سے نتائج ناشدنی و ناگفتنی ایک اور صاحب سرحد سے بھی پرے کے رہنے والے تھے، سوکھے منحنی 'خشک چھوہارے' کے نام سے مشہور تھے۔ اوّل الذکر کے بارے میں پبلک کو یہ شکایت تھی کہ یہ بیت الخلا میں اپنا وقت تو بہت کم صرف کرتے تھے لیکن خود بیت الخلا کو دوسروں کے لائق نہ چھوڑتے تھے۔ دوسرے صاحب کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ یہ وقت بہت زیادہ لیتے تھے لیکن پلّے کچھ نہ پڑتی تھی۔ نصیر صاحب نے فیصلہ کیا کہ ریاست والے صاحب سے درخواست کی جائے کہ پہلا حملہ وہ کسی کھیت پر کیا کریں۔ اس کے بعد

بیت الخلا پر۔ خشک چھوہارے کو سمجھایا کہ ان کے لیے دین و دنیا دونوں میں طہارت معاف ہے۔ وہ اپنی چارپائی پر ہی فراغت کر سکتے ہیں۔ نوکر بستر جھاڑ دیا کرے گا۔ ضمناً یہ ہدایت نافذ کر دی کہ جو لوگ بیت الخلا میں زیادہ وقت صَرف کرنے کے عادی ہیں وہ ابتدائی مراحل اسسٹنٹ ٹیوٹر صاحب کی نگرانی میں ان کے کمرے کے سامنے طے کر لیا کریں اور جب ان کو اپنے آپ پر اعتماد ہو جائے تو بیت الخلا میں داخل ہوں۔

غسل خانے کے بارے میں نصیر صاحب نے یہ ہدایت کی کہ جس پر شرعی غسل واجب ہو، اس کو تفریحی غسل کرنے والے پر ترجیح دی جائے گی بشرطے کہ اوّل الذکر نصیر صاحب کو حالات وحوادثات سے مطلع و مطمئن کر کے ان سے پاس حاصل کر لے۔ غسل خانہ میں گنگنانا یا شعر پڑھنا اخلاقی نقطۂ نظر سے مذموم و ممنوع قرار دیا گیا۔ نصیر صاحب نے اس کی وضاحت بھی کر دی تھی لیکن یہاں ان کو دہرایا نہیں جا سکتا۔

صاحب[1] باغ کا باورچی خانہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر ایک صاحب کی پلیٹ میں چھپکلی کا ہڈی کا پورا ڈھانچہ آنا ممکن ہے بے نصیب چھپکلی اوپر چھت پر چپکی گرمی اور دُھوئیں سے بدحواس ہو کر دیگچی میں ٹپک پڑی ہو۔ صاحب باغ میں کہرام مچا۔ نصیر صاحب بھی پہنچے۔ ڈھانچا دیکھ کر دھک سے رہ گئے اور چہرے سے ایسی تشویش کا اظہار کیا کہ سارے لوگ تھوڑی دیر کے لیے دم بخود ہو گئے۔ پھر نہایت مایوسانہ انداز سے ایک ایک کا منہ تکنے لگے۔ لوگ متحیّر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بالآخر نہایت رقّت کے لہجہ میں فرمایا۔ ''بھائیو، جو ہوا سو ہوا، صبر تو بہرحال کرنا ہے، لیکن گھر والوں پر کیا گزری ہوگی، مرحوم کو میں جب کبھی دیکھتا کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ دن دور نہیں جب یا تو وہ خودکشی کریں گے یا میں۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے پہلے چل بسیں گے۔'' لوگ متحیّر تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر پوچھا گیا کہ یہ سب کیا اور کس کے بارے میں ہے تو مرحوم نے فرمایا، آپ سب تو ہیں شقی اور مردود، دیکھتے نہیں یہ ڈھانچا خشک چھوہارے کا ہے!

نصیر صاحب کے اس لطیفہ پر لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا اور لطف یہ کہ خشک چھوہارے نے اس کی سب سے بڑھ کر داد دی اور یہ محض اس وجہ سے کہ سب جانتے تھے کہ نصیر

1 موجودہ سلیمان ہال۔

بڑا ہی جاں نثار اور مخلص دوست تھا۔ پھر لطیفہ کی داد دینا خواہ کوئی زد میں آتا ہو، ایم۔اے۔او کالج والوں کی سیرت کا خصوصی امتیاز تھا جو آج کل بہت کم نظر آتا ہے۔

مرحوم سب جج ہوکر علی گڑھ آگئے۔ اپنی کوٹھی پر بنیائن پائجامہ پہنے بیٹھے رہتے۔ ہر طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے اور سب سے دل کھول کر ہنستے بولتے۔ ان کی بے تکلفی ان کے خلوص کا آئینہ تھی۔ وہ اس اعتبار سے عجیب وغریب آدمی تھے کہ ان پر فریقین معاملہ کو کلی اعتماد ہوتا۔ وہ عدالت میں فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے مکان پر فریقین میں مصالحت کرا دینے کی کوشش کرتے۔ ایک بار میں نے کہا کہ آپ جو مقدمات کا تصفیہ گھر پر کرانے کے درپے رہتے ہیں اس کا نتیجہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کہنے لگے ہاں ہاں ایسا حاکم قانونی استعداد کے اعتبار سے نیازمند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ جنگ کی ہلاکتیں دیکھے اٹھائے ہوتے ہیں ان سے پوچھو جنگ کسے کہتے ہیں۔ موجودہ زمانے کی جنگ خواہ وہ قانونی ہو، تجارتی ہو یا فوجی بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔ مقدمہ بازی نے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا ہے، اس کا تم کو اندازہ نہیں۔ اس کو میں سمجھتا ہوں اور میں ہی جانتا ہوں۔ عدالت میں قانونی انصاف ہوتا ہے۔ حقیقی انصاف تو بنچ کے شریفانہ سمجھوتہ ہی میں ہوتا ہے۔

ایک دن دیکھا اپنی کوٹھی پر آرام کرسی پر دراز ہیں۔ بنیائن اور پائجامہ زیب تن ہے ہر طرح کے لوگ جمع ہیں، حقے اور پان کا دور چل رہا ہے مرحوم کے فقروں سے محفلِ کشتِ زعفران ہے اور بنیائن الٹی پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا تو بولے ارے تم تو جانتے ہو بنیائن کا بڑا عیب یہ ہے کہ اتارو تو الٹی اُترتی ہے اُتاریے، سیدھا کیجیے اور رکھیے۔ کون اس دردسر میں مبتلا ہو۔ جوں کی توں میں پہن لینے میں بڑی سہولت رہتی ہے، ایک دفعہ اُلٹی رہتی ہے دوسری بار سیدھی، خود بخود الٹ پھیر ہوتا رہتا ہے!

مرحوم کا حافظہ بڑا قوی تھا، غیر موزوں اور مہمل اشعار سالہا سال جوں کے توں یاد رہتے۔ اسے میں بڑا کمال سمجھتا ہوں کیوں کہ میں خود ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انھیں ناموزوں نہ بنا لیا جائے۔ منشی ٹھاکر پرشاد شاداںؔ ایک بڑے زوردار شاعر تھے۔ ایسے ایسے معرکے کے اشعار تصنیف کیے تھے کہ ہمارے

زمانے میں ان کے کلام سے کالج کے در و دیوار گونجتے تھے۔ مرحوم ہی نے ان کو ہم سے روشناس کرایا تھا۔ شاداںؔ اس زمانے میں اتنے مقبول ہوئے کہ ان کو خط لکھا گیا کہ کلام کے کچھ نسخے بہ قیمت بھیج دیے جائیں۔ کچھ دنوں بعد شاداں کے صاحب زادے کا خط آیا۔ کلام شاداں کے کئی نسخے بھی تھے۔ خط کا مضمون یہ تھا:

''.....قبلہ گاہی صاحب مغفور کے کلام کی اہلِ ہندوؤں نے کوئی قدر نہ کی۔ صرف اہلِ اسلاموں نے کی.....''

کالج میں مدتوں اہلِ ہندوؤں اور اہلِ اسلاموں کا فقرہ مقبول رہا۔ نصیر مرحوم ان کا کلام بڑے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ شاداںؔ کا کلام یوں بھی سرتاسر مرصّع تھا۔ اس پر مرحوم کی زبان میں لکنت اور آواز میں کھنک۔ سناتے تو مزہ آ جاتا۔ شاداںؔ کی ایک غزل تھی جس کا عنوان غالباً یہ تھا:

''غزل یگانہ بصنعت اعراب سہ گانہ''

نمونہ ملاحظہ ہو:

جھمیں آیا یہاں پردہ دل شکن نہ کہا کسی کو یہ اس نے کن
بتھیں فارسی میں یہ بولے کن جھمیں باجے چھُن تیرے گھونگرو

نہیں دیکھتا ہوں کبھی سپن نہ سنا ہے گولی کی کچھ بھی پن
نہ کیا ہے دیکھیے کچھ پُن جھمیں باجے چھُن تیرے گھونگرو

کریں ہیں جو کھیاں یوں ہی بھن کریں چھپڑیں یہی دے بھی بھن
گیا شاداں کا بھی دل بھن جھمیں باجے چھُن تیرے گھونگرو

شاداںؔ کی ایک غزل کے چند اور اشعار سنیے:

مضمون قدِ یار کا ہے راست ٹھاڑ باندھ — بوسے کے واسطے نہ ضرورت ہے پاڑھ باندھ
گر ہے ہوس ہُما کو کسی طرح پھانسیے — ترکیب یہ ہے دام میں اس کے تو ہاڑ باندھ
فرہاد سے جو ملنے کی خواہش ہو کوہ پر — تیشے کو لے کے جائیو اور یک کلہاڑ باندھ

ایک جگہ مضائقہ، لائقہ و فائقہ کے سلسلے میں خود بندھ گئے ہیں:

لالہ ہوں لکھنؤ کا رکھوں لکھنؤ کا دماغ
پھولوں جو غیر جا پہ، کہاؤں شگافنہ

بڑی محبت کے آدمی تھے وضع کے بڑے پابند، دوستوں کی بڑی مدد کرتے تھے، کنبے والوں کا سہارا تھے۔ان کی وفات سے کتنے بے خانماں وکسمپرس ہوگئے۔ایسا کنبہ پرور اور دوستوں پر جان نثار کرنے والا کم دیکھا گیا ہے نکتے معذور، ہٹے کٹے غرض ہر طرح کے کنبے والے ان کے ساتھ رہتے جونہیں رہتے تھے ان کو روپے بھیجتے رہتے۔سب کو ایک نظر سے عزت ومحبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ایک طرح کا کھلاتے پہناتے تھے۔سب کو سب سے ملاتے تھے بغیر اس خیال کے کہ لوگ کیا کہیں گے اور کیا نہ کہیں گے۔وہ غریب کم رو اور بدحال عزیزوں کو اپنانے میں کسرِ شان نہیں سمجھتے تھے۔سمجھئے تو یہ بہت بڑی بات ہے اور سمجھ میں نہ آئے تو ذرا خود اس طرح رہنے کا ارادہ کیجیے پھر دیکھیے کتنا جابر آپ کا نفس آپ سے کیا سلوک کرتا ہے اور آپ اپنے عزیزوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

مرحوم شعروشاعری کے بڑے دل دادہ تھے۔ جہاں گئے وہاں شعروشاعری کی محفل گرم ہوگئی۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مرحوم کو جتنی ہزلیات یاد تھیں اور ہزل گوئی کی انھیں جیسی مشق تھی اتنی بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہوگی۔ ہر طرح کی ہزلیات — ہزل گوئی کے حق میں کلمۂ خیر کہنا ممکن ہے بعض بزرگوں کے نزدیک درست نہ ہو۔ کچھ شاید میری سوجھ بوجھ میں بھی شک کریں، لیکن اس فن کا حق ادا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔جس طرح طنز یا ظرافت میں ذرا پاؤں ڈگمگائے تو نتیجہ کمینگی مسخرگی یا کمینگی ہوتی ہے۔اسی طرح ہزل میں نری بدکرداری یا بے ہودہ گفتاری کا دخل ہو تو وہ صرف مغلظات بن کر رہ جاتی ہے۔اچھے شعر کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اگر اس میں کوئی نقص بھی ہو تو اس طرف ذہن منتقل نہ ہو۔اسی طرح اچھی ہزل وہ ہے جس کے پڑھے جانے پر سامعین کا ذہن اس کے رکیک یا نحیف پہلو سے اُلجھ کر نہ رہ جائے بلکہ شاعر کے سلیقہ اور طباعی کی داد دینے پر مجبور ہو جائے۔ظاہر ہے ہزّ الی ہی ہے لیکن اس شاعر کے کمال کو آپ کیا کہیں گے جو گندگی سے کھیلتا ہے لیکن طہارت زائل نہیں کرتا نہ اپنی نہ دوسروں کی!

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کو ان کے احباب واعزّا نہ جلد بھولیں گے اور نہ بھولنا گوارا کریں گے — اور یہ معمولی بات نہیں ہے!●●●

سید سجاد حیدر یلدرم

(1880-1943)

سید سجاد حیدر یلدرم 1880 میں کانڈیر ضلع جھانسی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید جلال الدین حیدر بنارس شہر کے کوتوال تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ 1894 میں ان کا داخلہ ایم۔اے۔او کالج میں نویں درجہ میں ہوا۔ 1901 میں بی۔اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور پورے صوبہ میں سکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ اس زمانہ میں کالج کا الحاق الٰہ آباد یونیورسٹی سے تھا۔

یلدرم کا شمار طالب علمی کے دور سے ہی ممتاز طلبا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے، وہ یونین کے سکریٹری اور صدر بھی رہے۔ وہ مولانا محمد علی، شوکت علی اور حسرت کے ہم سبق تھے اور علامہ شبلی کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔

یلدرم کو کالج کے زمانہ ہی سے ترکی زبان وادب سے دل چسپی تھی، اس دل چسپی کے باعث ترکی زبان پر مہارت حاصل کر لی اور ترکی کے چند فن پاروں کا ترجمہ اردو میں کر کے اردو کے قارئین کو ترکی کے ادب سے روشناس کرایا۔ ترکی زبان میں مہارت کی بنا پر ان کا تقرر بغداد کے برطانوی کونسل میں ترکی زبان کے ترجمان کی حیثیت سے ہو گیا۔

1902 میں ان کی شادی نذر زہرا بیگم سے ہوئی۔ 1918 میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر آپ کا تقرر ہوا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی بنیاد یلدرم نے ہی ڈالی۔ 1922 سے 1929 تک وہ اس کے صدر رہے۔ 1929 میں وہ یوپی سول سروس میں واپس چلے گئے۔ 1935 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

11/اپریل 1943 کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

آپ کی تصانیف اور تراجم کی تعداد بہت ہیں: 'خیالستان' افسانوں کا مجموعہ، جلال الدین خوارزم شاہ ترکی ڈراما کا ترجمہ۔

o

رفقا اور طلبا سے اکثر اس مسئلہ پر 'بحثنے' کا اتفاق ہوا کہ نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون شریفہ کے آداب کہاں سے آئیں گے۔ اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر پیشِ نظر ہیں ایک کی دل افروز شاعری اور دوسرے کی حسین انشاپردازی تمام تر ان کی شریفانہ شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ جو شاعر اور انشاپرداز کی حیثیت سے بہتوں کو شہرت حاصل ہے لیکن ان کی شاعری اور انشاپردازی میں نقص بھی اسی حدتک رہتا ہے جس حدتک بحیثیت انسان وہ نامعتبر واقع ہوئے ہیں فن اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں جو انسان سے اونچا یا اس سے علاحدہ ہو!

یلدرم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور اس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو گویا کچھ نہ تھی، نہ اب جب کہ زندگی سوا خوش رہنے اور خوش رکھنے کے لیے سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہیں دیکھی، لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ؎

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت

اس وقت سے اب تک زمانے کے رویّہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے اقدار کا کیسا کچھ فرق۔ ''جن پر مرنے والے لاکھوں تھے ان پر، رونے والا کوئی نہیں''۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور مہتمم بالشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں۔ ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیروزبر کرسکتی تھیں۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد اور ان کی سیرت میں ایسی پختگی تھی کہ ان کو زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی، لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر سے پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں مرحوم اس کے رجسٹرار رہے۔ انھوں نے مہاراجا محمودآباد، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزمل اللہ خان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وتیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا سازش کسی سے نہ کی۔ یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

مرحوم کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی، لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے، نہ روشنی اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہوسکتا ہے اِلّا شعروادب سے۔ اس یونیورسٹی میں شعروادب کے دیوانے دو ہی پائے گئے اور دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک احسنؔ مارہروی دوسرے یلدرمؔ۔ ٹرکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ ان کا نام آتے ہی ان پر وارفتگی طاری ہوجاتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کے شائبہ خوبِ تحریر کو بھی دخل ہے؟ جھومنے لگے، آنکھوں میں چمک آگئی اور چہرہ جگمگا اُٹھا۔ کہنے لگے جناب (مرحوم جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے۔ ہماری آپ کی نہیں ہے، میں نے بات کاٹ کر کہا یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا کہ میری یقیناً نہیں ہے، آپ کی بھی نہیں ہے۔ مسکرائے

پھر بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور ان کی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ ان کی زبان ہے جو نہ کبھی خود غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں 'ترک بازی' ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی، اب نہ وہ اپنے بس میں تھے نہ میرے۔ دیر تک ان پر یہ عالم طاری رہا۔ نامق کمال کا مشہور ڈراما' جلال الدین خوارزم شاہ' میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا بیش تر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ کرنے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہوں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے مرحوم کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جان دار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کو ترجمہ میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے۔ یہاں مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن سا با کمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا گزرا ہو۔ یہ بات ان ہی کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی۔ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اردو اُن کے گہوارہ میں پلی تھی۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کیے ہیں۔ اردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشا پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم بڑی خوبی سے ترکی رنگ و آہنگ قبول کر لیتا تھا۔ سید کے اسالیب انشا اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو میں انشائے لطیف کی ابتدا، شرؔر ریاض اور یلدرؔم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشائے لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر مُلّا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے لیکن سب رس کا انداز معتزلانہ تصوف کا ہے جو انشا لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشا لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کیا، اور ٹیگوریت نے اردو میں ناقابل التفات درجہ کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقافتِ ادب کو احتساب کرنا پڑا اور اردو میں یہ انداز جلد ہی ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی سمجھے جاتے تھے وہی سب سے پہلے اس کے

تائب ہوئے۔ سبب یہ تھا کہ گیتا نجلی کا اردو ترجمہ شائع ہوا اس کے چھلکے کو قبول کر لیا لیکن اس کے مغز سے نا آشنا رہے یہ چھلکا اتنا مسحور کن تھا کہ تہی مغز اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور اس سے کام نکالنے کے درپے ہوئے لیکن گاڑی آگے نہ چل سکی۔

شرر[1] اور ریاض[2] کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشا لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشا اور ان کا عشق دونوں کتابی ہیں، بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پُر تفنن لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ ان کی نثر میں پہنچ کر سستی ہو گئی ہے۔ شاعری میں جو انداز بیان اس کا حسن ہے، وہ نثر میں مصنوعی اور سہل ہو جاتا ہے۔ موضوع اور سطح کے یکساں ہونے کے باوجود نثر و نظم کے تقاضوں میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے یہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ شرر اور ریاض کی پیداوار مشینی ہے سجاد کی دستی، سجاد انصاری کو بھی انشائے لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ انشائے لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے مع

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے

لیکن جس طرح غزل میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی ہے لیکن شہد پن نام کو نہیں۔ یلدرم کی تحریروں میں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے یہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے اعصاب کا تشنج نہیں۔ مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت کلیتاً سوار نہیں ہے تو اُن کو تنہا بھی نہیں چھوڑتی۔ افادی کی تحریروں میں اکثر شوق کی مثنویوں کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

---

1. عبدالحلیم شرر (1860-1960)
2. ریاض خیر آبادی (1854-1934)

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رَو اور روانی میں اپنے وزن وقار کو بہہ نہیں جانے دیتے۔ مرحوم کے جذبات کچھ زیادہ تند وتیز نہ تھے جہاں خیالات کی رعنائی ہو وہاں جذبات کا ہیجان وطغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آگئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے، وہ بھی اس طور پر کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم وشرافت کا دامن بھی نہ چھوڑا۔

انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت وعفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے شاید کسی اور نے نہیں رکھا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ان کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفادت ہے۔ قاضی صاحب کی تحریر میں طنز کی تیزی وتلخی بھی شامل رہتی ہے۔ عبدالغفار، سجاد حیدر کی بجائے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں۔ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین انشاپرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اس زمانے میں بھی جوان تھے جب جسم وجان کے اعتبار سے نحیف ونزار ہو چکے تھے۔ تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم[1] کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اور ان کی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک فارسی مجلہ برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اسی سلسلے میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ مرحوم اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ سربہ مہر بہت سارے لفافے۔ کاغذات کے کچھ منتشر اجزا ایک آدھ اخبار ورسالے بغل میں دبائے یہی رسالہ پڑھتے چلے جارہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار۔ کسی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم لیتے

---

1 عظمت اللہ خاں ادیب وشاعر، 'سریلے بول' کے مصنف (1887-1927)

تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر اک ذرا رُک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو وہ بھی چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کرو گے! اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ ایک لفافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔ سجاد صاحب کو خبر نہ ہوئی میں نے اُٹھا لیا۔ کچھ دور اور بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد تیسرے لفافہ نے بھی مفارقت کی۔ وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے پیچھے یونیورسٹی آفس پہنچا۔ موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کیے۔ معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور سخت متفکر ہوئے۔ میں نے تینوں لفافے کچھ کچھ وقفہ سے واپس کیے۔ فرمانے لگے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اسی وقت کیوں نہ دے دیے۔ میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے۔ مخل ہونا مناسب نہ سمجھا!

یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمایئے۔ 'ایران شہر ہے، ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جان دار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے، اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ 'بت سنگی' (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود رہے گی۔ عرض کیا سید صاحب 'بت سنگی' کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے بہ؏

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کر دی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب اکبر نے کہیں بھس نہیں ملایا، بھس میں چنگاری لگائی ہے۔ فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں!

سید صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ یلدرم کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ ان کی سب سے پہلی نظم "مرزا پھویا" بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گذشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دل کش پہلو لطف سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ سید صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ پستی کی طرف ہرگز نہیں، موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کردی گئی ہے اس کو مزاج و خیال کی رنگینی و آزادی کے بجائے شخصی وانفرادی بے راہ روی قرار دیا گیا ہے۔

سجاد[1] صاحب کی ایک نظم جو اُن کی طبیعت کی رنگینی اور شخصیت کی دل آویزی کی ترجمان ہے۔ شملہ کا لکالائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے سہیل میں شائع ہوئی۔ سید صاحب کی یاد کے ساتھ یہ نظم ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔

ماتھے پہ بندی، آنکھ میں جادو	ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہرسو
چال لچکتی، بات لہکتی	جیسے کسی نے پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی، جن میں تھے رقصاں	لمحے میں رادھا لمحے میں راہو
ایسی بھڑک تھی، خلق تھی حیراں	ریل پر آیا کہاں سے آہو

سجاد صاحب کو جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو وجد میں آجاتے۔ جس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، ایک بار مرحوم کو ترکی جانے کا موقع مل گیا! کیا بتاؤں ان پر کیسا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی میں نے کہا سید صاحب سفر طویل ہے۔ تکلیف وہ بھی، کیسی گزرے گی؟ فرمایا ترکی کے خیال سے طبیعت مگن ہے۔ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا۔ یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھیے گا کیسا رقصاں و شاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سید صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ جسم میں توانائی چہرہ پر بشاشت اور سرخی آگئی تھی۔ پوچھا ترکی میں کوئی تبدیلی

1. حیدر یلدرم۔ 'محشرِ خیال' کے مصنف

پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آتی، لیکن مجھے تو ترکی سے الفت ہے اس کے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار!

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دل دادہ تھے۔ موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاپردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب انشا سے تائب ہوگئی ہیں اور اسے صرف ایامِ جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے پھر خلطِ مبحث سے کیا حاصل۔ سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں!

بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سید کو میں نے شاید ہی کبھی 'تم' کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا اور کسی نے ان کو برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا، اور ہنسی دل لگی میں بھی ان کی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے۔ بغیر کسی ارادے یا تکلف کے یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی، وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جز سمجھی جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا ان کا ذوق فطری تھا اور شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ

نظر رکھتے تھے، اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے جو بات ان کے عہد کے ہندستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ ان کی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدر دان تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں، یلدرم سے واقف اور ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔

مرحوم ان لکھنے والوں میں تھے جن کا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن ہو۔ وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہوں گی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں۔

مطبوعہ: (1) آج کل (دہلی)، 15 دسمبر 1945 ''یلدرم کی یاد میں'' عنوان سے۔
(2) علی گڑھ میگزین، 1946 " " " "
شائع ہوا۔

●●●

سر شاہ سلیمان

(1886-1941)

سرشاہ سلیمان 3 فروری 1886 کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ولید پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شاہ محمد عثمان تھا۔ آپ اسکول اور کالج میں فرسٹ کلاس طالب علم کی حیثیت سے نمایاں رہے۔ 1907 میں بی۔اے فرسٹ کلاس اور پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا جس کی بنیاد پر آپ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ مل گیا اور کیمرج سے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا۔

چوں کہ سرشاہ کو قانون سے خاص دلچسپی تھی اس لیے آپ نے ڈبلن یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس آکر اپنے والد کے ساتھ وکالت کی پریکٹس شروع کی۔ وکالت اور قانون کے میدان میں ان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ عہدوں اور خطابات میں برتری حاصل ہوئی۔ 1934 میں آپ چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے اور پھر فیڈرل کورٹ کے ممبر ہوئے۔

13 مارچ 1941 کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اس عہدہ پر آپ چند ماہ ہی رہ سکے اور 1941 میں صرف 55 سال کی عمر میں سرشاہ کا انتقال ہو گیا۔

سرشاہ ایک اصول پرست انسان تھے اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ایک ماہر قانون داں کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ذوق اور میر کی مثنویوں کو ترتیب دیا اور آئنسٹائن کے نظریہ اضافت پر بھی تبصرہ کیا۔

o

بہت دنوں کی بات ہے جب چھوٹے شہروں یا بستیوں میں معمولی واقعے پر غیر معمولی دُھوم یا ہلچل مچ جاتی۔ چونتیس پینتیس سال گزرے ایک صبح جون پور کے چھوٹے سے شہر میں غیر معمولی ہماہمی کے آثار پیدا ہوگئے۔ میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں پڑھتا تھا اور گورنمنٹ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جو شہر کے عین وسط میں واقع ہے رہتا تھا۔ سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا جنگلا بورڈنگ ہاؤس اور شاہراہ کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک جلوس گزرنے لگا۔ بورڈنگ کے سامنے لڑکے جنگلے پر آ گئے۔ جنگلے یا جالی کے پیچھے سے کسی منظر کے دیکھنے کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جس کو چھوٹے بچے یا اچھے شاعر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

پھولوں سے لدی اور سجی ہوئی اور گھوڑوں کی ایک پُر تکلف گاڑی گزر رہی تھی، جس میں چند بزرگوں عزیزوں کے ساتھ ایک معمولی جسامت لیکن نمایاں ذکاوت کا ایک خوش رُو نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جس کو کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی جُھک کر دائیں بائیں دیکھتا، کبھی ہار پھولوں سے اُلجھ جاتا، کبھی پاس والوں سے جلد جلد باتیں کرنے لگتا۔ کبھی گاڑی کے تکیہ سے پیٹھ لگا لیتا، لیکن فوراً ہی آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگتا، اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے اُکتا کر جلوس کو چیرتا پھاڑتا کودتا پھاندتا سب سے آگے نکل جائے گا۔ درو دیہ ہجوم تھا۔ ہر چھوٹا بڑا جوان یہ سمجھتا تھا کہ یہ خوشی اُسی کے گھر اُتری ہے اور خوشی کے اظہار میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ جون پور کے مشہور گھرانے اور سب سے مشہور وکیل حافظ محمد عثمان صاحب

کے بڑے لڑکے شاہ محمد سلیمان تھے جو ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس ہوئے تھے۔

نئی دلّی سے نظام الدین اولیا کی طرف ایک خاموش جلوس جا رہا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ملول و محزوں کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے نظام الدین اولیا پہنچا۔ ایک تازہ قبر نظر آئی۔ آس پاس کی زمین روندی ہوئی تھی جس پر پانی چھڑکا گیا تھا۔ قبر پر پھول کا انبار تھا۔ یہاں الٰہ آباد ہائی کورٹ اور فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ریاضیات کے مشہور ماہر، اردو شعر و ادب کے شیدائی اور ماہر مانے ہوئے شریف النفس انسان، سر شاہ محمد سلیمان، نظام الدین اولیا کی سنسان پُر اسرار بستی میں ایک سکوت کو مزید اضافہ کر کے آسودہ خاک تھے۔

قانون میں جو اونچا درجہ سر شاہ کو حاصل تھا اس سے ہم میں شاید ہی کوئی ناواقف ہو اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قانون سے مجھ سے زیادہ ناواقف ہو اس لیے میں ان کی قانونی فتوحات پر کوئی تبصرہ نہ کروں گا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جو لوگ قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے، خواہ وہ کوئی ہوں اور کیسے ہی ہوں سر شاہ سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان کے بعض ایسے قانونی معرکوں کا مجھے علم ہے جہاں سر شاہ کی قانونی نکتہ سنجی ہی کا نہیں بلکہ اس سے بدرجہا سخت آزمائشوں کا امتحان رہا، لیکن مرحوم نے قانونی مطالبات سے سر مو انحراف نہ کیا۔ شخصی اعتبار سے سر شاہ نرم خو واقع ہوئے تھے۔ ہر شخص کی سن لیتے تھے۔ ہر شخص کو راضی رکھنا چاہتے تھے اس کے عواقب بھی بھگتتے۔ لیکن جب قانون کا پاؤں درمیان ہو تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتے تھے اور وہی کرتے تھے جو قانون کا تقاضا ہوتا۔

شروع سے آخر تک وہ قانون میں ایسے رچے بسے رہے کہ قانون ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ اس بارے میں ان کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی ہے جس کے شعور میں یہ حقیقت پیوست ہو گئی ہو کہ خدا حاضر و ناظر ہے۔ اس لیے اس کو خلوت و جلوت میں کہیں بھی خدا کے بتائے ہوئے راستہ سے انحراف نہ کرنا چاہیے۔ خدا کا نہیں قانون کا یہ تسلط عملی زندگی میں کبھی کبھی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔ سر شاہ قانون سے خوب نپٹتے تھے۔ شیطانوں سے بالکل نہیں نپٹ سکتے تھے۔

طبیعیاتی ریاضی سے شغف تھا اور اس فن میں ان کی حیثیت مانی جاتی تھی مجھے ریاضی سے اور ریاضی کو مجھ سے عناد ہے۔ مرحوم اپنی تحقیقات کے نتائج مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعات کے عام جلسہ میں اکثر پیش کر کے یہ دیکھنے کے لیے سرشاہ طبیعات کے دقیق مسائل پر کیسی بحث کرتے ہیں، تماشائی کی حیثیت سے ضرور جاتا۔ مرحوم کس اعتماد و وثوق سے لکچر دیتے اور بحث کرتے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام عمر انھوں نے اسی فن پر کام کیا ہے۔ فن کے ماہرین بھی کافی تعداد میں موجود ہوتے۔ لیکن ایک روایتی اسیری حیثیت سے (اور مجھ ایسے لوگوں کی ایسے مجمع میں کمی نہیں ہوتی) بیش تر کی رائے یہی ہوتی کہ سرسلیمان کا پلہ اونچا رہا۔ ایک مشہور پروفیسر نے بہت کچھ ردّ و قدح کے بعد کہا کہ اچھا یہ تو بتایئے آپ کا یہ نظریہ کس فارمولا کے تحت آتا ہے اور آپ کیوں کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ سرشاہ کا جواب یہ تھا کہ میں آپ کے سامنے نتائج پیش کرتا ہوں جو واقعات سے ثابت ہیں۔ آپ واقعات و نتائج کی تاویل کیوں کر کریں گے، فارمولا تو بعد کو بنے گا اور یہ میں نہ بنا سکوں تو آپ بنایئے۔

مرحوم کی بڑی صاحب زادی کی شادی کی سرگرمی اور خوشی کا عالم دیکھنے کا تھا۔ تقریب سے متعلق ساری جزئیات منقح کر کے دم لیتے تھے۔ ہر کام میں خواہ وہ چھوٹے سے چھوٹا ہو، خواہ بڑے سے بڑا، ان کا دخل ضرور ہوتا سب سے پہلے مہمانوں کی تعداد معیّن کی، اتنے میں دعوت نامے جاری کیے۔ پھر یہ اندازہ لگایا کہ فی کس کتنی جگہ گھرے گی۔ فیتہ لے کر ہر چیز ناپ ڈالی۔ اس طرح پنڈال کا رقبہ متعین کیا۔ یہاں تک کہ برف کا حساب لگایا کہ کتنی مقدار درکار ہوگی۔ پہلے برف کی ایک معینہ مقدار منگالی اور مناسب حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے بعد گھڑی لے کر یہ دیکھا کہ کتنی دیر میں کتنی برف پگھل جائے گی۔ اس کے بعد یہ طے کیا کہ برف کی مجموعی مقدار کیا ہو!

اس شادی کے سلسلے میں سرشاہ کے باضابطہ ہونے کا ایک واقعہ نہ بھولوں گا۔ مرحوم کسی ضروری سفر پر الٰہ آباد سے باہر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ مزدوروں کا ہجوم ہے اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان مزدوروں کے لیڈر کی حیثیت سے سرشاہ کے منتظر ہیں۔ نوجوانوں نے سرمایہ اور مزدوری کے مسئلہ پر ایک دھواں دھار تقریر کی اور سرشاہ پر یہ الزام لگایا کہ لڑکی کی شادی میں

انھوں نے مزدوروں کی مزدوری نہیں دی اور یہ آئین مروّت اور آئین انسانیت دونوں کے خلاف تھا!

مرحوم نے یہ تقریر بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سنی۔ اس دوران میں پلیٹ فارم پر اور زیادہ مجمع ہو گیا۔ مرحوم نے اپنے کلرک کو موٹر پر کوٹھی بھیجا اور بتایا کہ فلاں الماری میں فلاں فائل فلاں نمبر پر رکھی ہوئی ہے فوراً لاؤ اور جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے مزدوروں سے پوچھتے رہے کہ تمہاری یومیہ مزدوری کیا ہے۔ اب کیا کرتے ہو اور اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ کلرک نے تھوڑی دیر میں فائل لا کر دے دی۔ مرحوم نے فائل کھول کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کس کس شخص نے کس کس دن شادی میں کام کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے کام نہیں کیا تھا اور سارے کے سارے مزدور ادھر اُدھر سے اکٹھا کر لیے گئے تھے۔ سرشاہ نے نوجوان اور مزدور دونوں کو اپنی فائل دکھائی جس میں ہر مزدور کا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ ہر ایک کے نام کے آگے مزدوری اور بے باقی لکھی ہوئی تھی اور دستخط اور انگوٹھے کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد مرحوم نہایت اطمینان کے ساتھ جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہ تھا سب سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نوجوان نے البتہ پھر کبھی سرشاہ کا سامنا نہ کیا۔

سرشاہ کے ایک پیشکار تھے، جو روپے پیسوں کا بھی حساب رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ پیشکار صاحب نے بیس روپے غلطی سے کہیں زائد دے دیے۔ سرشاہ نے وہ روپے ان سے وصول کر لیے اور بولے یہ اس لیے کہ آپ سے پھر کبھی ایسی چوک نہ ہو۔ اتفاقاً ایک بار خود سرشاہ دوسو روپے پیشکار صاحب کو غلطی سے دے گئے۔ حساب ہوا تو غلطی دریافت ہوئی۔ پیشکار صاحب نے بہتیرا چاہا کہ وہ دوسو روپے جو اُن کے پاس محفوظ تھے واپس کر دیں۔ مرحوم نہ مانے اور فرمایا یہ دوسو روپے تمہارے ہیں یہ اس لیے کہ آئندہ مجھ سے غفلت نہ ہو۔

جس زمانے میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے ایک صاحب کی معیت میں مرحوم کی کوٹھی پر رات بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ شب کا کھانا سرشاہ کا باہر تھا۔ ہم سب کھا پی کر سو چکے تھے۔ مرحوم بارہ بجے رات کے بعد واپس آئے۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ کچھ آہٹ ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ سرشاہ پورے ڈنر سوٹ میں ملبوس ایک سینی میں کھانا لیے ہوئے

شاگرد پیشہ کے کوارٹرس کی طرف جا رہے ہیں۔ صبح سویرے اس کی فکر ہوئی کہ معاملہ کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ جو نوکر تھا اس کو کھانا نہ ملا تھا۔ سرشاہ نے ڈنر سے واپس آنے پر دریافت کیا کہ مہمانوں کی مدارات میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ مہمانوں کا نوکر چوں کہ شہر چلا گیا تھا اس لیے اس کو کھانا نہ مل سکا۔ چنانچہ بغیر کسی تامل کے سرشاہ نے یہ فریضہ پورا کیا۔ گھر میں کسی نے کہا کہ نوکروں میں سے کسی کو جگا کر کھانا بھیج دیا جائے تو نہ مانے اور کہا کہ نوکر دن بھر کے تھکے سو رہے ہیں یہ کام مجھ ہی کو کرنا چاہیے۔ میں مہمان ہی کا میزبان نہیں ہوں ان کے نوکروں کا بھی میزبان ہوں۔

سرشاہ کو شاعری سے دلچسپی تھی۔ شاعروں کی بڑی تعظیم کرتے تھے، مشاعرے میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ عام گفتگو میں لطف سخن کی خاطر بھی جوش اور مبالغہ کو دخل نہ دیتے۔ مشاعرہ میں اوسط درجے کے شعر کی بھی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ سرشاہ جیسی طبیعت اور مصروفیتوں کا آدمی اس طرح کی باتوں میں کس طرح وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ مشاعروں میں ان کی شرکت رسمی نہ ہوتی۔ صدر بنائے جاتے تو جب تک صحبت ختم نہ ہو جاتی کوئی نہ کوئی عذر کر کے اُٹھ جانا درکنار وہ شروع سے آخر تک دلچسپی لینے میں معمولی سے معمولی آدمی سے بھی پیچھے نہ رہتے۔ جہاں تک اردو شاعری اور مشاعرہ کا تعلق ہے الٰہ آباد میں سرشاہ اور سرتیج سے زیادہ ان کا اور کوئی قدرداں نہ تھا۔ سرشاہ ذوق کا کلام بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے قصائد کو مدوّن کیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا ہے اور ایک اچھے جج کی مانند کلام کو اُسی حد تک سراہا ہے جس حد تک وہ اس کا مستحق ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ایک دور بڑا سخت گزرا جب اس پر ایک تحقیقاتی کمیشن [1] بٹھایا گیا۔ کمیشن نے یونیورسٹی کی آئندہ دروبست کے لیے جو سفارشات تجویز کیں تھیں ان کو مکمل ضابطہ کی شکل دے کر نافذ کرنا نازک اور مشکل کام تھا، اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو قانونی نکتوں سے واقف علی گڑھ کی دیرینہ روایات کا قدردان اور علی گڑھ کی نام وری اور نیک نامی کا دل سے خواہاں ہوں۔ سرشاہ نے اس کے لیے عارضی طور پر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونا

1 اس تحقیقاتی کمیشن کا نام رحمت اللہ کمیٹی تھا، سر رحمت اللہ اس کے سربراہ تھے۔

منظور کیا جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے وہی جانتے ہیں کہ مرحوم نے کس قابلیت، جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ اس مرحلے کو طے کیا۔ شکستہ خاطروں کی دل جوئی کی، کام کرنے والوں میں کام کرنے کا نئے سرے سے ولولہ پیدا کیا اور بہتوں کے وزن ووقار کو دوبارہ زندگی بخشی۔

سر شاہ ایسے قابل بے لوث اور اَن تھک کام کرنے والے ہم میں تقریباً ناپید ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کام خصوصیت کے ساتھ نہایت پیچیدہ اور مختلف النوع ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی بات نہیں۔ سر شاہ ہمیشہ اتوار کو یا جب کہ فیڈرل کورٹ میں چھٹی ہوتی یا ان کو موقع مل جاتا، علی گڑھ چلے آتے اور آتے کے ساتھ ہی یہاں کے کاموں میں منہمک ہو جاتے۔ آفس میں قیام کرتے، ڈائننگ ہال سے خرید کر کھانا منگاتے اور آفس ہی میں سوتے۔ یونیورسٹی کا ایک پیسہ اپنی ذات پر نہ صرف کرتے۔ اس بارے میں وہ اس درجہ محتاط تھے کہ بعض پرانے زمانے کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دن رات طلبا اسٹاف بیرونی عمائد اور اکابر سے سابقہ رہتا۔ ان کی سنتے اپنی کہتے اور کام بناتے، انھوں نے کسی سے کسی حال میں ملاقات کرنے سے گریز نہ کیا۔

سر شاہ میں کام کرتے رہنے کی کیسی بے پایاں طاقت تھی۔ کیسا ہی مشقت کا کام کر کے اُٹھے ہوں ایسا معلوم ہوتا جیسے اچھی طرح آرام کرنے کے بعد پورے ولولہ اور طاقت کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ میں نے کبھی انکو جماہی یا انگڑائی لیتے نہ پایا۔ بات کرنے یا بات سمجھنے میں کسی نے یہ محسوس نہ کیا کہ سر شاہ پر کسی طرح کی بے دلی یا اضمحلال طاری ہے۔ کبھی طنز، غصہ یا آزردگی سے گفتگو نہیں کی حالاں کہ ایسے مواقع اکثر آئے جب بحث میں دوسری طرف سے معمولی درجے کے لوگوں نے ایسی باتیں کہیں یا ایسا انداز اختیار کیا جن کو معمولی درجے کا آدمی بھی مشکل سے انگیز کر سکتا تھا۔ جس طرح ایک تندرست چھوٹے بچے کو چند وقفے کے لیے بھی پورے طور پر ہاتھ پاؤں چلانے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طور پر مرحوم سے یہ ناممکن تھا کہ وہ تھوڑی دیر تک بھی اپنے ہاتھ پاؤں، آنکھ، شانہ، گردن وغیرہ کو معطّل رکھ سکیں۔

اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے اور ہر دولت سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بے حد متواضع تھے۔ ہر شخص سے ہر وقت ملنے کے لیے تیار رہتے۔ پان سگریٹ سے پرہیز کرتے تھے،

لیکن یہ چیزیں ہر ملنے والے کو پیش کی جاتیں۔ گرمی میں شربت اور سردی میں چائے سے ضرور تواضع کرتے۔ وہ مشکل کشائی پر آمادہ رہتے، دفع الوقتی سے کبھی کام نہ لیتے۔ بڑے آدمی تھے لیکن بڑے آدمیوں کے وتیرہ کے خلاف اپنے اثر و اقتدار سے اپنے آپ کو نفع یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بجائے ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے اور جھوٹے وعدوں سے دوسروں کو لٹکا رکھنے کی ان میں بالکل عادت نہ تھی۔

مرحوم کے بارے میں ان کا دشمن بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی کسی سازش میں شریک ہو سکتے تھے، وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ اسلامی روایات اور مشرقی ادب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقہ سے رہتے تھے۔ کپڑے صاف اور سجل پہنتے تھے، پچاس سے متجاوز ہونے کے باوجود جسمانی صحت، خوش دلی، چلت پھرت، چہرے بشرہ سے وہ کہیں کم عمر نظر آتے تھے۔ میں نے سر شاہ کے سے خوب صورت سفید بال کسی اور کے نہ دیکھے۔ بہت جلد ہنس پڑتے جس میں خلوص اور بے تکلفی ہوتی۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو دیا بہت کچھ، لیا کچھ بھی نہیں۔ کاش موت نے ان کو اتنی مہلت اور دی ہوتی کہ وہ زندگی میں براہِ راست ہماری مدد اور ہماری رہبری کرتے۔

شیخ حسن عبداللہ

شیخ حسن عبداللہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں غالباً ان کا تعلق غازی پور سے تھا۔ ان کے والد کا نام ابوالحسن تھا جو غازی پور کے رہنے والے تھے اور علی گڑھ میں عرصہ تک محسن الملک کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں ان کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے تھے۔

حسن عبداللہ نے ایم۔اے اردو میں کیا تھا اور رشید صاحب کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ ریسرچ کے سلسلہ میں لندن میں بھی قیام کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں میرسر آفس میں اسٹیورڈ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اسٹیورڈ یونیورسٹی کی جائیداد سے متعلق معاملات اور چیزوں کی خریداری کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اب میرسر آفس ختم کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام پراپرٹی ڈپارٹمنٹ اور دوسرے کا پرچیز آفس ہے۔

O

سائرن[1] بے وقت بجا۔ دل دھک سے ہو گیا۔ حسن عبداللہ رحلت کر گئے۔ صرف چند لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دفعتاً بیمار ہو گئے تھے۔ ورنہ یونیورسٹی کے احاطہ میں کسی شخص کے ذہن میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ حسن عبداللہ کی وفات کا اعلان کیا گیا تھا۔ کوئی مر سکتا تھا، سوا حسن عبداللہ کے، وہ ایسے کڑیل جوان تھے۔ جہاں ہوتے دور سے پتا لگ جاتا کہ حسن عبداللہ مصروف کار یا پیکار ہیں!

یونیورسٹی میں 'اسٹیوارڈ'[2] مقرر ہوئے تھے، اس کام کے علاوہ یونیورسٹی میں رسد رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اپنے اور دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور مشاغل اپنا رکھے تھے۔ یونیورسٹی میں کوئی تقریب ہونے والی ہو، دوسروں کے یہاں کسی مہم کا سامنا ہو، شہر میں کوئی جلسہ ہونے والا ہو، علی گڑھ سے باہر کوئی ہمہمہ یا حادثہ ہو، حسن عبداللہ کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی حیثیت سے پہنچ جاتے اور پیش پیش رہتے۔ گفتگو سے، بحث، مباحثے سے ہاتھ پاؤں سے، شعر و شاعری سے، دل سے، دام سے، دوا دوش سے، جسم و جان میں قیامت کی تب و تاب تھی!

---

1 ماضی میں یہ روایت تھی کہ جب کسی طالب علم یا اسٹاف ممبر کی موت ہوتی تھی تو یونیورسٹی کا سائرن بجتا تھا۔ اس سے اطلاع کرنا مقصد تھا۔ اب یہ روایت ختم ہوگئی ہے۔

2 اسٹیوارڈ: عہدہ دار جس کے ذمہ یونیورسٹی کی جائیداد کی دیکھ بھال اور سامان کی خریداری ہوتی تھی۔ اب یہ دو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ (1) پراپرٹی ڈپارٹمنٹ، (2) پرچیز آفس

لمبے تڑنگے، خوش رو، خوش لباس، اکڑنے اور جھکنے دونوں میں یگانہ، نہ آہستہ بولتے تھے، نہ چپکے سے کام کرتے، ان کی زندگی کے ساز میں دھیما سُر کوئی تھا ہی نہیں، بڑے شریف گھرانے کے تنہا اُجالا تھے، اخلاق و وضع داری میں کھرے مشرقی، جس کو محبوب رکھتے اس کو کوئی ناملائم کہے تو حسن عبداللہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، پھر نہ وہ اپنا دیکھتے نہ پرایا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نیچ نہ اونچ، نہ اپنے بس میں ہوتے نہ دوسروں کے، سنبھل جاتے تو قدموں پر سر رکھ دیتے!

میرے شاگرد تھے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی ہی سے اردو میں ایم۔اے کیا تھا۔ پی ایچ۔ ڈی۔ کرنے لندن گئے۔ لڑائی چھڑ گئی تو سلسلہ منقطع کر کے ہندوستان واپس آ گئے۔ گریجویٹ ہوتے ہی وکالت شروع کر دی تھی، لیکن ان کا دل اردو لکھنے پڑھنے میں لگتا تھا۔ کچھ دنوں آگرہ میں اردو فارسی کے لکچرر رہے۔ یہ سب ہوا اور ہوتا رہا، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کا معلم بننے کا حوصلہ اور ولولہ دل سے نہ نکلا، کاش کسی نے ان کی وہ والہانہ تمنا دیکھی ہوتی جب وہ اپنے خاص انداز سپردگی میں کہتے تھے، رشید صاحب مجھے کچھ نہ چاہیے مجھے میرے اللہ اور میرے ابا نے کھانے بھر کو دے رکھا ہے!

میں نے ان کو شعبہ میں لینے کی تحریک بھی کی، لیکن ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ یونیورسٹی نے ان کو نہ چھوڑا۔ لڑائی کے زمانے میں رسد رسانی کا جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس کو اس انہماک اور سر چکرا دینے والی ایمان داری سے کرتے تھے کہ یونیورسٹی کے حکام کے نظریے کا رد کرنا بھی آسان نہ تھا۔ کہا اردو لکچرر تو آج نہیں کل کوئی نہ کوئی مل جائے گا، حسن عبداللہ جیسا ایمان دار میر ساماں نہ ملے گا۔ یہ بات سچی اور پکی تھی۔ ہم میں سے بڑے سے بڑے بے ایمان کا مقولہ تھا کہ حسن عبداللہ جیسا ایمان دار کوئی اور نہ تھا!

حسن عبداللہ جذباتی تھے۔ جتنا جلد چڑھ جاتے اتنا ہی جلد من جاتے، ہمیشہ چڑھتے پہلے تھے منتے بعد میں تھے، اور جب من جاتے تو پھر آپ کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ مولوی نذیر احمد نے (Explosive) کا ترجمہ بھک سے اڑ جانے والا مادہ لکھا ہے اس سے بڑھ کر شاید خود انگریزی کا لفظ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا۔ حسن عبداللہ کے بارے میں بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھک سے اڑ جانے والے شخص تھے۔ اس جلالی صفت کے بعد ان کی

جمالی صفت آتی۔ جب وہ ہم کو آپ کو منانے کے لیے پاؤں پکڑ لیتے معذرت کے سارے کلمات استعمال کر جاتے اور کام کر دیتے۔

میرے سامنے وہ سگریٹ نہ پیتے۔ دفعتاً ان کے آفس میں پہنچ جاتا اور وہ سگریٹ پیتے ہوتے تو اسے مسل کر چھپا دیتے، پھینک دیتے اور سروقد کھڑے ہو جاتے، بارہا کہا کہ اس تکلف میں کچھ دھرا نہ تھا، اس سے آپ ہی سے نہیں خود اپنے سے بے گانگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات میرے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے وہ کہتے تھے کہ ان کو یہی اچھا لگتا ہے۔

میں نے ان کو دل جمعی سے آفس میں بیٹھے کبھی نہ پایا۔ کوئی موجود ہے تو اس سے 'بھڑے' ہوئے ہیں۔ کوئی نہ ہو تو ٹیلی فون ہی پر کسی سے آداب تسلیمات یا پکار اور للکار میں مصروف ہیں۔ ٹیلی فون پر بھی بڑے زوردار دھماکے سے گفتگو کرتے۔ ایک دفعہ ان کے آفس میں پہنچا اور بولا حسن صاحب ذرا لائبریری کو ٹیلی فون کرنا ہے۔ کہنے لگے ٹیلی فون خراب ہے۔ میں نے کہا جبھی تو آپ کے ہاں آیا ہوں۔ اٹنشن ہو گئے، اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ وہ نہ صرف ہر نامعلوم حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے بلکہ کہیں اور سے حملہ نہ ہوا تو خود حملہ کر بیٹھیں گے۔ بولے، یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی آواز بگڑے ہوئے ٹیلی فون پر بھی منزل مقصود تک پہنچ جائے گی اس لیے آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں.... فوراً جیسے کمر کھول دی، ہنس پڑے۔ کہنے لگے قبلہ آپ بھی غضب کرتے ہیں — ماشاءاللہ! یہ ان کا بڑا منجھا ہوا فقرہ تھا، جو وہ خوشی میں بھی استعمال کرتے اور ناخوشی میں بھی!

امورِ شریعہ میں بڑے بے جھجک اور بے لچک تھے۔ انگلستان میں ٹیوب کے اسٹیشن پر اُترے، سامنے زینہ، زینہ کے موڑ پر تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی آنے جانے والوں کا ریلا تھا۔ نماز کا وقت یاد آ گیا۔ وہیں نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے، ادھر کا مجمع اُدھر اور اُدھر کا ادھر، گڑبڑ مچ گئی۔ پولیس سارجنٹ بلایا گیا اس نے پہلے تو کچھ غور کیا پھر کہا، یہ رکوع میں چلے گئے، وہ دو قدم پیچھے کھسک گیا۔ اس کے بعد سجدے میں چلے گئے تو اس نے سیٹی بجائی۔ یہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو اس نے ان کے دونوں شانوں کو جھنجھوڑا، یہ نیت توڑ کر اس سے گتھ گئے، معاملہ پولیس کمشنر تک پہنچا، اس نے ان کو فہمائش کی کہ شارع عام راستہ چلنے کے لیے ہے، عبادت کے لیے نہیں۔ اور

سارجنٹ کو تاکید کی کہ غیر ملکیوں کا بہرحال احترام کرنا چاہیے۔ یہ واقعہ آج کل کہیں ہندوستان میں ہو جاتا تو اللہ ہی جانتا ہے کیا کچھ نہ ہو جاتا!

شعر کہنے پر بلا کی قوت تھی، غالبؔ کے دیوانے تھے۔ کیا مجال کوئی غالبؔ کو بُرا بھلا کہہ کر ان کے سامنے یا ان کی گلی سے نکل جائے۔ تقریر کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، اس کے پیچھے تو جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آگرہ کسی کام سے گئے تھے وہیں سے مرض الموت لائے۔ شدت کا بخار چڑھا، ساتھ بھی دست آنے لگے۔ لوگوں نے ان کے اعزاز میں جلسہ کر دیا تھا، دوستوں نے بہتیرا سمجھایا کہ موقع تقریر کرنے کا نہ تھا، آرام کرنے کا تھا۔ بالآخر طے پایا کہ صرف معذرت کر کے چلے آئیں گے۔ معذرت کرنے کھڑے ہوئے تو ڈھائی گھنٹے دھواں دھار تقریر کر ڈالی۔ نڈھال ہو گئے بالآخر علی گڑھ لائے گئے، حالت بگڑ چکی تھی لیکن دوڑ دھوپ علاج معالجے سے طبیعت سنبھل گئی، اور لوگوں کو یک گونہ اطمینان ہو چلا تھا کہ مرض پر قابو پا لیا گیا ہے۔ لیکن وقت پورا ہو چکا تھا دفعتاً طبیعت نے پلٹا کھایا اور اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے۔

یونیورسٹی میں غلّے کی فراہمی اور رسد رسانی کا پہلے پہلے انتظام مرحوم کے سپرد ہوا تو کیا دیکھتا ہوں ایک دن اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس چلے آ رہے ہیں۔ میں دیکھ کر مسکرایا تو چونکنے سے ہو گئے، پوچھنے لگے بات کیا ہے، قبلہ آپ کا مسکرانا خالی از علّت نہیں، میں نے کہا، کوئی بات نہیں، دل خوش ہو گیا۔ اس زمانے میں کسی کو اچھے لباس میں دیکھ کر یوں بھی دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے لیے کپڑے کا انتظام کر ڈالا تو میرے لیے غلّہ کی بھی یقیناً فکر رکھیں گے۔ تنک گئے بولے، حضور والا یہ سوٹ میں نے انگلستان میں سلوایا تھا، میں اسے عمداً پہن کر آیا ہوں اور اپنے دوسرے کپڑے بھی جلد جلد پہن کر دکھادوں گا تاکہ لوگ کبھی اور دیکھیں تو یہ خیال نہ کریں کہ میں نے یونیورسٹی کا روپیہ کھا کر یہ سب بنوایا ہے، اور قبلہ —— (اب حسن صاحب تیز ہونے لگے تھے) میں نے فلاں صاحب کو اپنا بینک کا حساب بھی دکھا دیا ہے کہ اتنی رقم میری اپنی ہے تاکہ آگے چل کر چہ میگوئیاں نہ شروع ہو جائیں۔ میں سنجیدہ بن گیا، اور حسن عبداللہ صاحب کو ان کی عاقبت بینی پر مبارک باد دی۔ ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ حسن صاحب اللہ آپ کی مدد فرمائے لیکن

آپ کے قیمتی کپڑوں اور بینک میں بچت کی میزان کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کپڑے منگنی کے ہوں۔ رہی بچت سو یہ بھی تو ناممکن ہے کہ آپ نے کسی سے قرض لے کر دکھا دیا ہو۔ حسن صاحب برس پڑے، کہنے لگے قبلہ اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کیجیے — کچھ اور کہنے والے تھے کہ میں ہنس پڑا اور وہ سمجھ گئے اور خود بھی ہنسنے لگے۔ بولے، قبلہ آپ کی ان ہی باتوں سے تو میں آپ کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا، ماشاء اللہ جزاک اللہ۔ میں نے کہا اچھا کرتے ہیں کہ سگریٹ نہیں پیتے، لیکن احتیاطاً عقیدت میں کبھی کبھی عقل کا کھوٹ بھی لاتے رہیے، ورنہ کچھ اور پینے لگیے گا!

پچھلے رمضان میں وائس چانسلر صاحب کے ہاں کچھ لوگ افطار پر مدعو تھے۔ افطار سے پہلے بعض اہم کاموں سے متعلق مشورہ بھی تھا۔ مرحوم بھی مدعو تھے، لیکن ابھی پہنچے نہ تھے۔ میٹنگ ہو رہی تھی اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد[1] صاحب نے حسن صاحب کی ایک فروگذاشت یاد کر کے برہمی کا اظہار کیا اور بار بار کہا۔ بات کوئی ایسی نہ تھی، لیکن جو چیز عجیب سی نظر آئی وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب اس معاملے کو رہ رہ کر یاد کرتے اور برہم ہوتے، حالاں کہ حسن عبداللہ کو موصوف بے حد عزیز رکھتے تھے اور مرحوم بھی ڈاکٹر صاحب کے فدائیوں میں تھے، میرا دل بے اختیار چاہا کہ کاش اس وقت حسن عبداللہ آجاتے، عجیب اتفاق کہ حسن صاحب آموجود ہوئے۔ سارا کام چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب نے مواخذہ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو حسن صاحب اسے معمولی بات سمجھتے رہے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں سنبھل بیٹھے۔ حاضرین میں قاضی خورشید احمد صاحب ایم۔ ایس سی علیگ مشہور ریاضی داں بھی تھے جو حال ہی میں یوپی کے محکمۂ تعلیم سے ریٹائر ہو کر علی گڑھ آئے اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ قاضی صاحب کی زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی ہے جو لوگ قاضی صاحب کی ذہانت و فطانت سے واقف ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے مواقع پر قاضی صاحب کی موجودگی کیا رنگ لا سکتی تھی۔ مرحوم نے جواب دہی شروع کی، ہر شخص خاموش تھا، صرف قاضی صاحب کبھی کبھی سر ہلا دیا کرتے تھے۔ مباحثہ میں گرمی آچلی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی طلبی دفعتاً ٹیلی فون پر ہوئی اب مطلع صاف تھا، حسن عبداللہ نے قاضی صاحب کی طرف رُخ کیا اور گرج کر بولے اور تو اور آپ کو دیکھیے کس مزے سے گردن ہلاتے تھے۔

---

1 ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (1947-1873) سابق وائس چانسلر۔

قاضی صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ لکنت مانع آئی، میں نے کہا حسن صاحب آپ سمجھتے نہیں، قاضی صاحب تو آپ کی حمایت میں گردن ہلاتے تھے۔ قاضی صاحب ٹپٹا کر تنکے کا سہارا لیا، اور بولے اور نہیں تو کیا! حسن عبداللہ اب جو گرجے ہیں تو زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا! ''قاضی صاحب کسی محفل اور مجمع میں بند ہونے والے لوگوں میں نہ تھے، لیکن اس موقع پر ایسے زچ ہوئے کہ سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ حسن صاحب نے اسی جوش و جمال میں سائیکل اٹھائی اور چل دیے، ہم سب نے بہتیرا پکارا کہ افطار کرتے جائیے، لیکن کون سنتا ہے!

کئی دن بعد ملاقات ہوئی تو ہنسنے لگے، بولے قبلہ، آپ نے خواہ مخواہ مجھے قاضی صاحب سے بھڑا دیا۔ آپ کا تو کچھ نہ بگڑا، روزے کی جھلاہٹ کی مجھے قاضی صاحب سے معافی مانگنی پڑی۔

بڑے دوست پرست تھے۔ ان کے بہت سے احباب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر تھے، لیکن وہ ان کی خاطر اور ان کی حمایت میں بڑے سے بڑے آدمی سے نبرد آزما ہونے کے لیے سر بکف ہو جاتے۔ وہ جس کو اچھا یا اپنا محسن سمجھتے تھے اس کے خلاف کبھی کچھ نہ کرتے، بلکہ اکثر بے محل اور بے جا پاس داری پر اُتر آتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ادنیٰ کارروائی پر آمادہ کیے جا سکتے تھے، یا ان کی سیرت میں کوئی بنیادی خامی تھی۔ وہ جذباتی آدمی تھے، جذباتی آدمی بالعموم مخلص ہوتا ہے، اس کے دل میں کھوٹ کپٹ کا بڑی مشکل سے گزر ہوتا ہے۔ طبعاً وہ عوام کے آدمی تھے اور چھوٹوں کی حمایت میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت بھاتی تھی!

میرا وہ بہت خیال کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا، اور جس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی یہ حالت ہوتی ہے اس کے مرنے کا مجھے بڑا غم ہوتا ہے، لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں، اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کے بوڑھے باپ، بوڑھی ماں، بھائی پر فدا ہونے والی بہنوں، نیک نفس بیوی اور معصوم بچوں کو ہوگا۔ ایسوں کا غم، اور ایسا غم اس رحمت بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے، جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے! میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں۔

●●●

جگر مرادآبادی

(1890-1960)

سید علی سکندر جگر مرادآبادی 1890 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید علی نظر تھا۔ داغ، امیر اللہ تسلیم اور رام پوری سے تلمذ رہا۔ جگر صاحب چشمہ کا کاروبار کرتے تھے۔

جگر جب بھی علی گڑھ آتے رشید صاحب کے گھر ہی ان کا قیام رہتا، رشید صاحب ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اصغر گونڈوی کا بھی رشید صاحب کے یہاں قیام رہتا تھا۔ رشید صاحب جگر اور اصغر دونوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

جگر صاحب رشید صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔

رشید صاحب جگر کی غزل گوئی کے معترف تھے۔ جگر کے مجموعہ کلام پر ان کا مقدمہ ''جگر میری نظر میں'' جگر کی شاعرانہ خوبیوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔

جگر کا 1960 میں انتقال ہوا۔ جگر کے دو شعری مجموعے ہیں: (1) آتشِ گل (2) شعلۂ طور۔

o

جگر صاحب وہاں پہنچ گئے جہاں ایک نہ ایک دن ہر اس متنفس کو پہنچنا ہے جو زندگی کے مرض الموت میں گرفتار ہے، اس دنیا میں موت بھی کتنی سستی، یقینی ہر جگہ ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہوا پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لیے کتنی ضروری ہے!

فطرت بہت سے معاملات میں کسی نہ کسی شرط پر انسان سے خوش و ناخوش مفاہمت کر لیتی ہے، صرف موت کے مسئلے پر آج تک کسی طرح کی مصالحت پر تیار نہیں ہوئی۔ انسان اور موت کے دیرینہ رشتے و روایات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ ارضی سطح پر آئندہ کبھی مفاہمت نہ ہو سکے گی۔

لیکن اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت کبھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں۔ وہ انسان کو تسخیر بھی کس طرح کر سکتی ہے جب انسان سوا ازلی و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجے میں متصف ہے جو خدا کے ہیں جن کے طفیل وہ اس زمین پر خدا کا نمائندہ اور نائب ہے، اور کیا معلوم بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان خدا میں ازلی اور ابدی بھی ہے!

موت مامور و مجبور ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے، اپنے کو بدل نہیں سکتی۔ انسان کو یہ شرف حاصل ہے وہ توفیق الٰہی، اور استعداد انسانی کے مطابق اپنے کو بہتر او برتر بنا سکتا ہے۔ لامتناہی حد تک بہتر و برتر! موت کی یہ شکست مسلم ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچنے کا حوصلہ کر سکیں تو محسوس

ہوگا کہ انسان موت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے اور رہے گی۔ بڑا انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے۔

لیکن اس وقت مرحوم کی وفات سے (کسی عزیز کو پہلی بار مرحوم کہہ کر یاد کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے) ان ساتھیوں اور صحبتوں کی کیسی کیسی یاد تازہ ہو رہی ہے جن سے کبھی اپنی، کبھی ان کی، کبھی دوستوں کی زندگیاں خوشی سے معمور اور اُمنگوں سے لبریز رہا کرتی تھیں۔ کہیں گہری کہیں ہلکی، یہ یاد ماضی کے 35-30 سال کی وسیع دھوپ چھاؤں پر محیط ہیں، جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں پایا ہے لیکن کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے بیان کرنے میں مصلحت تامّل کرے۔ غفلت میں چاہے وہ بیماری سے ہو چاہے شراب سے، تنگ دستی و درماندگی کا سابقہ ہو یا ثروت و شہوت کا نشہ، انسان کی زبان سے بعض ان غیر مستحسن جذبات اور خیالات کا اظہار ہو ہی جاتا ہے جو اس کے تحت الشعور میں پیدا ہوتے ہیں۔ جگر صاحب ان تمام مراحل سے ثابت قدم گزرے۔ ادنیٰ لوگوں میں ادنیٰ درجے کی تیز و تند شراب کثرت سے پی کر مدہوش ہو جانا لیکن زبان سے کسی ناسزا کلمے کا نہ نکلنا معمولی بات نہیں ہے۔ جگر صاحب پر تھوڑی سی اور ہلکی شراب پی لینے کا اثر بہت جلد اور معمول سے زیادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس شخص کے بطون میں کوئی چور دروازہ ہی نہ ہو جس سے کوئی ناروا خیال یا خواہش داخل ہو جاتے یا اس طرح کا کوئی خیال یا خواہش پہلے سے جاگزیں ہو تو موقع پا کر باہر نکل آئے، یہ صفت کم لوگوں میں ملے گی!

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بڑے شاعر اور فن کاروں کو ہم میں سے بہتوں نے دیکھا ہوگا یا ان کے حالات سنے اور پڑھے ہوں گے۔ باوجود اس کے کہ ان کا کلام مدتوں سے اشتیاق و احترام سے پڑھا سنا اور سراہا جاتا ہے ان میں ایسے بھی ہیں جن کی سیرت و شخصیت جہاں تہاں سے داغ دار ہے، لیکن ان شعرا اور فن کاروں کی عظیم الشان شخصیت کی منزلت اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ ان کی سیرت کی خامیوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے ہمارے کتنے بڑے شاعروں کی بعض کمزوریوں کو اُجاگر کرنے کی کیسی کیسی کوشش کی گئی اور اب بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑائی میں مطلق فرق نہ آیا البتہ یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ شاعر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے قابو

میں چلا گیا یا بعض تقاضوں کے پیشِ نظر اس نے ان صلاحیتوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ بہ صورت اوّل وہ ہمدردی کا، بہ صورت دیگر ستائش کا مستحق ہوتا ہے۔

ان کے مقابلے میں یہاں اپنے ان چار غزل گویوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اب تک اس صدی میں جدید اردو غزل کی خوب صورت مستحکم اور ایک طور پر کثیر المقاصد، عمارت کے چار عظیم معیار مانے جاتے ہیں۔ یعنی حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور جگرؔ۔ ان کا شعری یا سکونتی تعلق کسی 'دلی، صفاہان یا سمرقند' سے نہیں تھا۔ ذرا دور سے اور بلندی پر جا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ فیضان سرسید، ان کے رفقائے کرام اور علی گڑھ تحریک کا ہے۔ علی گڑھ نے شعر و ادب کے جغرافیائی دبستان ختم کر دیے۔ ان چاروں نے نہ تو کوئی مینوفیسٹو شائع کیا، نہ زندگی و ادب کے اسرار و معارف کو الم نشرح کرنے کے لیے کوئی عالمی کانفرنس منعقد کی، نہ تشہیر و تبلیغ کا کوئی ادارہ یا محاذ قائم کیا۔ نہ جلسے جلوس سے کوئی واسطہ رکھا۔ صرف جہاں تہاں مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہے، ایسے مشاعروں میں بھی جہاں شعرا اور سامعین دونوں کی آبرو خطرے میں رہتی ہے۔ بایں ہمہ انھوں نے اردو غزل گوئی کی اس طرح تطہیر و توسیع کی اور اس کو ایسا ترفّع بخشا اور زندگی و ادب کے صالح تقاضوں کے پیشِ نظر اس میں توانائی اور دل آویزی پیدا کی کہ اس کے سامنے اردو شاعری کی دوسری اصناف ماند پڑ گئیں۔ یہ کم عجیب بات نہیں ہے کہ یہ شعرا اپنی اعلیٰ تخلیقات سے نہیں بلکہ اعلیٰ سیرت و شخصیت کے اعتبار سے کم و بیش نصف صدی تک باوجود طرح طرح کے موانع کے یکساں طور پر ممتاز و محترم رہے!

غزل کی یہ مقبولیت موسمی، مقامی یا اتفاقی نہ تھی جیسی فلمی گانوں کی ہوتی ہے جو بالعموم ادنیٰ طبقے کے نوجوان، ہر طبقے کی عورتوں اور گلی کوچے میں پھرنے والے کسمپرس نادان بچوں یا ان طالب علموں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں جو خاندان کی روایات سے بے بہرہ، سوسائٹی کی ذمے داریوں سے ناآشنا ماحول کی خرابیوں کے شکار اور اچھی تعلیم و تعلیم گاہوں کے فیض سے محروم ہوتے ہیں۔ ان چار درویشوں نے سیاست کے سستے نعروں سے بھی اپنی دکان نہیں سجائی تھی لیکن ان کا کلام خواص و عوام کے دلوں میں گھر کر لیتا تھا اور اثر دکھاتا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف میں جب طبائع پورے طور پر سیاست اور سائنس کی گرفت میں آ چکی تھیں اور

پرانی قدروں کا احترام برائے نام باقی رہ گیا تھا، جب دور ونزدیک یکساں ہو گئے تھے، غزل کو ایسی آبرو بخشا کہ وہ دوسرے ملکوں کے شعروادب کے سامنے اپنا سر اونچا رکھ سکے، اور ہم میں جو صدیوں سے محکوم ومنکوب تھے احساس کمتری نہ پیدا ہونے دے ان شاعروں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا یہ تصرف اس صنف کلام پر تھا جو بہت تنگ ومحدود اور بعض حلقوں میں نامسعود سمجھا جانے لگا تھا!

مجھے جگر صاحب کے خاندان کا حال نہیں معلوم، کتنی تعلیم تھی، کس بزرگ کے مرید یا کس سلسلۂ طریقت یا مسلک سیاست سے تعلق رکھتے تھے، اس طرح کی باتوں میں سے کسی کا علم نہیں۔ جس سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی اس کے بارے میں ان باتوں کی کھوج لگانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ مرحوم کی رحلت سے آج بڑا پرانا گہرا اور مخلصانہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ عمر کی جس منزل میں ہوں، وہاں اس طرح کے رشتے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے لیکن کیا کروں فطرت کے اس طرح کے تقاضوں کو محبت اور رفاقت کے تقاضے تسلم کرنے سے عاجز و قاصر رہے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ میرے اس قصور میں کتنے اور بدنصیب شریک ہوں گے؟

مدتِ حیات کا حساب کتاب سال اور ماہ کے گزرنے سے نہیں کرتے، عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے ہیں۔ وہ اُٹھا لیے جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ختم ہوگئی، عمر چاہے جہاں تک پہنچے۔ عمر پانے کو زندہ رہنا نہیں کہتے۔ زندگی اپنی زندگی سے اتنی عبارت نہیں ہوتی جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں تو زندہ رہنا اور نفس کے مطالبے پورے کرتے رہنا ایک مسلسل بے غیرتی اور بڑھتی ہوئی تنہائی اور تاریکی ہے جس کو نہ چھپا سکتے ہیں، نہ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے حق بجانب بھی نہیں قرار دے سکتے۔

جگر صاحب میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی مغفور کے علاوہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے لیے وہ اتنا اخلاص و احترام ملحوظ رکھتے ہوں جتنا میرے لیے۔ اصغر صاحب سے تو ان کی عقیدت بندگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ شاید ہی وہ کسی اور کے یہاں اس محویت ومسکنت کے عالم میں پائے گئے ہوں جتنا اصغر صاحب کے 'حضور' میں، اصغر صاحب

بھی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ جگر صاحب کی مجھ سے وابستگی یہیں سے شروع ہوئی تھی جس کو آخر وقت تک انھوں نے جس طرح بنایا اس کا خیال کرتا ہوں تو دل عجیب عجیب طرح سے بے قرار ہونے لگتا ہے!

جگر صاحب کے اس خلوص و محبت کو میں نے نباہنے کی برابر کوشش کی۔ لیکن مرحوم ان یر معمولی شریف اور فیاض انسانوں میں تھے جن کی مسلسل 'نوازشہاے پیدا و پنہاں' کا ساتھ ینے سے ہمیشہ قاصر رہا۔ روپے پیسے، مال و متاع سے کوئی سلوک کرے تو اس کا بدلہ کر دینا آسان ہے لیکن جو شخص (وہ بھی جگر صاحب جیسا شخص) محبت و احترام کی بے کراں نعمتوں سے کسی کو بہرہ مند کرے اور رکھے اور کسی وقت غافل نہ رہے، اس سے کون عہدہ برآ ہو سکتا ہے! جگر صاحب کے پاس جو دولت تھی اور جسے وہ مجھ پر بے دریغ صرف کرتے تھے اس سے مبادلہ کے لیے میری ہر دولت نا قابل التفات تھی۔

جگر صاحب کی محبت بھی عجیب محبت تھی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ میں ان کی رارات میں کوئی حصہ نہ لوں۔ اس خیال سے کہ مجھے زحمت نہ ہو۔ اس سب سے ایک طور پر جگر صاحب سے اتنا اور اس طرح قریب نہ ہو سکا کہ ان کی ذہنی واردات اور رنج و راحت کے حرکات سے براہ راست اور پورے طور پر واقف ہو سکتا۔ اس سے شرمندہ ہوں، عقیدت و محبت کا پورے طور پر مستحق نہ ہونا۔ لیکن اس کا مورد رہنا شریف آدمی کے لیے اتنا ہی باعث خلش رہتا ہے، جتنا ایک گناہ گار کے لیے جو اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ کہیں بے نقاب نہ ہو جائے۔ یاد نہیں آتا انھوں نے اپنی تکالیف یا نجی دشواریوں کا کبھی کسی عنوان سے مجھ سے تذکرہ کیا ہو۔ شاعروں میں ان کے کلام کو جس خلوص سے سراہا جاتا اور خود ان کی پذیرائی جس عزّت و محبت کے ساتھ کی جاتی اس کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ایسے شعرا سے بھی واقف ہوں جن کے کلام سے مشاعروں میں دھوم مچ جاتی اور ان کا کلام سننے کے لیے لوگ سراپا شوق و انتظار ہوتے، یکن ذوق یہ ہوتا کہ سامعین جگر صاحب کی موجودگی سے اور ان کو دیکھ کر جتنے خوش ہوتے اور فخر کرتے دوسروں کی موجودگی سے نہیں۔ آخر آخر میں معذوریوں کے سبب سے وہ اپنا کلام اچھی طرح سنا بھی نہیں سکتے تھے، جب بھی لوگ خوش ہوتے کہ جگر صاحب نے ان کے لیے

مشاعرے میں شرکت کی زحمت گوارا کی، انھوں نے جگر صاحب کو دیکھ لیا اور ان کا کلام ان کی زبان سے سن لیا۔ یہ امتیاز اس صدی میں اردو کے شاید کسی غزل گو کو نصیب نہیں ہوا!

جگر صاحب سے لوگوں کو جیسے مذہبی ارادت وعقیدت ہو۔ میر انیسؔ اور اقبالؔ سے اس طرح کی شیفتگی تو سمجھ میں آتی ہے۔ جگر صاحب سے اس شغف کو کس چیز پر محمول کروں۔ ان کے یہاں مذہب، سیاست، اخلاق، فلسفہ، تصوف، طنز وظرافت کسی کو بھی تو دخل نہیں، ابتدائی عہد کے کلام سے قطع نظر عشق و عاشقی کا بھی وہ رنگ نہیں ملتا جو عام طبائع کے لیے باعث کشش ہوتا ہے۔ پھر اس کے سوا اور کیا کہوں کہ ان کے کلام ہی میں 'ماورائے سخن اک بات' نہ تھی، ان کی شخصیت میں ماورائے شخص بھی اک بات تھی۔

جگر صاحب بحیثیت مہمان تشریف لاتے تو بہ یک وقت کتنی خوش گوار باتوں کا احساس ہونے لگتا، جیسے کوئی بھولی ہوئی لطیف خوشبو آ گئی ہو۔ زندگی کی نعمتیں اچھی، اس کے مصائب گوارا اور آلودگیاں قابل احتراز معلوم ہونے لگتیں۔ جگر صاحب کے چاہنے والے دو ایک دن پہلے سے گھر کا چکّر لگانے لگتے تھے۔ وہ آ جاتے تو دن رات ان کو گھیرے رہتے۔ جگر صاحب کے اس 'حلقے' یا 'دربار' میں مَیں کبھی مخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے جانتے تھے اس لیے جب ہجوم ختم ہو جاتا تو صرف یہ اطلاع بھجوا دیتے کہ ملاقاتی رخصت ہو گئے۔ میں پہنچتا تو جیسے سر سے پاؤں تک فرطِ تکریم وتشکّر سے جگمگانے لگے ہوں، بے اختیار کھڑے ہو جاتے اسی بے اختیاری سے فوراً بیٹھ جاتے، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کی چیزیں بے ضرورت ادھر اُدھر رکھنے لگتے۔ بیٹھ جاتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے اور مسکرانے لگتے جیسے اپنے اس مسکرانے کی شمیم وشبنم کے تخت رواں پر مجھے بٹھا دینا چاہتے ہوں۔

جگر صاحب شکل وصورت کے اچھے نہ تھے لیکن اس وقت ان کا مسکرانا اور کبھی رہ رہ کر ہنس پڑنا اور جلد ہی کچھ کہنے لگنا تا کہ میں ان کے اس اضطراب وانبساط کو جان نہ سکوں ایسا دل نشیں اور قابل فخر واحترام محسوس ہوتا کہ میں اس وقت اس کو کسی تشبیہ واستعارے سے بھی واضح نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اس کو کسی حسین دوشیزہ یا معصوم سے معصوم تندرست بچے کے مسکرانے اور ہنسنے سے بھی تشبیہ دینا ناکافی سمجھتا ہوں! جگر صاحب اچھی صورت کے ہوتے تو

شاید اتنے اچھے نہ معلوم ہوتے۔ جگر صاحب ہی پر موقوف نہیں کوئی اور بھی ہوتا تو اتنا دل آویز نہ معلوم ہوتا۔ سیرت کا حسن دنیا کے تمام دوسرے حسن سے افضل ہوتا ہے۔ یہ بات جتنی سچی اور پکی ہے افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس اور یقین ہوتا ہے۔

جگر صاحب جتنے مذہبی آدمی تھے اتنے ہی اخلاقی بھی! ایسا ہونا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے بالخصوص ایسے لوگوں کے لیے جو اصلاً نہیں اصطلاحاً مذہبی ہوتے ہیں۔ ہر مذہبی آدمی اخلاقی آدمی نہیں ہوتا۔ خودغرض یا ناواقف مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علاحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علاحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا اس لیے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علاحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب عورت بغیر شوہر ہے!

خودغرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں۔ جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلم رَو میں آ جاتے ہیں، وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اُترنے کے لیے جو زینے ہیں ان میں پہلا اخلاق پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست قومیت اور تجارت ہیں۔ موخرالذکر تین کا نامسعود اتحاد آج عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے!

مذہبی ہونے کا علمی و کتابی تصور واضح کرنے کے لیے خاص طرح کی لیاقت درکار ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ اپنے طور پر پابندی کر پاتا ہو یا نہیں کوئی ایسی بات سننا اور دیکھنا گوارا نہ کر سکے جو خدا اور اس کے رسول کے خلاف کسی کے منہ سے نکلے یا جس سے شعائر اسلام کی سبکی ہوتی ہو۔

بہت دنوں کی بات ہے علی گڑھ میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ احباب کی ایک صحبت میں ہر طرح کی باتیں بے تکلفی سے ہو رہی تھیں۔ ایک دوست موجود تھے جو مسلمان کہلاتے تھے لیکن

خدا رسول اور احکامِ دین کے قائل نہ تھے ایک دوسرے صاحب بھی تھے جو ہم میں اپنی اُول جلول حرکتوں اور بھولے پن کے لیے باعث تفریح رہا کرتے تھے۔ گفتگو کے دوران میں پہلے کی زبان سے مذہب کے بارے میں کچھ استہزائیہ کلمے نکل گئے۔ باولا برافروختہ ہو کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا توبہ کرو اور معافی مانگو نہیں تو تمہاری خیر نہیں! انھوں نے سٹ پٹا کر کہا تم بھی تو اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ جوش میں آ کر کچھ رو کر باولے نے جواب دیا۔ میری بات اور ہے خدا رسول تو میرے ماں باپ بھائی بہن ہیں، میرے جی میں جو آئے گا کہوں گا تیرا تو ان سے کوئی رشتہ نہیں تو میرے سامنے میرے ماں باپ بھائی بہن کی کیسے توہین کر سکتا ہے۔

جگر صاحب کا علی گڑھ اور الٰہ آباد کا وہ زمانہ یاد ہے جب وہ زیادہ تر مخمور اور بدحال رہتے تھے۔ لیکن دین یا ائمہ دین کے خلاف کوئی فقرہ کان میں پڑ جاتا تو بدمستی کا پورا زور اس پر صرف کر دیتے جس کی زبان سے وہ کلمہ نکلا ہوتا ایسا معلوم ہوتا جیسے ان پر شراب کے نشے کے بجائے کوئی عالم طاری ہو گیا ہو، مذہب ان کی نہاد میں تھا جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی اس طرح کر جاتے کہ بڑی نزاکت کا سامنا ہو جاتا۔ اس سے جگر صاحب نے نقصان اُٹھایا ہو یا نہیں وہ لوگ فائدہ اُٹھا لیتے تھے جن کی نیتوں میں فتور ہوتا۔

کہیں کا سفر کتنا ہی ضروری ہوتا، علی گڑھ سے گزرتے تو دو ایک دن میرے ساتھ ٹھہرنے کی گنجائش نکال لیتے۔ حج سے واپس آ چکے تھے۔ ایک دن سہ پہر میں چائے پی رہے تھے۔ حسبِ معمول کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ فرمانے لگے مدینہ طیبہ میں ایک دن چائے کی پوری پیالی اوپر آ رہی، لیکن کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب بول اٹھے، جگر صاحب فکر شعر میں غرق رہے ہوں گے، خبر نہ ہوئی ہو گی۔ جگر صاحب نے جواب دیا کیا کیجیے گا آپ کو اس طرح تعبیر کی توفیق ہوئی! پھر ہنس پڑے اور بولے، پرانا زمانہ کیا بُرا تھا جب تعبیر کرنے کی ہر کس و ناکس کو آزادی نہ تھی۔ اس کے لیے کہ معتمد اور منتخب ہی لوگ ہوتے تھے!

جگر صاحب پر بعض زمانہ بڑی سختی کا گزرا ہے مالی دشواریوں کے سبب سے پریشان رہتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے کسی اور سے کیا ہو یا نہیں مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ یہ بڑی آزمائش

کا مرحلہ ہوتا ہے۔ سیرت میں کہیں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو تنگ دستی میں بالضرور اور بڑی شدت سے اُبھر آتی ہے۔ معمولی اشخاص کا کیا ذکر وہ تو ذرا سے فشار سے بکھرنے لگتے ہیں، اچھے اچھوں کو اس منزل میں ڈگمگاتے دیکھا ہے۔ ایسے زمانے میں بھی جگر صاحب اچھا کھاتے تھے، اچھا پہنتے تھے، اچھی طرح خود رہتے تھے اپنے مہمانوں کو رکھتے تھے۔ کسی پر بُرا وقت آپڑتا تو اپنے اوپر سختی جھیل کر اس کی مدد کرتے۔ اس دورِ ابتلا میں بھی لوگ ان کو طرح طرح سے دھوکے دیتے اور زیر بار کرتے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو دوسروں نے اتنا لوٹا کھسوٹا ہو جتنا کہ جگر صاحب کو، اور ایسے لوگ تو شاید ہی ملیں جو اپنے اس طرح لوٹے کھسوٹے جانے کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔

جگر صاحب کسی کی درخواست رد نہیں کر سکتے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ درخواست کرنے والا جھوٹا ہے آخر آخر میں تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ لوگ مانگنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے جس کا جب جی چاہا جس چیز کو چاہا لے گیا۔ جگر صاحب یہ سب دیکھتے لیکن کسی طرح کا خیال نہ کرتے۔ ایک بار میں نے ذرا تلخ ہو کر پوچھا، جگر صاحب آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، مسکرا کر اور عجیب معصوم انداز میں فرمانے لگے کیا کروں، نہ کسی سے انکار کر سکتا ہوں اور نہ اس کو شرمندہ دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے ذرا کم شریفانہ انداز میں کہا، اس کے بعد آپ یہ بھی چاہتے ہوں گے کہ میں آپ کی یا اس کی درازیِ حیات کی دعا بھی مانگا کروں بڑے مزے سے ہنسے اور جگر صاحب کب نہیں مزے سے ہنستے تھے!

بڑے باوضع آدمی تھے، جس سے خلوص کے مراسم ہو گئے تمام عمر کے لیے اس پر مہر لگ گئی۔ علی گڑھ میں تین چار گھرانے ایسے تھے جن سے عزیزانہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ آتے تو چاہے کتنے ہی موانع ہوں ان کے گھر ضرور جاتے۔ وہ جس طرح کی فرمائش کرتے قبول کر لیتے خواہ اس میں ان کو کتنی ہی تکلیف ہوتی، جہاں جاتے اہتمام سے جاتے، نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، کبھی تحفے کے طور پر کچھ لے کر، مدت دراز سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ آخر آخر میں جب صحت خراب رہنے لگی تھی تو میں اس طرح کی دید و باز دید سے روکتا۔ ہر طرح کا اہتمام کرنے کے بعد پانوں کی ڈبیہ بھروا لے کر کسی کے ہاں جانے کے لیے تیار ہوتے اور اتفاقاً میں نکل آتا تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے کوئی بچہ قصور کرتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ منع کرتا تو فوراً

مان جاتے وہ بھی اس طرح جیسے واقعی مان گئے ہوں۔ اندر آجاتا تو تھوڑی دیر بعد اسی اہتمام کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہو جاتے جیسے بچوں کو کسی کام سے منع کیجیے تو خوش و ناخوش اس وقت تو مان جائیں گے لیکن موقع ملتے ہی وہی کریں گے جو کرنے والے تھے۔ جگر صاحب کا بچوں کا سا یہ انداز بڑا پُر لطف معلوم ہوتا تھا بالخصوص اس وقت جب کہ بعد میں بچوں سے بھی زیادہ معصوم یعنی اپنے انداز میں اس کی ٹوٹی پھوٹی معذرت کرتے!

جگر صاحب جانتے تھے کہ بہ طیّب خاطر میں کسی شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتا اور اس بات سے اور زیادہ بد حظ ہوتا ہوں کہ خود شاعر بے تکلف ہو کر بہ ادنیٰ اشتعال، جس کا مرتکب بھی اکثر وہ خود ہوتا، شعر سنانے لگے! اسے آپ میری بدتمیزی پر محمول کریں یا شاعری کی یا دونوں کی کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ بات یہ ہے کہ بعض صوری یا معنوی اعتبار سے (صوری زیادہ معنوی برائے نام) شعر سننے اور داد دینے کے لیے بالعموم میرا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ پورا مصرع درکنار اس کا جُزتک اُٹھانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں الفاظ یا اعراب وغیرہ کا اُلٹ پھیر نہ ہو جائے۔ جب تک شاعر دوسرا مصرع پڑھتا ہے اور اکثر بار بار اور دیر تک پڑھتا رہتا ہے پہلا بھول چکا ہوتا ہوں اس لیے پورے شعر کی داد دینے کے لیے طرح طرح کے سامعین کا منہ تکنا پڑتا ہے اور جلد سے جلد فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان میں کون حلوے مانڈے کی غرض سے آیا ہے، کون میزبان کو ایصالِ ثواب کرنا چاہتا ہے، کون شاعر کو ضرب شدید یا خفیف پہنچانے کا تہیہ کر رہا ہے اور کون مجھ کو محفل سے باہر نکلنے کا چیلنج دے رہا ہے۔ اس کے بعد کہیں میرا منہ اس قابل ہوتا ہے کہ شاعر کو دکھا سکوں۔ دوسری اور سب سے بڑی آزمائش میرے لیے یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی میں شعر سے متاثر ایک طرح ہوتا ہوں لیکن داد دوسری طرح دینی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ اس کش مکش میں کہیں مقدم موخر نہ ہو جائے! چنانچہ جہاں کہیں اس کا خطرہ ہوتا ہے کہ شاعر اور اس کے کلام دونوں کی کرامات پر سب سے پہلے مجھے ایمان لانا پڑے گا اور اعلان بھی کرنا پڑے گا۔ میں داد دینے والا ساتھ لے جاتا ہوں جس کی مجھے خاصی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ داد دینے والے سے طے یہ رہتا ہے کہ وہ اس طرح داد دے گا کہ اگر میں دینے لگوں تو کوئی سُن نہ پائے یا دینے والا ہوں تو ہمت نہ پڑے!

غالباً فروری 1959 کی آخری تاریخیں تھیں۔ 'آتش گل' پر جگر صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا تھا۔ جیسا کہ قاعدہ بنا رکھا تھا، دلّی سے واپسی پر میرے ہاں ٹھہر گئے۔ یہ ان کا علی گڑھ میں آخری قیام تھا۔ صحت کافی گر چکی تھی لیکن طبیعت بشاش تھی، معمولات میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ دوستوں کی آمدورفت، مقررہ گھرانوں پر حاضری، طالب علموں سے ملاقات، بچوں سے تفریح بدستور تھی۔ صبح کا وقت تھا، صحن میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے خلاف معمول مجھے اندر سے بلوا بھیجا۔ آیا تو جگر صاحب کو غیر معمولی طور پر شگفتہ پایا، جیسا کہ ان کا قاعدہ تھا۔ مسکرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہی سر سے پاؤں تک شوق و شیفتگی کا عالم۔ کچھ رُک کے پھر بے اختیار بول پڑے، آج میں نے آپ کو تکلیف دینے کی جرأت کر ہی ڈالی۔ میں نے کہا جگر صاحب، اچھا کیا مجھے بھی تو یہ کہنے کا فخر حاصل ہوا کہ آپ نے بلا بھیجا۔ خوش ہو گئے، میں بیٹھ گیا۔

جگر صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ میری طبیعت کچھ دنوں سے خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن انھوں نے آج نہ پہلے کبھی یہ پوچھا کہ میں کیا ہوں کیا کرتا ہوں کیا کرنا چاہیے، بچے کہاں ہیں، کیا کرتے ہیں، کس کی شادی ہوئی ہے، کس کی نہیں، کون پاکستان میں ہے، کون ہندوستان میں، کتنے بے روزگار ہیں، کتنے نہیں، مشیّتِ الٰہی یا حکومت کی پالیسی کیا تھی جس پر مجھے صبر کرنا چاہیے یا بغاوت جیسا کہ اس طرح کی باتیں ملاقات کے وقت کے لیے لوگ عموماً حفظ کر رکھتے ہیں۔ وہ صرف دیکھ کر اس طرح خوش ہو جاتے جیسے یہ تمام باتیں پوچھ لیں اور مطمئن ہو گئے اور مجھے مبارک باد دے ڈالی۔

یاد نہیں آتا کون کون سی غزلیں سنائیں۔ اس صبح کو انھوں نے جس درد اور وارفتگی سے اپنا کلام سنایا اس سے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آج میری تمام عمر کی محبت کا صلہ دینے کی کوشش کر رہے ہوں، جس سے بڑا صلہ ان کے پاس دوسرا نہ ہو۔ جیسے سب سے بے تعلق ہو کر میرے لیے اپنے کو اپنے ہی نغمے میں ضم اور ختم کر دینا چاہتے ہوں! سنانا ختم کرتے ہی مسکرا کر اور بات چھیڑ دی جیسے یہ سنانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور یہ سب محض اس احتیاط کے پیشِ نظر کہ اگر اس کا کوئی غم گین اثر مجھ پر ہوا ہو جلد سے جلد زائل ہو جائے!

اس وقت یہ بحث پیشِ نظر نہیں ہے کہ ہمارے شعرا مشاعروں میں لحن سے پڑھتے ہیں تو اچھا کرتے ہیں یا بُرا۔ یہاں تو صرف جگر صاحب کے پڑھنے کا سوال ہے، بعض اصحاب، مرحوم کے کلام کی تاثیر کو کبھی کبھی ان کی خوش الحانی پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کی آواز اور پڑھنے کا انداز ہمیشہ ان کے کلام کا جزو معلوم ہوئے۔ مرحوم کے کلام اور پڑھنے کے انداز و آواز میں غیر معمولی ہم آہنگی ملتی تھی۔ جیسے: بے جام ظہور بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں!

یاد آتا ہے کہیں میں نے اس طرح کی بات لکھی ہے کہ اصغر گونڈوی مرحوم کے کلام کو پڑھتا ہوں تو اصغر صاحب سامنے آجاتے ہیں اور اصغر صاحب کا تصور کرتا ہوں تو ان کا کلام یاد آنے لگتا ہے۔ جگر صاحب کا کلام ان کی آواز ہے اور ان کی آواز ان کا کلام! کہیں یوں بھی سنا ہے کہ آواز کلام اور کلیم کو ایک ہی مانتے ہیں!

جگر صاحب کے جذبات تیز و تند تھے، اسی اعتبار سے وہ سریع الحس بھی تھے۔ کوئی واردات ہو خارجی یا داخلی، دور ہو یا نزدیک شخصی ہو یا اجتماعی اسے بہت جلد اور بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہ بات دوسرے شاعروں میں بھی مل سکتی ہے لیکن اکثر اس فرق کے ساتھ کہ جذبات کتنے ہی تیز و تند ہوں جگر صاحب کے شریفانہ شاعرانہ تصرف سے وہ اپنی قباحتیں اور کثافتیں کھو دیتے ہیں، زور قائم رہتا ہے اور اثر بڑھ جاتا ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ شاعر میں اکثر اس طرح بھی امتیاز کرتے ہیں کہ کس کے یہاں کون چیز کیا بن گئی۔ اعلیٰ اسفل میں جا گرا یا اسفل کو اعلیٰ کی طرف رہبری ملی۔

شاعر کے ظرف و ذوق کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ عورت اور متعلقہ جذبات کا کس طرح اظہار کرتا ہے۔ وہ عورت کو جسم کی لذت کا صرف ایک وسیلہ سمجھتا ہے یا اس کو ایک قدر اعلیٰ اور ایک ذمے داری بھی مانتا ہے۔ جگر صاحب کے محرکات شعری میں عورت کا عمل دخل کم نہیں ہے لیکن اتنا ہی عورت کا احترام اور اس سے عشق کا ارتفاع بھی ملتا ہے۔ یوں بھی وہ کسی جذبہ فکر یا خیال کو مرتفع کیے بغیر نہیں پیش کرتے۔ شاعری اور شاعر دونوں کی بڑائی اسی میں ہے۔ بعض شاعر ہر طرح کے جذبات و خیالات کو جوں کا توں پیش کر دینا شاعری کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بھول بدنیتی ہے!

ضمناً یہاں ایک بات کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے بعض افراد اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کی فنی چابک دستی میں شبہ نہیں لیکن وہ اپنے جذبات و واردات کو ظاہر کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور اس کو اپنی خامی نہیں شاعری کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ شہوت، غصہ، نفرت، خودنمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں اور کم و بیش ہر انسان میں ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے۔ جو محسوس کرے اس کو ظاہر کرے قرین فطرت یقیناً ہے قرین انسانیت نہیں ہے۔ اپنی خامی کو شاعری کا تقاضا سمجھنا نالائقی کی علامت ہے۔ انسان کا انا الحق کہنا ایسے میں غلط نہیں ہے۔ تلاش معرفت میں بعض فقرا یا صوفیہ پر یہ واردات طاری ہوئے ہیں، لیکن ان واردات اور ان کے اظہار کو دلیل کم نظری و کم ظرفی قرار دے کر کہنے والے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سوا الہام کے جو خدا کی طرف سے صرف اس کے رسول پر نازل ہوتا ہے اور رسول اس کو بجنسہٖ اُمت کو پہنچا دیتا ہے، کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو شاعر کے دل میں آتا ہو اور وہ اس میں حسب ضرورت تصرف کیے بغیر ہم تک پہنچا دیتا ہو۔ یہ تمام تر شاعر کے ذوق اور ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس خیال کو کس مقصد سے کس شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہ سرشت کا اچھا، فن سے واقف، زبان کا رمز شناس ہے، کہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور صحیح موقع و محل کو پہچانتا ہے تو اس کی بات موثر مفید اور دیرپا ہوگی اگر اس میں یہ صفات نہیں ہیں تو یہ شاعری نہیں کچھ اور ہوگی جس کو آپ شاعر کی نارسائی یا نالائقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعر ڈاک خانہ، تار گھر، ریڈیو نہیں ہوتا جو صرف خبر رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ فن کار اور معلّم کی حیثیت سے حسن و صداقت کا داعی ہوتا ہے، اردو شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالیے اور ہر شاعر کے کلام کی عمر اور انجام کو اس پیمانے سے ناپ لیجیے۔ یوں دنیا میں کوئی نالائق یا نالائقی ایسی نہیں ہے جس کے لیے کوئی سندِ جواز نہ تصنیف کی جا سکے!

جگر، اصغر اور فانی ان سر آمد غزل گویوں میں ہیں جن کا کلام ان مخصوص صحبتوں میں بھی بے تکلف پڑھا اور لطف سے سنا جا سکتا ہے جہاں رند، پارسا، خُرد و بزرگ، ماں، بیٹیاں،

بہن، بہو بیوی بیک وقت موجود ہوں اور محفل ثواب کمانے کے مقصد سے نہیں تفریح و انبساط خاطر کے لیے منعقد کی گئی ہو۔ آج اس طرح کی بات کسی شاعر کی بڑائی میں بیان کرنا خود مجھے اپنے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے اسے مضحکہ خیز بھی سمجھیں تو کیا عجب! ان میں جگر صاحب کو یک گونہ اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں سے زیادہ جذبات کی بعض نزاکتوں کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔

فانی کا جہان ہی دوسرا ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کی دشواریاں پیش نہ آتی ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ وہ سرتاپا الم ہیں لیکن اتنے غم گین شخص نہیں ہیں جتنے غم گین شاعر ہیں۔ غم کا ذکر انھوں نے جس رکھ رکھاؤ سے کیا ہے اس سے غم، غم نہیں رہا ایک انداز فکر، آرٹ یا عبادت بن گیا۔ ان کے ہاں غم کا انداز بین و بکا کا نہیں عرفان و ایقان کا ہے۔ بڑھی ہوئی داخلیت کے سبب سے کہیں کہیں وہ الفاظ کے اُلٹ پھیر سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن یہ شعوری اور شاعرانہ ہوتا ہے اس لیے ذوق پر بار نہیں ہوتا، اکثر اس کی سیرابی کا باعث ہوتا ہے۔

اصغر کے لہجے میں جیسی شائستگی و شگفتگی، جذبات و افکار کی جو تازگی و تہذیب ملتی ہے نیز شستہ منتخب و مترنم الفاظ و ترکیبیں جو مفہوم اور معانی کو زیادہ حسین و دل نشیں کر دیتی ہیں، بجائے خود ایسے عوامل ہیں جو غیر صالح خیالات و جذبات کے اظہار کے منافی ہیں۔ اصغر کے یہاں عورت، تصوف، عاشقی اور سیاست کا وہ 'روز مرہ اور محاورہ' نہیں ملے گا جسے عام طور پر دوسرے شعرا کبھی کبھی 'رسم پابندیِ اوقات' کے طور پر کام میں لاتے ہیں لیکن ان کے کلام میں ان سب کی بڑی دل کش جانی پہچانی اکثر چونکا دینے والی تصویریں اور تعبیریں ملیں گی! ان پر اور ان کی شاعری پر خود ان کا شعر گواہ ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ بادِ صبا چمن میں غنچہ و گل کو کس مزے سے چھیڑتی ہے، لیکن اس کی پاک دامنی پر حرف نہیں آتا!

معتبر شاعر وہ ہے جو تمام علوم 'سینہ و سفینہ' کے اسرار و رموز سے کماحقہ واقف ہو یا نہ ہو، اس سے آشنا ہو کہ فلاں خیال جذبہ یا فکر پر کس علم کا عمل مناسب حال ہوگا مثلاً کسی خاص خیال کو فنون لطیفہ، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، مذہبیات، کیمیا، طبیعیات وغیرہ میں سے کسی علم و فن یا علوم و فنون کے رمز و رعایت کی رُو سے سلجھا کر توانائی دے کر اور سنوار کر سامعین تک

پہنچایا جائے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مفید و موثر ہو۔ یہاں اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شاعر ہر علم وفن سے واقف ہو (سب سے زیادہ تو اسے اپنے فرض اور فن سے واقف ہونا چاہیے) کہنا صرف اتنا ہے کہ جو علوم انسان کو فطرت کا راز سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں اپنے اپنے طور پر مدد پہنچاتے ہوں شاعر کو اُن کا علم ہونا چاہیے۔ اس سے شاعر کے ان علوم پر قدرت رکھنے سے تعبیر نہیں کریں گے نہ اس کا مطالبہ کریں گے بلکہ ان علوم پر اس کا شاعرانہ تصرف قرار دیں گے۔ اقبال اس رمز سے خوب واقف تھے، غزل گوئی میں کسی حد تک اصغر مجھے ایسے معلوم ہوئے۔

حسرتؔ عشق کے مجازی پہلو اور بے ساختگی کے انداز کو پیش پیش رکھتے ہیں۔ حسرت عشق مجازی کے مزاج داں اور محتسب دونوں تھے۔ اتنی حسین رچی ہوئی جیتی جاگتی خارجیت صف اوّل ہی کے شعرا میں ملے گی۔ خارجیت کا نباہنا داخلیت کے نباہنے سے زیادہ مشکل اور ذمے داری کا کام ہے۔ میرے نزدیک خارجیت اور داخلیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو جانے بغیر دوسرے کا ہو رہنا نارسائی یا نااہلی کی دلیل ہے۔ خارجیت کے آداب اور مواقع و محل سے بے پروا یا بے گانہ رہ کر داخلیت کا صحیح عرفان نہیں ہو سکتا اور داخلیت کے رموز سے ناآشنا رہ کر خارجیت کا کاروبار کرنا سطحیت اور سفلہ پن ہے!

جگر صاحب نے حسن و عشق کے علاوہ سیاسی و سماجی حالات و حوادث پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ سیاسی تاثرات کو شعوری طور پر غزل کے جام و مینا میں ڈھالنے کی سب سے پہلی اور کامیاب کوشش سہیل نے کی ہے۔ اس میں ان کے پیش رَو حسرت موہانی ہیں۔ لیکن حسرت کی غزلوں میں سیاسی رنگ اتنا داخلی نہیں ہے جتنا خارجی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فکرِ سخن کرتے ہوئے ایک آدھ شعر سیاسی رنگ کے آ گئے تو اُن کو بھی غزل میں 'ڈال دیا' حسرت کی سیاست اور شاعری علاحدہ علاحدہ خیالات میں بٹی ہوئی ہے۔ سیاسی شعور کے چھینٹے مولانا محمد علی جوہر کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں۔ سہیل اور جگر کے ہاں یہ رنگ پائیدار اور غیر منقطع ہے۔ سیاسی تنگ نظری اور سیاسی تیرہ دلی کے خلاف دونوں کے کلام میں احتجاج کی ایک زیریں لہر ملتی ہے جو رفتہ رفتہ جگر کے یہاں زیادہ قوی اور نمایاں ہو گئی ہے۔ جگر صاحب نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں

اور اپنے تاثرات کا اظہار بڑے درد اور دلیری سے کیا ہے سب وشتم اور شعور وفتن سے نہیں، بعض معصوم جس سے انقلابی شاعری مراد لیتے ہیں۔

یہاں اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ حسرت اور سہیل دونوں کے سیاسی مسلک تھے۔ ان کے کلام میں اس کا اثر ملے تو تعجب کی بات نہیں، جگر صاحب کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھے۔ کم سے کم جہاں تک مجھے اس کا علم ہے، اس لیے جگر صاحب جب کسی 'ظلم وزیادتی' پر ملول یا برہم ہو کر کچھ کہتے تو ہر طبقے کے لوگ متاثر ہوتے اس لیے کہ ان کی آواز کو کسی سیاسی یا جماعتی نعرے کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ انسانی ضمیر کی پکار سمجھتے تھے اور جگر صاحب نے یقیناً وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جہاں ان کی آواز کو یہ حیثیت حاصل تھی!

جگر صاحب کو اعزازی ڈکٹریٹ تفویض کرنے کا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے آیا تو سب سے زیادہ جس خیال نے اس تحریک کو تقویت پہنچائی وہ یہ تھا کہ جگر صاحب اب شاعری کے دبستانوں اور حریفانہ چشمکوں سے بلند اور شخصیت کے اعتبار سے بھی 'غیر متنازعہ فیہ' ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری پر کسی طرح کا لیبل لگا کر مخصوص ومحمود نہیں کیا جا سکتا وہ شاعری کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں شاعری کے ساتھ ساتھ شاعر کی اہمیت وعظمت کو بھی دیکھتے ہیں۔ یہ پیش کش جگر صاحب کو علی گڑھ کی طرف سے آنی بھی چاہیے تھی اس لیے کہ علی گڑھ نے ہی اردو ادب کے دبستانوں کو ختم کیا تھا اور اس کو ایک تنگنائے آب سے نکال کر 'زندہ رود' کا درجہ حاصل کرنے کی صلاحیت بخشی تھی!

علی گڑھ نے اس طرح جو عزّت افزائی کی تھی اس کا جگر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ کنووکیشن کے موقع پر آنے کے لیے بے قرار تھے۔ ہر خط میں اس کا ذکر کرتے اور ہر شخص سے کہلا بھیجتے۔ لیکن صحت اتنی گر چکی تھی کہ معالجوں نے سفر کرنے کی اجازت نہ دی۔ جگر صاحب کو علی گڑھ سے عشق تھا۔ یہاں کی دعوت پر ضرور آتے اور آ جاتے تو جیسے علی گڑھ کا گوشہ گوشہ ان کی موجودگی سے زمزمہ سنج ہو جاتا۔

جگر صاحب ان رسوم وقیود اور اصرار وانکار کے حدود سے آگے نکل گئے تھے جو ہمارے بعض شعرا کا وتیرہ بن گیا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ علی گڑھ بلائے جاتے تو بڑی خوشی

سے چلے آتے تاوقتیکہ کوئی سخت معذوری سے سابقہ نہ ہوتا۔ جو کچھ پیش کیا جاتا خوشی سے قبول کر لیتے، طلبا ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کی پذیرائی کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار جانتے اس لیے ان سے زیادہ سے زیادہ جو بن پڑتا نذر کرتے۔ دوسرے شعرا کے لیے بھی علی گڑھ میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن جس 'جذبۂ بے اختیار شوق' سے جگر صاحب کے لیے ہوتا دوسروں کے لیے نہیں!

جگر صاحب اس پر بھی اصرار نہیں کرتے تھے کہ ان کے پڑھنے کا نمبر سب سے پہلے آئے، کس کے بعد آئے یا سب کے بعد آئے جب کہا گیا جتنا کہا گیا، پڑھ دیا اور اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ پڑھنے سے پہلے بطور تمہید یا معذرت نہ انکسار کرتے نہ افتخار، فرصت کی کمی صحت کی خرابی، سفر کی صعوبت وغیرہ کا کبھی ذکر نہ کرتے جیسا کہ شعرا بالعموم کیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہتے بھی کسی نے نہیں سنا کہ یہ شعر ملاحظہ فرمایئے گا۔ یا وہ دوسرے شاعروں کے پڑھنے کے طریقے یا اس کی سج دھج یا اس کے کلام پر نکتہ چینی کا ایک لفظ نہ کہتے، خاموش بیٹھے رہتے۔ آس پاس والوں سے گفتگو یا ہنسی مذاق نہ کرتے۔ سنجیدگی اور خلوص سے شریفانہ نرم لہجے میں داد دیتے، ہر شاعر کا اکرام ملحوظ رکھتے ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک لڑکے نے مشاعرے میں عمداً یا غلطی سے جگر صاحب کی پرانی کوئی غزل پڑھ دی۔ جگر صاحب پاس بیٹھے تھے۔ کسی طرح کا مطلق اثر نہیں لیا، لڑکے کی پیٹھ تھپتھپائی اور شفقت کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر کسی اور کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ لڑکے سے تعرض کرتا جیسا کہ بیان کر آیا ہوں۔ علی گڑھ کے طلبا خواہ وہ کسی بھی مسلک و مذاق کے ہوں جگر صاحب کو بڑی عزّت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ امتیاز بہت سے لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اکثر محسوس کیا جیسے ان سے مل کر طلبا کی صحت مند صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں ہوں۔ یوں بھی علی گڑھ کے طلبا میں اچھے اثرات کے قبول کرنے کی استعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اس کا سبب وہ روایت اور وہ فضا ہے جس کے قائم کرنے میں ہماری قوم کے بہترین افراد نے اپنی بہترین صلاحیتیں مدتوں صرف کی ہیں۔ جس طرح طلبا میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے اچھے اساتذہ اچھی لائبریری اچھا ساز و سامان اچھا کھانا پینا، رہنا، سہنا، باغ، سبزہ وار، صحت اور تفریحیں اور ورزش، کھیل کے میدان، ڈائننگ ہال، یونین، کلب وغیرہ سودمند ثابت ہوتے

ہیں اسی طرح کچھ اس طرح کا انتظام بھی ہونا چاہیے کہ ہماری وہ گراں مایہ شخصیتیں جو علی گڑھ سے باہر ہوں خواہ وہ علم وفضل کے کسی شعبے سے تعلق رکھتی ہوں، مسلم یونیورسٹی کے حدود کے اندر فراغت سے مستقلاً آباد ہو جائیں اور ہمارے نوجوان طلبا کے لیے سرچشمہ فیض ثابت ہوں!

ذہن میں کچھ اسی طرح کی باتیں تھیں کہ چند دن ہوئے بعض احباب نے اس کی کوشش شروع کر دی تھی کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ آرام ویکسوئی کی زندگی گزارنے کے لیے جگر صاحب مستقل طور پر علی گڑھ آجائیں لیکن یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکی اور جگر صاحب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے!

جلیل القدر معاصر شعرا کی طرح جگر صاحب نے مشاعرے کی منزلت کو آخر دم تک نباہا، اور اس روایت کو برقرار رکھا جس کی رُو سے مشاعرے کا شمار اعلیٰ تہذیبی اداروں میں ہوتا تھا۔ بعض ارباب سخن کے یہاں مشاعروں میں اسی طرح کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے جو مذہبی یا نیم مذہبی محفلوں کے ہوتے۔ ہماری زبان جس رتبے کو پہنچی اور ہماری تہذیب کو جو گراں مائیگی نصیب ہوئی، اس میں ان مشاعروں اور ان کے آداب کو بڑا دخل ہے۔ زبان اور تہذیب اسی طرح کی آزمائش سے گزر کر اپنا مقام پیدا کرتی ہیں۔ نوجوان طلبا کا ہجوم خواہ کسی سلسلے میں اکٹھا ہو، ادنیٰ بہانے یا اشارے پر آج جس طرح بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ سب کر گزرتا ہے جو کسی اور کے مناسب حال ہو یا نہ ہو، طلبا کے شایان شان ہرگز نہیں ہوتا، مشاعروں میں آج سے کم وبیش 25-20 سال پہلے تک کم از کم علی گڑھ میں دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ اس میں سامعین کا چاہے جتنا گناہ ہو، ہمارے شعرا کا بھی کچھ کم نہیں۔

بعض شعرا ایک ایسے مشاعرے یا مواقع کے لیے جہاں نوجوان لڑکیاں اور خواتین موجود ہوتی ہیں ایسی ناپسندیدہ اور بے باک نظمیں لکھ لاتے ہیں جو نوجوانوں کے حیوانی وشہوانی جذبات کو برانگیختہ و بے قابو کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اسے یہ شعرا اپنا بڑا کارنامہ اور انعام سمجھتے ہیں۔ دیکھا تو یہاں تک گیا ہے کہ مشاعروں میں اس نظم کو سنانے کی کوئی فرمائش نہیں کرتا تو یہ شعرا خود نہایت بے غیرتی کے ساتھ اور اتنے ہی بھونڈے پن سے اشارتاً اس کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ شاید غالبؔ کی پیروی میں جہاں انھوں نے 'غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد' کہا ہے!

جگر صاحب میں بڑی حیا اور غیرت تھی، کہیں کسی محفل میں بیٹھے ہوں، ہمیشہ نظر نیچی رکھتے تھے جیسے اس محفل میں نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو اپنی ذمے داری اور امانت سمجھتے ہوں بے تکلف احباب میں بھی بیٹھ کر وہ اس طرح کے فقرے زبان پر نہیں لاتے تھے، جن میں عورتوں سے بے راہ روی کے روابط کا اشارہ ملتا ہو، خواہ وہ فقرے کتنے ہی 'در پردہ' کہے جاسکتے ہوں۔

ان باتوں کا خیال کرتا ہوں تو جگر صاحب اور ان کے پُرانے ساتھی شعرا آج کس حیرت والم سے یاد آتے ہیں جن کو دیکھ کر اس وقت تو اتنا نہیں جتنا اب محسوس کرتا ہوں کہ تہذیب و شرافت بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت اور اس لیے بڑی ذمے داری ہے۔

جگر صاحب شعر کہہ سکتے تھے اپنے شعر پر مضمون نہیں لکھ سکتے تھے۔ اچھے اور بڑے شعرا بالعموم ایسا نہیں کر پاتے۔ بعض ایسا کر سکتے ہیں لیکن ان کا مضمون ان کے شعر سے اچھا ہوتا ہے اور کبھی کبھی بجائے ان کے دوسروں پر صادق آتا ہے، اس لیے وہ خارج از بحث ہیں۔ جگر صاحب سے جب کبھی اس طرح کی بات آئی، بڑے شوق سے بحث میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوئے، لیکن گفتگو کچھ اس طرح کی کرنے لگتے تھے جیسے شعر کہنے کے طور طریقوں پر بحث نہ کر رہے ہوں۔ غزل کی اہمیت سے انکار کرنے والے سے لڑائی مول لینے پر تیار ہوں۔ یہ لڑائی بھی کچھ اس طرح کی ہونے والی ہوتی جیسے اس نیک کام کے لیے حربہ کوئی نہ ہو حوصلہ بہت ہو۔ ظاہر ہے ایسے نبرد آزما کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

بایں ہمہ ایک جگہ وہ بڑی جرأت اور صفائی سے ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں جو ہماری اردو شاعری کے اعتبار و امتیاز کو بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے۔ شعر یاد نہیں آتا۔ مفہوم یہ ہے شعر میں 'مشرقیت' نہ ہو تو وہ مغرب کی نقالی ہے کچھ اور نہیں۔ یہ بات بہ ظاہر مولویوں جیسی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ ایسی ہے نہیں۔ مشرقیت کیا ہے، کیا نہیں، اس سے یہاں بحث نہیں لیکن نئے انداز کے شاعروں کو اس نکتے پر سنجیدگی کے ساتھ غور ضرور کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ ایک ایسے شخص کا قول ہے جس کے کلام اور شخصیت سے کافی زمانے تک ہم محظوظ و متاثر رہے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب مغربیت اور عقلیت اپنے منتہا پر تھی اور ہمارے فکر و تخیل پر مغرب سے زیادہ مغربیت طاری تھی!

جگر صاحب نے براہِ راست شاید ہی کبھی مجھے خط لکھا ہو۔ بچوں میں سے کسی کو لکھ دیتے، وہ مجھے بتا دیتے۔ جگر صاحب کا یہ انداز بھی ان کی دوسری اداؤں کی طرح کتنا دل کش تھا! وفات سے کچھ دن پہلے لڑکوں میں سے ایک کے نام خط آیا۔ قیاس کرتا ہوں کہ مضمون کیا رہا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ شانِ خط میں بھی وہ رعنائی اور صلابت نہیں رہ گئی تھی جو پہلے تھی۔ جگر صاحب کا خطِ شکست نہایت پاکیزہ اور پختہ تھا۔ جس پر التفات خاص ہوتی اس کو اپنی کوئی غزل ہاتھ سے لکھ کر دیتے اور مخصوص طغرا میں اپنے دستخط کر دیتے اور تاریخ لکھ دیتے۔ جگر صاحب کو جس حال میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا اس کے بعد ان کی بیماری کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جس خط کا اوپر ذکر کر آیا ہوں اس میں ایک شعر لکھا تھا جو مجھے سنا دیا گیا۔ کہہ نہیں سکتا اوروں نے بھی کہیں سنا یا پڑھا ہے یا نہیں۔ شعر یہ تھا:

کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضائع
چمن شاداب ہے، شبنم نہیں ہے!

جگر صاحب کی زندگی اس طرح کی تھی اور ایسی زندگی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے!

(فکر و نظر، علی گڑھ، سہ ماہی، اکتوبر 1960)

●●●

بابائے اردو مولوی عبدالحق

(1870-1961)

مولوی عبدالحق 1870 میں ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ علی حسن تھا۔ مڈل کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ آئے اور یہاں سے 1894 میں بی۔ اے کیا۔ حیدر آباد میں محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر کام کیا۔ مولوی عزیز مرزا کے توسط سے نواب افسر جنگ نے ان کو مدرسہ آصفیہ کا صدر مدرس بنا دیا اور رسالہ افسر کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی۔

1912 میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے اور اس کے دفتر کو حیدر آباد سے اورنگ آباد لے گئے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کے دفاتر قائم کیے اور اردو کی ترقی کے لیے ملک کے طول و عرض میں دورے کیے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ 1930ء میں اردو انگریزی لغت کا کام شروع کیا جو 1937 میں مکمل ہوا۔ 1936 میں انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل کیے جانے کا فیصلہ ہوا۔ 1947 میں تقسیم ملک کے بعد جب حالات ناسازگار ہو گئے تو جنوری 1949 کو پاکستان چلے گئے اور 1958 میں کراچی میں ایک ترقی اردو بورڈ کے نام سے

ایک ادارہ قائم ہوا۔اس کا اہم مقصد آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی طرز پر ایک اردو لغت تیار کرنا تھا۔اس لغت کے مدیر اعلیٰ عبدالحق مقرر ہوئے۔

پاکستان میں انھوں نے اردو کی ترقی کے لیے کئی منصوبے بنائے۔کراچی میں 1957 میں اردو کالج کی بنیاد رکھی،اس کے لیے ان کو بہت پریشانیوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن مولوی صاحب ہمت ہارنے والے شخص نہیں تھے،تمام عمر کالج کی ترقی کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔

انجمن کے ذریعہ قدیم مخطوطات کی تلاش،شعرائے اردو کے نایاب تذکرے کی دریافت اور ترتیب واشاعت کے لیے مولوی صاحب کا اردو پر احسان ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

16راگست 1961 کو 91 سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔

o

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 26 اگست 1961 کو کراچی میں 91 سال کی عمر پا کر رحلت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی بے لوث و بے نظیر خدمات کو ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے اچھے اور بڑے مقاصد کے حصول میں امید اور امنگ کا لازوال سرچشمہ بنائے۔

موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن جو لوگ اعلیٰ مقاصد کی تائید و حصول میں تادم آخر کام کرتے رہتے ہیں، وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں، ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ پہلی صورت طبعی اور ارضی ہے، دوسری اخلاقی اور ماورائی، تقدیر الٰہی نے صرف نوع انسان کو موخر الذکر اقدار کے تحفظ و ترفع کے لیے انتخاب کیا ہے مولوی صاحب کی زندگی اور وفات دونوں میں اس کی تعبیر ملے گی۔

مولوی صاحب 1888 میں علی گڑھ کے طالب علم ہوئے اور 1896 میں یہیں سے بی۔اے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غدر کے بعد سرسید، ہندی مسلمانوں کی معاشی ذہنی و تہذیبی آبادکاری کے منصوبے کو کامیاب بنانے میں اپنے عقیدے اور عمل کی پوری توانائی و تابناکی کے ساتھ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کے عظیم ادارے کے وسیلے سے اس عہد کی نوع بہ نوع دشواریوں اور نزاکتوں سے نبرد آزما تھے۔ اس تحریک اور ادارے کو مستحکم و موثر بنانے اور فروغ دینے میں دور و نزدیک کے عام و خاص، مسلم، ہندو، سکھ، یورپین نیز مدرستہ العلوم کے اساتذہ اور طلبا جس میں ہر ملت و مسلک کے پیرو شامل تھے، یکساں طور پر نہایت تندہی و خلوص کے ساتھ سرسید کے

شریک کار تھے۔ حالات کے یکسر منقلب ہو جانے کے باوجود ادارے کا یہ امتیاز آج تک باقی ہے۔ اس وسیع پیمانے پر اتنی مدت تک ہندوستان کے شاید ہی کسی اور ادارے کو اتنی بے لوث و ہمہ جہت تائید ملی ہو اور جس نے اس فراخ دلی و جرأت سے اپنی ذمے داری پوری کی ہو۔

عنفوان شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تند صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور پرکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب یقیناً بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسید کا سایہ اور سہارا اور ان کے نادرہ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ ان کو سرسید سے بڑا رہنما، مدرستہ العلوم سے بہتر ادارہ اور علی گڑھ تحریک سے زیادہ مفید مقتضائے وقت اور جامع پروگرام اور کہاں مل سکتا تھا۔ ان کی غیر معمولی ذہنی استعداد، ثابت قدمی اور کام کرنے کی لگن کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ علی گڑھ میں اتنی معقول و موثر نظری و عملی رہبری نہ میسّر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر نکل جاتے اور جتنے کارہائے عظیم جتنی طویل مدت تک انھوں نے جس خوبی سے انجام دیے وہ دے بھی سکتے یا نہیں! یہ اس لیے کہنا پڑا کہ آج کل بیش تر ذی استعداد اور ہونہار نوجوانوں کو مناسب و معقول رہبری اور ماحول نہ ملنے سے بے راہ روی نے دنیا کو جس انتشار، مایوسی اور بے زاری سے دوچار کر رکھا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ جس کو دور کرنے میں ہماری بہترین مساعی اب تک ناکام رہی ہیں۔ خدا نہ کرے یہ سرکشی و گمراہی اپنا تاوان لیے بغیر نہ رہے جیسا کہ تاریخ بتاتی چلی آرہی ہے، جس کے آثار روز بروز نمایاں ہو رہے ہیں۔

جس طرح غدر سے کچھ پہلے دہلی میں دین و دانش تہذیب و شائستگی علم و فن کے اتنے ہنرور جمع ہو گئے تھے جتنے 'گردوں پر نجوم' اسی طرح اس کے بعد جیسے مردانِ کار شہہ دماغ اور ملک و ملت کے خیر اندیش سرسید کی قیادت میں اکٹھا ہوئے اس کی بھی مثال ہندوستان میں کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ دہلی کے جتنے ارباب کمال غدر میں ادھر اُدھر ہوئے ان میں سے کسی نے کہیں جاہ و اقتدار کا سکہ چلایا، کہیں رشد و ہدایت اور خیر و برکت کے آستانے قائم ہوئے، کہیں ارباب کسب و ہنر نے اپنا اپنا کاروبار سنبھالا۔ اس طرح سارے ملک میں فن اور فضائل کے ستارے روشن ہو گئے۔

سر سید نے علی گڑھ سے ایک نئے افق کا ظہور ایک نئی زندگی کے افتتاح اور ایک نئے چیلنج کے قبول کرنے کا اعلان کیا۔ چنانچہ انھوں نے ان کے رفقا نے اور ان کے بعد آنے والوں نے زندگی اور زمانے کے ہر نئے تقاضے سے نبرد آزما ہونے اور 'گذشتہ سے پیوستہ' اور آئندہ سے ہم دوش و ہم عنان رہنے کی روایت قائم کی۔ جس طرح اچھا استعارہ ہم کو بے اختیار غالب اور اقبال کے یہاں سے دستیاب ہوتا ہے اسی طرح نیا مقصد، نئی منزل اور نئے حوصلے کی نشان دہی علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے ملتی ہے!

مولوی صاحب علی گڑھ کے غیر معمولی ذہین طلبا میں بھی ممتاز اور اپنے ساتھیوں اور اساتذہ دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ وہ اپنے دور کے برخود غلط یا سر پھرے طلبا میں نہ تھے۔ اس زمانے میں کالج کے نظم ونسق پر اعتراض یا احتجاج کرنا اتنا آسان، تفریحی یا سودمند مشغلہ نہ تھا جتنا کہ اب ہے، لیکن مولوی صاحب جس بات کو نامناسب سمجھتے اس پر اختلاف کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ ان کی اس صفت پر سر سید اعتماد کرتے اور مولوی صاحب نے برملا و صاف گوئی ہی نہیں اچھے کام کرنے کی دُھن، خطرہ و خسارہ، مایوسی و بیزاری اور طعن اغیار کو خاطر میں نہ لانے کا سبق بھی سر سید ہی کی گرامی ذات و زندگی سے سیکھا تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''سر سید کی بڑی تمنا تھی کہ مدرستہ العلوم کے طلبا ہمت، جرأت اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں، اور جب کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے!'' انھوں نے طبیعت کی اس افتاد کو نہ صرف بحیثیت طالب علم، کالج کے انگریز ممبران اسٹاف کے مقابلے میں برقرار رکھا بلکہ حیدرآباد دکن کی فضا میں بھی ترک نہیں کیا۔ جہاں مدتوں 'وظیفہ خوار' کی حیثیت سے وہ مطلق العنان حکمراں اسی طرح کے امرائے دولت اور ان دونوں سے زیادہ طاقت ور وخطرناک جماعت، انگریز حکام سے قریب رہے۔ ایسے عہد میں مولوی صاحب کا نہ کبھی 'شاہ کو دعا دینا' نہ ریاست کے اعیان و اکابر کا ثنا خواں ہونا معمولی بات نہیں ہے!

مولوی صاحب کو شروع سے آخر تک وقت کی گراں مایہ شخصیتوں کی صحبت و رفاقت نصیب رہی۔ مدرستہ العلوم میں سر سید، سید محمود، شبلی، حالی، محسن الملک، وقار الملک، پروفیسر بک، پروفیسر ماریسن، پروفیسر آرنلڈ حیدرآباد میں افسر الملک، سید علی بلگرامی، نواب عماد الملک مہاراجا

کشن پرشاد، عزیز مرزا، علی حیدر طباطبائی، عنایت اللہ، ظفر علی خاں، وحید الدین سلیم، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، ان کے علاوہ خواجہ غلام الثقلین، ڈاکٹر اقبال، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) وغیرہ یہ ایسی ہستیاں تھیں جنھوں نے ہمارے قدیم کی اعلیٰ روایات واقدار کو جدید کے اہم تقاضوں سے روشناس کرانے اور سازگار بنانے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے ہماری علم دوستی، تہذیب و شائستگی، فرض شناسی، محنت کوشی، ایمان داری اور دلیری کے کارنامے روشن ہیں۔ انھوں نے ایک نازک اور پُر آشوب زمانے میں قدیم کا اعتبار و وقار جدید کی تاخت و تاراج میں محفوظ بھی رکھا اور روشن بھی۔ قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی روش و روشنی میں دیکھنا اور پرکھنا اور ان کی خوبیوں کو قبول اور خرابیوں کو ترک کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے یہ صرف خاصانِ عصر کر سکتے ہیں۔

اس بات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم یا تو پرانے کو فی الفور اور یک قلم ترک کر کے نئے کو قبول کر لیتے ہیں یا نئے کو کسی بھی قیمت پر اپنانے کو تیار نہیں ہوتے، اور ستم ظریفی یہ کہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ تقاضائے فطرت اور آئین فطرت اور آئین زندگی دونوں کا منافی ہے۔ اس سے انسانی ترقی و تہذیب میں نہ ربط باقی رہتا ہے نہ تسلسل اور انسانی معاشرے میں بڑا انتشار و اختلال واقع ہوتا ہے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد تلاش ملازمت میں مولوی صاحب کو بمبئی جانا پڑا جہاں وہ براہِ راست محسن الملک کی غیر معمولی شخصیت کے زیر اثر آئے جن کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں: ''ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی کہ کوئی ہو کہیں کا ہو ان سے چھوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں!''

یہاں کرنل افسر الملک بہادر کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی جن کو وہ اپنے ہمراہ حیدر آباد دکن لائے اور مدرسہ آصفیہ کا صدر مقرر کر دیا۔ 1898 میں یہیں سے رسالہ افسر کا اجرا کیا۔ اسی وقت سے اردو اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی تقدیر پہچانی اور اپنائی۔ مولوی صاحب نے عمر کا بیش تر غالباً بہترین زمانہ حیدر آباد میں اردو کی عملی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں میں گزارا۔ انجمن ترقی اردو کو جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک معطل و رنہ مضمحل جُز تھی۔

1912 میں علی گڑھ سے دکن کی سرزمین پر لائے اور آنریری سکریٹری کی حیثیت سے یکہ وتنہا اس کو اتنی ترقی دی کہ وہ اردو کی بے شمار اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ، ان کو بروئے کار لانے کا وسیلہ اور اردو کی حفاظت وحمایت کا معتبر کل ہند محاذ بن گئی۔

قدیم اردو کا گہوارہ ہونے کی حیثیت سے دکن کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مسلّم ہے لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ دکن کی اس اہمیت کو ترقی دینے اور فعال بنانے میں مولوی صاحب کی بیش قرار خدمات کو بہت بڑا دخل ہے۔ انھوں نے دکن کو اپنی گوناگوں علمی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا ہوتا تو یہ نہ صرف یہ کہ اردو کی تاریخ وتحقیقات کا کام اتنا ترقی نہ کرتا بلکہ دکن کو شاید وہ بے مثل فضیلت کبھی نصیب نہ ہوتی جو عثمانیہ یونیورسٹی اور سرشتۂ ترجمہ وتالیف کے طفیل اسے حاصل ہوئی۔ یعنی دکن میں دیسی زبان (اردو) کی ایک ایسی یونیورسٹی قائم ہوئی جو اپنی مختصر مدت میں ہندوستان کی معیاری انگریزی اور سرکاری یونیورسٹیوں کی ہم پلہ ہوگئی، جس کی تصدیق کرنے والوں میں آج بھی سررادھا کرشنن اور شری راج گوپال آچاری موجود ہیں۔ اردو کی اس رہنمائی سے ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کی تفسیر روشن ہوگئی۔ دکن میں قدیم اردو کی تصانیف کا سراغ لگا کر مولوی صاحب نے اردو کے ماضی میں تقریباً 200 سال کا اس کے حال میں ایک معیاری یونیورسٹی کا اور اس کے مستقبل میں اردو کی تہذیبی تسخیر کے امکانات کا بڑا پائیدار، بیش قرار اور بے نظیر اضافہ کیا۔

اس میں شک نہیں جدید علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم اردو زبان میں دینے کا کامیاب تجربہ پہلے پہل دہلی کالج میں ہوا، اور یونیورسٹی کا خیال سب سے پہلے سرسید کو آیا جنھوں نے 1886 میں برٹش ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے، اس بارے میں ایک عرض داشت گورنمنٹ آف انڈیا میں پیش کی جسے وزیر ہند نے بھی پسند کیا لیکن اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں مولوی صاحب، سراکبر حیدری اور سرراس مسعود سب سے زیادہ ممتاز اور پیش پیش تھے، لیکن اس کو مستحکم کرنے اور رکھنے کے لیے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا مولوی صاحب نے جس دوراندیشی، قابلیت اور محنت سے اردو قواعد، وضع اصطلاحات،

تحقیق و تدقیق، تالیف و ترجمے، تنقید و لغت کے کاموں کا جدید معیار کے مطابق آغاز کیا اور ترقی دی وہ انھیں کا کارنامہ ہے، جس کے بغیر یہ بے مثل اور عظیم الشان تجربہ کامیاب نہ ہوتا۔ مولوی صاحب کی ان گراں قدر خدمات سے اردو کی اہمیت مسلّم ہوئی اور اس کی ترقی کے امکانات تیزی سے برگ و بار لانے لگے۔ ان خدمات کے طفیل اردو کی اوّلین یونیورسٹی ہندوستان میں قائم ہوئی۔ ایسے بڑے کام میں تنہا ایک شخص کی علمی و ادبی خدمات اور اس مسلسل جدوجہد کا شاید اتنا گراں قدر نمونہ کہیں اور نظر آئے! جہاں تک اردو زبان کے جاننے، پرکھنے اور ہر سطح اور نوعیت کے کاموں میں مفید و مستند اضافے کا تعلق ہے مولوی صاحب کا ثانی کوئی نہیں۔ اردو کے بارے میں سرسید نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مولوی صاحب کی خدمات میں ملتی ہیں!

کسی زبان کے مکمل و مقبول ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی معیاری یونیورسٹی ہو۔ تقسیم سے پہلے کا ہندوستان جتنی اور جن مدارج کی دیسی زبانوں اور بولیوں پر مشتمل تھا اور آج بھی ہے، اس کی مثال کہیں اور کم ملے گی۔ ان میں سب سے کم عمر لیکن اپنی ترکیب، ظہور و نفوذ کے اعتبار سے سب سے عجیب، سب کی حلیف اور بہتوں کی نمائندہ اردو ہے، اس میں کام کرنے والے، اس سے کام لینے والے اور اس سے نام پانے والے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، یورپین سب ہی ہیں۔ لیکن پچھلے کم و بیش سو سال سے اس کو جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو اب مخاصمت کی حد تک پہنچ گئی ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی سرشت اور اس کی شخصیت کو واضح اور متعیّن کیا اور ہر طرف سے منہ موڑ کر، ہر انعام و دشنام سے بے نیاز ہو کر اردو کی حفاظت و حمایت کی، وہ بھی اس طریقے سے جو سب کے بس کا نہ تھا، یعنی اردو کے سرمایے میں اپنے گراں قدر مضامین و مقالات کے اضافے سے! یہ ستم دیدنی ہے کہ اردو کی دوستی میں اپنے اور پرایے دونوں کی دشمنی بھی مولوی صاحب کے حصے میں سب سے زیادہ آئی۔ اردو کا ایسا محسن و مجاہد جس نے ہر خطرے و رسوائی اور ہر لذت و الم سے منہ موڑ کر تمام عمر قلمے، قدمے سخنے، درمے، ہر سطح سے، ہر محاذ پر صرف اردو کی خدمت کی ہو اور جس کی خدمات سے اردو اتنی ممتاز و معتبر ہوئی جتنی مولوی عبدالحق کی خدمات سے، اردو کی تاریخ میں نہ ملے گا شاید کسی اور ادب کی تاریخ میں بھی نہ ملے!

خیال ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو وہ کراچی میں اردو یونیورسٹی قائم کر دیتے جس کے لیے وہ کتنے مضطرب اور کس درجہ کوشاں تھے۔ وقت کا تقاضا بھی تھا اور حالات بھی سازگار ہو چلے تھے، لیکن انسان کی زندگی اس کے مقاصد جلیلہ کی زندگی سے ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائے بالآخر مرے گا۔ بڑے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہے ہمارے آپ کی زندگی سے علاحدہ جس پر کبھی موت بھی نہیں طاری ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ مقاصد عظیمہ وقتاً فوقتاً اپنی زندگی کا کچھ حصہ ہمارے آپ کے حوصلے اور استعداد کے مطابق ہم کو ودیعت کرتے رہتے ہیں۔ اسی کے بہ قدر ہم کام کرتے ہیں پھر دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ مشیّت الٰہی اس لیے تقدیر انسانی یہی ہے۔ کراچی میں اردو کا جو منصوبہ مولوی صاحب کے پیشِ نظر تھا اور جس کو عملی جامہ پہنانا وہ اپنا سب سے بڑا اور محبوب مقصد سمجھتے تھے وہ آج ورنہ کل پورا ہو کر رہے گا اور اس کو ترقی کے لیے منازل سے آشنا اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ کرانے کے لیے ہم میں عبدالحق آتے رہیں گے۔ ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مادّے کی طرح عمل بھی لازوال ہے، ایک طبعی دنیا میں دوسرا روحانی واخلاقی زندگی میں، اس بڑے فرق کے ساتھ کہ خیر و شر کتنے ہی اضافی کیوں نہ قرار دیے جائیں، خصوصیت وخاصیت کے اعتبار سے ایک بہرحال خیر اور دوسرا بہرحال شر ہے!

آج کل روپے پیسے یا ریاست کے حکمرانوں سے شبانہ روز یونیورسٹیاں وجود میں آتی رہتی ہیں جس طرح بعض ممالک میں حکم ناموں سے شعر وادب کی نوعیت متعین کی جاتی ہے اور اس کے رُخ و رفتار کو بدلتے اور موڑتے رہتے ہیں۔ لیکن دانش گاہیں دراصل طالب علم و استاد کی مدتوں کے علمی ریاض و روایت سے ظہور میں آتی ہیں، حکومت کی مرضی و مصلحت کے مطابق دفعتاً جہاں تہاں نمودار نہیں ہو جایا کرتیں۔ بیش تر تعلیم گاہیں اب بنائی نہیں ڈھالی جاتی ہیں۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے، وقت کا تقاضا اور زندگی اور زمانہ کی رفتار ایسی ہی ہے! لیکن مولوی صاحب کی مجوزہ یونیورسٹی ان کی علمی و ادبی خدمات پر تعمیر کی جائے گی جس کے لیے انھوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا تمام سرمایہ وقف کر رکھا تھا۔ ایسی یونیورسٹی کی فضیلت کا کیا کہنا!

مولوی صاحب کے بیش تر اور بہترین حصہ عمر کی کوششوں اور شرفائے فن و ادب کی امیدوں کا لہلہاتا ہوا باغ جو دکن میں اُجڑ گیا، کیا عجب وہ کراچی میں نمو پائے اور برگ و بار لائے! مولوی صاحب کی اس میں کتنی بڑائی نکلتی ہے کہ انھوں نے حکومت سے منہ موڑ کر جامعہ عثمانیہ کا بدل اپنی قوت بازو سے کراچی میں کرنا چاہا۔ اس کے لیے رات دن ایک کر دیے، کیسی کیسی دشواری اٹھائی، بدنامی مول لی اور آخر دم تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس کے لیے مرن برت نہیں جیون برت رکھا جو بڑی کٹھن چیز ہے اس کے لیے بہت کم لوگ حوصلہ کرتے ہیں اور اس کو نباہ سکتے ہیں۔ تمام عمر ہر طرح کی آزمائش میں مبتلا اور اس پر ثابت قدم رہنا، چند دن کی تکلیف میں مبتلا رہ کر جان دینے، یا بچ رہنے سے بہر حال مشکل، اس لیے افضل ہے! معرکہ خیر و شر میں مرنے کا نہیں، مقابلہ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مرن برت ممکن ہے کسی دن ممنوع قرار دے دیا جائے۔ جیون برت کا مقابلہ کوئی مادّی قوت کبھی نہیں کر سکی ہے!

مولوی صاحب کی نظر میں حالؔی کی سیرت و شخصیت کا جتنا احترام تھا شاید ہی کسی اور کا رہا ہو۔ حالؔی کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں جیسے مرید اپنے مرشد کا کرتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ مولوی صاحب کا 'اندازِ گفتگو' بالعموم ایسا نہیں ہوتا۔ سرسید کی بھی ان کی نظر میں بڑی منزلت ہے جس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے لیکن اس اظہار کا انداز اور ہے اور اس احترام و عقیدت کا اور، جو حالی کے لیے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے مولوی صاحب دونوں میں کسی سے مشابہ نہیں۔ البتہ ان کے لکھنے کا اسلوب سرسید کے اسلوب کی نہایت ترقی یافتہ شکل ہے۔

سرسید نے سب سے پہلے اردو نثر کو ایسے اسلوب سے متعارف کرایا جس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کا اظہار و ابلاغ کیا جا سکتا تھا۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے اسلوب کی ابتدائی ناگزیر ناہمواریوں کو دور کر کے اس میں ادبی خوبیاں پیدا کر دیں، سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب انگریزی، فارسی اور ہندی اندازِ خیال، اندازِ فکر و اندازِ بیان کے رموز سے واقف تھے۔ ان اسالیب کو انھوں نے اردو نثر میں اس سلیقے سے سمویا کہ وہ سلیقہ اردو کا سلیقہ بن گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کی نثر میں مشکل سے کوئی ٹکڑا ایسا ملے گا جس کو علاحدہ کر کے آپ بتا سکیں کہ یہ انگریزی، فارسی یا ہندی کا چربہ ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے اچھے

سے اچھے نثر نگاروں کے یہاں آپ اس طرح کے ٹکڑوں پر آسانی سے انگلی رکھ سکتے ہیں۔ یہاں تک بتا سکتے ہیں کہ فلاں نے کسی اردو نثر نگار کو نہیں، فلاں اردو شاعر کے اندازِ بیان کو اپنی نثر کا جز بنالیا ہے، انداز بیان ہی نہیں جہاں تہاں وہ خود اس کی شاعری کو، حالاں کہ اردو نثر میں اردو شاعری کا رنگ و آہنگ اب مقبول نہیں رہا۔ ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو نثر کا مزاج جس کو خالصتاً اردو کا کہا جاسکے غالب، سرسید اور حالی کے بعد مولوی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔

مولوی صاحب کو دکن میں کافی عرصہ کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی عملی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اچھے سے اچھے نمونے وہیں کے قیام کے نتائج ہیں۔ دربار دکن، امرائے کبار اور ریزیڈنسی کی آویزشوں اور ان کے متعلقین و متوسلین کی ریشہ دوانیوں سے بچا رہنا اور اپنی آن قائم رکھنا مولوی صاحب کا معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ مطلب کتنا ہی ضروری اور مخاطب کیسا ہی صاحب اثر و اقتدار کیوں نہ ہو مولوی صاحب گفتگو میں تکلف و تملّق کو راہ نہیں دیتے تھے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی مستحق شخص، مفید ادارے یا ضروری اسکیم کے لیے چندہ یا عطیہ نہیں بلکہ جزیہ یا چوتھ وصول کر رہے ہوں۔ یا آج کل کے صحیفۂ اخلاق یا اصطلاح میں کسی کی یادگار قائم کرنے یا الیکشن لڑنے کے لیے استحصال بالخیر یا بالجبر کے درپے ہوں۔

اچھے مقصد کی حمایت کرنے میں مولوی صاحب بڑے سے بڑے آدمی کے جبر و قہر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس صفت میں وہ بہتوں سے بہت ممتاز بھی تھے اور بدنام بھی۔ یہ سب اس لیے ممکن تھا کہ مولوی صاحب کے خلوص نیت اور حسن عمل کا ہر شخص قائل تھا۔ کسی کے دل میں یہ وسوسہ نہیں گزرتا تھا کہ علمی و تعلیمی مشاغل کے علاوہ ان کا کسی مشتبہ سرگرمی یا ذات گرامی سے تعلق تھا۔ حیدرآباد کے تمام چھوٹے بڑے غیر ملکی متوسلین میں شاید مولوی صاحب ہی کی ذات ان چند مستثنیات میں ہے جو وہاں کے کوچے سے بے آبرو ہو کر نہیں نکلی۔ اردو دوستی کی روایت مولوی صاحب کو سرسید اور محسن الملک نے دی۔ اس روایت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں انھوں نے جیسی مسلسل اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں ان کا ثانی، نامعلوم مدت تک شاید اور کوئی نہ پیدا ہو!

اردو کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں مولوی صاحب کی تحقیقات کیا ہے۔ اس کی حفاظت و اشاعت میں ان کا کیا حصہ ہے، اس کی کن اصناف کو انھوں نے کس طرح آراستہ و استوار کیا اور ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچایا، ان امور کی تلاش ان کی تحریر و تقریر میں کرنا چاہیے جن کے جستہ جستہ نمونے ان سطور کے آخری صفحات میں ملیں گے۔ مشکل اردو لکھنے کی جتنی مذمت اور آسان لکھنے کی جتنی تعریف و تبلیغ مولوی صاحب نے کی ہے ان کے پایے کے کسی دوسرے اردو شناس اور اردو نگار نے نہ کی ہوگی، نہ اس پر کاربند ہوئے ہوں گے۔

ہم میں کس کو اس بات کا علم نہ ہوگا کہ تقریباً پچھلے سو سال سے اچھے اردو نگار کی پہچان ہی یہ رکھی گئی ہے کہ وہ ہر طرح کے خیالات و جذبات کو سلیس عام فہم اردو میں ادا کر سکتا ہو۔ سب سے پہلے یہ صفت غالب میں اس کے بعد سرسید میں پھر حالی میں، ان کے بعد انھیں مولوی عبدالحق میں پائی اور سراہی گئی۔ اس کے برخلاف خطیبانہ یا شاعرانہ اسلوب بیان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور اتنی سی بات بتانے کے لیے غالباً کسی پیغمبر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ سہل اور سلیس اردو اگر کسی زبان سے سب سے قریب ہے تو وہ ہندی ہے اور جن زبانوں سے دور ہے وہ فارسی اور عربی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہندی خود سلیس و سہل اردو سے نہیں سہل و سلیس ہندی سے بھی دور بہت دور چلی جارہی ہے۔

مولوی صاحب پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کے زمانے میں اردو کو دو قومی نظریے کی تائید کا آلہ بنایا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے اثر و اقتدار کے ساتھ ہی ہر چیز ہندو مسلم رنگ میں دیکھی اور پرکھی جانے لگی۔ اس میں انگریزوں نے اپنا فائدہ دیکھا، مسلمانوں نے اپنا، ہندوؤں نے اپنا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوا انگریزوں کے سب نے غلط دیکھا۔ ظاہر ہے جہاں غلط یا صحیح انگریز ہندو مسلمان سب کو فائدہ مدنظر ہو یا دکھائی دیتا ہو وہاں غلطی پر ہونے کا الزام کون قبول کرے گا۔

مذہب، فرقہ، زبان، علاقے، اکثریت و اقلیت کے اختلافات انگریزی حکومت کے عہد سے آج تک جس شکل و شدت سے جن مواقع پر سر اُٹھاتے رہے ہیں یا ان کو شہ دی گئی ہے اس سے کوئی بے خبر نہیں۔ ان کے اسباب و انسداد کی تدابیر بھی دریافت کیے جاچکے ہیں۔ ان پر بے شمار

صفحات ہر روز سیاہ کیے جاتے ہیں کتنے مباحثے منعقد اور کمیشن کمیٹیاں مقرر ہوتی رہتی ہیں اور کیسے کیسے محراب و منبر اُن کی تلقین یا تصفیے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں، وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ لیکن جو بات کسی کے بس کی نہیں وہ یہ ہے کہ انسداد یا اصلاح کی تدابیر پر عمل کون کرے اور کیسے کرے۔

اردو کا بیش تر مسلمانوں کی مادری زبان ہونا اتنا اردو کا گناہ نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ شاید مسلمانوں کا، یہ اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ اردو بے شمار ہندوؤں کی بھی مادری زبان ہے جس کا وہ بڑی منصفی و جرأت سے برابر اظہار و اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اپنے حسن و افادیت کے اعتبار سے اردو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی اتنی ہی مقبول و کارآمد نہ ہوتی جتنی کہ رہی ہے اور اب بھی ہے تو اس کو سارے ملک میں اتنی وسیع و وقیع شہریت (Citizenship) کیسے نصیب ہوئی جو کسی دوسرے ہندستانی زبان کو نہیں ہے۔ اس غیر معمولی امتیاز کے لیے اردو ہندوستان کی دور و نزدیک کی تمام بولیوں اور ان کے بولنے والوں کی احسان مند بھی اور محسن بھی! یہ ایک سانحہ ہے کہ اردو جو کسی وقت ہندستان میں ہندو مسلمان کو یک جا کرنے اور رکھنے کے لیے وجود میں آئی تھی اور اس نے اس فریضے کو حسن و خوبی سے انجام بھی دیا تھا، آج ہندو مسلمان میں نفاق و افتراق پیدا کرنے کا سبب قرار دی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی اردو کو اپنی مادری زبان قرار دے اور اس بنا پر اس کی توقع رکھے کہ اس زبان کی حفاظت و ترقی میں اس کی مدد کی جائے گی تو اس میں کیا قباحت ہے جب کہ وہ ہر طرح اور ہمہ وقت ہندی کو قومی، ملکی، حکومتی زبانوں اور حکومت کو سیکولر جمہوریہ حکومت مانتا ہو اسی طرح اگر وہ یہ بھی کہے کہ اردو اس کی تہذیبی، علمی اور ادبی زبان ہونے کے ساتھ مذہبی زبان بھی ہے اس لیے اردو کی حمایت کی جائے اور اس کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے تو اسے قومی و ملکی مفاد و مقاصد کا منافی کیوں قرار دیا جائے؟

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی مادری زبان وہاں کے باشندوں کی مذہبی، تہذیبی، علمی اور ادبی زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اگر کسی جماعت یا قبیلے کی مادری زبان اور مذہبی و تہذیبی زبان ایک ہی ہو تو بدگمان نہ ہونا چاہیے، نہ اس زبان سے کام لینے والوں سے! چنانچہ اردو کی حمایت اس بنا پر کرنا کہ وہ بیش تر

ہندی مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کے ساتھ ان کی مذہبی، تہذیبی، علمی وادبی زبان ہے، کوئی بُری بات نہیں ہے دوسری دیسی زبانوں کے مقابلے میں اردو کا یہ امتیاز بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی زبان نہ ہونے کے باوجود، ان میں سے بہتوں کی وہ مادری، تہذیبی، ادبی وعلمی زبان بھی ہے!

اس سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ اردو بولنے والے جب اپنی زبان کے لیے وہ سہولتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں جو عام طور سے کسی زبان کی نشوونما کے لیے ضروری ہیں تو اس سے محض ایک زبان کو باقی رکھنے کے فطری جذبے کی تسکین مقصود نہیں ہے۔ اردو کی حفاظت وتوسیع کا بنیادی مقصد اس تہذیب کی بقا اور ترقی سے عبارت ہے جو ہندوستان ہی کی مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کی باہمی مفاہمت و یگانگت سے وجود میں آئی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ اردو آج بھی ہندوستان کے مختلف تہذیبی عناصر میں اس جذباتی ہم آہنگی کو پیدا کرنے میں غیر معمولی حد تک معین ہوسکتی ہے جس کی ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کا سب سے نمایاں امتیاز ہے کہ وہ مختلف تہذیبی عناصر کی موجودگی اور ان کے اثرات کے خوش گوو خوش آئند امتزاج سے عالمی تہذیب کا مظہر بن گئی، اور اس طور پر ہندوستانی ریاست قومی ہوتے ہوئے ایک عالمی ریاست کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

اس عالمی ریاست کے قیام کے سلسلے میں جو مسائل اور ذمے داریاں درپیش ہیں کم وبیش اسی قسم کے مسائل اور ذمے داریاں، ہندستانی ریاست کی تشکیل میں بھی سامنے آرہی ہیں، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کا اثر دنیا کے آئندہ نقشے پر بہت گہرا پڑے گا! ہم آج عالمی مسائل کے حل میں جو مدد دے رہے ہیں اس کا ثبوت ہم کو خود اپنے ملک کے اندر عملی طور پر دینا چاہیے۔ سچی وطن دوستی اور سچی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں۔ انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے مجھے یقین ہے کہ اردو کے خیر خواہ اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شیدائی تاریخ کے اس چیلنج کو قبول کریں گے جو اس نے ہندوستان کے سامنے رکھا ہے اور جدید ہندستانی تہذیب کی صحت منداور دل کش تشکیل میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔

دو تین سال ہوئے مولوی صاحب نے پاکستان رائٹرس گلڈ میں ایک خطبہ دیا جو بڑی اہم وفکر انگیز دستاویز اور دستور العمل ہے۔ اس میں زبان وادب اور اس کے خدمت گزاروں سے متعلق کتنی بیش بہا باتیں جو صدیوں کے تجربے پر مشتمل تھیں، بڑے پُر درد اور عالمانہ انداز میں کہی گئی ہیں اور ان ادبی وتہذیبی میلانات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کو ترقی دینے کی ذمے داری ادیبوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے ادب کی نشو ونما کو نہ صرف قومی تہذیب وتمدن کو مالا مال کرنے کی کوشش پیہم قرار دیتے ہیں بلکہ بالواسطہ عالمی ادب اور عالمی یگانگت میں قابل قدر اضافے کا وسیلہ بھی مانتے ہیں!

اس سلسلے میں مولوی صاحب نے خاص طور پر فرانس اور ہندوستان کی دو عظیم تہذیبی تحریکوں اور ان کے عظیم معماروں کا نام لیا ہے، ایک فرنچ انسائیکلو پیڈسٹ تحریک کے روح رواں ڈینس ڈی ڈرٹو Denis Diderot 1713-84 اور دوسرے علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خاں کا۔ ایک کو تاریخ کی وساطت سے جانتے تھے، دوسرے کو انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اپنے اس مشاہدے ومطالعے سے انھوں نے جو گہرا اثر قبول کیا تھا اور جس طور اپنی خداداد ذہنی وعملی صلاحیتوں کو اردو کی بڑائی اور بھلائی میں صرف کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اردو کی حفاظت وحمایت کو کسی محدود جماعت یا کسی مخصوص سیاست کی بے جا پاسداری کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ ان کی تہذیبی اقدار وعوامل کی تائید واشاعت کی جائے جن کی ترجمانی وتبلیغ اردو کرتی تھی۔ اتنا تو سب مانتے ہیں کہ اردو جغرافیائی، نسلی، مذہبی اور تہذیبی اختلافات کو جنم دینے کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے، نہ اس کو کسی مطلق العنان بادشاہ یا حکومت نے کوئی 'فرمان واجب الاذعان' جاری کر کے نافذ کیا تھا۔ یہ تو اختلافات کو دور کرنے اور ذہنی یک رنگی وجذباتی یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ملک کے عوام وخواص، امیر وغریب، عالم وعامی کے آزادانہ اتحاد خیال، اتحاد مقاصد اور اتحاد رسم وراہ سے ایک بنیادی جمہوری تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی۔ اس زبان نے جس ادب اور تہذیب کو پیدا کیا اس نے نہ صرف ہندوستان پاکستان میں کروڑوں بسنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا بلکہ دوسری ہمسایہ تہذیبوں کو باہم وگر ربط

دیا اور ان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کے کام کا ہمارے عہد میں وہ درجہ اور ہماری نظر میں وہی منزلت ہے جو متذکرہ صدر رو تحریکوں اور ان کے بانیوں کا دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود اُن مصیبتوں کے جو تقسیم ملک کے آشوب میں مولوی صاحب کو پیش آئیں اور اس نقصان کے جو اُن کے کام اور انجمن کے کتب خانے کو پہنچا، وہ بدستور ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ارادے و استقامت میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ مشورہ کرنے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ اولڈ بوائز لاج میں قیام تھا۔ اضطراب وعزم کی ملی جلی وہ کیفیت اب تک نہیں بھولی جو اُن کے مردانہ نورانی سراپا پر طاری اور رگ رگ میں پیوست نظر آتی تھی۔ تصور میں یہ نقشہ اس لیے واضح و پائیدار ہے کہ اس زمانے میں تقسیم ملک کی عالم گیر ہولناکی اور آس پاس کے سانحات قتل و غارت نے ہر چھوٹے بڑے کو بے قرار و بے بس کر رکھا تھا۔ بوڑھے مجاہد کا یہ جلال و جمال دیکھ کر محسوس ہونے لگتا جیسے آزمائش کا سامنا ہو تو جان مال ناموس احباب اقربا کسی کی پروا نہ کرنا چاہیے، صرف اپنا فرض بجالانا چاہیے، پھر یہ یاد آتا ہے کہ اس مایوسی کو مٹانے اور ہمت و حوصلے کو زندہ رکھنے اور اس سے کام لینے کے لیے غیب سے کیسے 'مردان کار' مامور و مبعوث ہوتے رہتے ہیں، اور اسلاف کے بارے میں جو کچھ بزرگوں سے سنا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے وہ بے کم وکاست صحیح ہو تو کیا عجب!

کئی دن تک گفتگو رہی۔ بالآخر مولوی صاحب مایوس و ملول اس 'متاع کنعان' (اردو) کو لے کر 'بازار مصر' (پاکستان) پہنچے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں وہ اس یوسف کے یعقوب بھی رہے زلیخا بھی۔ اردو کی پذیرائی پاکستان میں کیسی ہوئی اور ہندوستان میں اس کا کیا حال ہے، کھلی ہوئی داستان ہے جس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

مولوی صاحب کراچی پہنچے تو اردو کالج کی بنیاد رکھی۔ انجمن ترقی اردو کی ازسرنو تنظیم کی۔ اردو یونیورسٹی کی مہم کا آغاز کیا۔ اردو کو پاکستان کی قومی و ملکی زبان قرار دیے جانے کی تحریک چلائی اور اپنے تصنیفی، تحقیقی اور تبلیغی کاموں میں اس طرح منہمک ہو گئے جیسے کراچی میں نہیں، حیدرآباد دکن اور دہلی میں کام کر رہے ہوں۔

منعم بہ دشت وکوہ و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت، خیمہ زد و بارگاہ ساخت[1]

منعم ہی پر نہیں مولوی صاحب پر بھی صادق آتا ہے!

کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی۔ اس کے لیے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اردو کی 'وادیِ پُر خار' اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لیے ہمیشہ کسی 'آبلہ پا' کی منتظر رہے گی اور مولوی صاحب جیسا بے زنہار آبلہ پا اس وادی سے اب تک نہیں گزرا!

تمام عمر مولوی صاحب سے زیادہ واضح و مدلل طور پر اردو کے ہندی نژاد ہونے کی شاید ہی اردو کے کسی اور مستند اسکالر نے وکالت کی ہو۔ ان کی تمام عمر یہی بتانے میں گزری کہ اردو باہر سے نہیں لائی گئی، اس نے یہیں جنم لیا اور پروان چڑھی، کسی نے اس کو کسی کے سر نہ تھوپا، یہ جہاں گئی، جس زبان، قوم اور ماحول سے سابقہ پڑا اس کی خوبی لی، اپنی خوبی دی۔ تمام ملک کو جو مدتوں سے طرح طرح سے بٹا ہوا تھا، اس نے متحد و مضبوط کیا۔ اس ملک کو آزادی دلانے میں وہ ملک کی کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ مختصر یہ کہ وہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی مشترک تہذیب و رسم و راہ کی بڑی دل آویز تصویر ہے!

اردو کی ان صفات کی طرف پچھلی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے، یہاں اس کا ذکر اس لیے آ گیا کہ ایک زمانے میں یہ باتیں بالخصوص اردو کا ہندوستان کی مشترک تہذیب کا بڑا صحت مند و مبارک قابل نمونہ ہونا اس کی سب سے بڑی صفت سمجھی جاتی تھی اور اس بنا پر ہر طرف محبوب و مقبول تھی۔ لیکن اس کا یہی سب سے بڑا ہنر اب اس کا سب سے بڑا عیب خیال کیا جانے لگا ہے۔ یہاں تک کہ اردو کی ان صفات پر آج کل زور دینا یا ان کی طرف اشارہ کرنا مخالف عناصر کو اشتعال دینے کا موجب ہوتا ہے! بہ بیں تفاوت رہ!

مولوی صاحب پر چاہے جتنے اور الزام عائد ہوتے ہوں، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اردو ہندی کے مسئلے میں فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتے تھے، بڑی ناانصافی ہوگی۔ مولوی صاحب

---

1 سخی، صاحب دل اور انعام و اکرام سے نوازنے والا شخص اپنی ان صفات کی بدولت حالت مسافرت میں بھی انجمن بنا لیتا ہے۔

سے اس بنا پر بدگمان رہنے والوں کو کیسے یقین دلایا جائے کہ بعض حلقوں سے یہ آواز اکثر سنائی دی ہے کہ مولوی صاحب اس طرح کے یا اتنے مسلمان بھی تھے یا نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ مولوی صاحب کا مسلک اردو تھا، اور شاید وہ خود اُن لوگوں میں تھے جو مذہب سے زیادہ اپنے مسلک کے پابند ہوتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم جیسے پکّے مسلمان اور کھرے انسان تھے، سب جانتے ہیں۔ مولوی صاحب سے بڑی دوستی و بے تکلفی تھی۔ اردو، اسلام، تہذیب، ثقافت اور اس طرح کے دوسرے مسائل پر دونوں میں بڑے لطف کی گفتگو ہوا کرتی۔ مولوی صاحب جب بھی علی گڑھ آتے 'خانقاہ سلیمانیہ' میں مولانا کے یہاں چائے پیتے اور ان کی بے تکلف و دلچسپ گفتگو سننے کے لیے حلقہ نشیں جمع ہو جاتے۔ عربی کے صفات پر مولانا زور دیتے، مولوی صاحب اردو کے گن گاتے۔ یہ صحبتیں سالہا سال رہیں۔ مولانا نے مولوی صاحب کو 'کالا کافر' کا لقب دے رکھا تھا اور ہم لوگوں کو اپنے یہاں کی نشست کی دعوت ہی یہ کہہ کر دیتے تھے فلاں وقت آجانا 'کالا کافر' آیا ہوا ہے!

مولوی صاحب امرا و شرفا کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اچھی جگہ اچھا مکان، اچھا ساز و سامان، اچھا کھانا، مہمانوں کی تواضع و تکریم، سیر و سفر کا شوق، احباب کے دکھ درد کے شریک، علما کا احترام ارباب اقتدار سے مساوی سطح پر ربط و ضبط، دُھن کے پکّے عمدہ چیزوں کو حاصل کرنے، نایاب نسخوں اور کتابوں کو حاصل کرنے کا شوق، غرض ان میں وہ تمام خصائص و خوبیاں ملتی ہیں جو اس عہد کے اکابر میں عام تھیں۔

مولوی صاحب نے علی گڑھ کے عہد طالب علمی سے قیام دکن و دہلی کے زمانے تک کم و بیش 70 سال جس ماحول میں زندگی بسر کی اور کام کیا وہ امیرانہ و آمرانہ تھا جس کو یکسر بدلے ہوئے حالات میں نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے یہ بھی ایک سبب تھا کہ تقسیم ملک کے بعد کراچی تشریف لے گئے تو غیر متوقع طور پر ایسے گرد و پیش سے دوچار ہوئے اور ایسے حالات و حوادث کا سامنا ہوا جن سے تمام عمر سابقہ نہیں پڑا تھا۔ آمرانہ مزاج عوامی مطالبے کا متحمل نہ ہوا۔ مولوی صاحب کی زندگی کا یہ بڑا اندوہ ناک باب تھا۔ اسے ملٹری حکومت کے

حسنات میں سمجھا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے مولوی صاحب اور اُن کی انجمن کو از سرنو سرفراز و بحال کیا۔

بہت دن ہوئے یونیورسٹی یونین میں ایک جلسہ تھا۔ تقریب یاد نہیں رہی، مولوی صاحب موجود تھے۔ خلاف معمول کسی قدر مضمحل و فکر مند۔ حاضرین نے تقریر کی فرمائش کی، تیار ہوئے، بڑے تھکے اور غمگین لہجے میں کہنا شروع کیا، اے صاحبو! کیا تقریر کروں، معلوم نہیں آپ کیا سننے کے مشتاق ہیں۔ مجھے تو تمام عمر ایک ہی رنگ رنگنا آیا اور وہ اموا رنگ ہے یعنی اردو۔ اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے جیسے یادوں کے کھنڈر یا تجربات کے خارزار میں کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ اس کے بعد تقریر شروع کر دی۔ اموا رنگ رنگنے کا فقرہ جس درد و درماندگی سے کہا تھا کہ آج تک ذہن میں گونج رہا ہے۔

مشرقی پاکستان میں اردو کو لازمی یا حکومتی زبان قرار دیے جانے کی جو کوشش مولوی صاحب یا دوسروں نے کی اس میں جس ناخوش گواری کا سامنا ہوا وہ سب جانتے ہیں۔ حالات میں اعتدال آئے گا تو اس کو وہیں آنا پڑے گا، جہاں مولوی صاحب لانا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی مولوی صاحب کی تحریک کو قبل از وقت تو کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔ مشرقی بنگال کو دیر یا سویر علاقائیت کی تنگ نائے سے اپنے کو باہر نکالنا پڑے گا۔ جہاں اچھے شاعر اور شناور پیدا ہوتے ہوں وہاں حدود و حصار دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوتی ہیں وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی حاصل کر لیتی ہیں لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کیے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں وہ بڑی مدت میں 'بعد از خرابیِ بسیار' ان سے نجات پاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان بندشوں سے کون کب رہائی حاصل کرتا ہے! سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق پاکستان میں اردو کو جو درجہ دلانا چاہتے تھے وہی منصب ہندوستان کی حکومت ہندی سے ہندوستان میں حاصل کرنا چاہتی ہے اور دونوں حق بجانب ہیں اس لیے کہ ریاستوں کی زبانیں اپنے حدود کے اندر اپنے باشندوں کے لیے اپنے اپنے طور پر کتنی ہی اہم

کیوں نہ ہوں اور حکومت کو ان کی اہمیت کو من وعن تسلیم بھی کرنا چاہیے، جس حکومت پر وہ ریاستیں مشتمل ہیں اس کی (سرکاری) زبان کے رشتے میں ان تمام ریاستوں اور زبانوں کو یقیناً منسلک ہونا چاہیے، خواہ حکومت یا مرکز کی زبان تمام دوسری زبانوں سے مختلف اور علاحدہ کیوں نہ ہو۔ اس کے بغیر وہ مختلف النوع اور نہایت درجہ اہم گرفت نہیں قائم رکھی جا سکتی جو مشمولہ ریاستوں پر مرکز کی از بس ضروری ہے اور وہ ربط بھی بروئے کار نہیں آسکتا جو ریاستوں کا ایک دوسرے سے ہونا چاہیے۔ اس طرح ایک ایسی زبان کو بھی اختیار کرنا لازم آتا ہے جو بین الاقوامی و بین مملکتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو۔ یہی نہیں اگر کبھی دنیا کا کاروبار آسمان پر بھی پھیل گیا تو آسمان والوں کی بھی کسی نہ کسی ایک زبان کا سیکھنا ہم پر لازم آئے گا، اور ہم سے زیادہ شاید آسمان والوں کو ہماری زبان کے سیکھنے میں اتنا نہیں جتنا سیکھنے کے لیے کسی ایک زبان کے انتخاب کرنے میں دقت پیش آئے تو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ بہر حال ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی زبان بدیسی نہیں ہے اگر وہ دیس کے کاموں کے لیے مفید و کار آمد ہو۔

مولوی صاحب میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج و ماحول کا خاصا ہیں جو مولوی صاحب کا تھا، لیکن ان کو معرض بحث میں لانا ضروری نہیں سمجھتا۔ انسانی ذہن اور آئندہ نسل میں انسان کی فضیلتوں ہی کی یاد باقی رہے تو اچھا ہے! خوبیوں کو جتانا اور کمزوریوں کو نظر انداز کرنا کسی اور آئین کے مطابق ہو نہ ہو، آئین سیرت نگاری کے مانے ہوئے ضوابط کے خلاف یقیناً ہے جہاں ہر شخص کے کھرے کھوٹے کو علاحدہ کرکے دکھاتے ہیں۔ میں سیرت نگاری کے فرائض انجام دینے کے منصب پر فائز ہونے یا کیے جانے کا خواہش مند بھی نہیں ہوں۔ کسی کی خوبیاں جتانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا، اس لیے کہ دیکھا اکثر یہ جاتا ہے کہ بُرے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی طرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بداعمالی و بے راہ روی کے جواز میں چُن لیتے ہیں۔

یہاں ایک عزیز کا سنایا ہوا لطیفہ یاد آتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی ضخیم انگریزی ڈکشنری شائع ہوئی تو چند دنوں بعد موصوف کی خدمت میں ایک خاتون تشریف لائیں اور فرمایا: ڈاکٹر

صاحب آپ نے اس لغت میں فحش الفاظ کثرت سے شامل کر دیے ہیں! ڈاکٹر جانسن نے جواب دیا: محترمہ آپ نے تلاش ہی ایسے الفاظ کیے!!

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چُپ رہنا ہے اور دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے۔ اس طریقۂ کار سے فن کا حق ادا ہوتا ہو یا نہیں یہ فن کار اور اُن کے مربّی یا محتسب جانیں، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فن کار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ انسانی زندگی کی تمام خامیوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے ہی کی نہیں ان کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی جاتی ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے انکشافات ان کمزوریوں کے حق میں ہیں۔ لیکن اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ سائنس اور فلسفے کے علاوہ انسان ہی کے مدوّن کیے ہوئے کچھ اور علوم و انکشافات بھی ہیں جو انسان کے حیوانی تقاضوں کو قابو میں رکھنے اور ان کو عمل صالح میں ڈھالنے کے حق میں ہیں۔ نباتات کا ماہر کسی اچھے پھل پھول کے درخت کو اصل کی طرف لوٹ جانے (یعنی جنگلی ہو جانے) کے حق میں نہ ہوگا بلکہ طرح طرح کی ترکیبوں اور تجربوں سے اس کی کوشش کرے گا کہ اس پھل یا پھول کی جنگلی صلاحیتیں مزید خوب صورتی اور افادیت کی صلاحیتوں کا باعث بنتی جائیں اور وہ پھل یا پھول بہتر سے بہتر ہوتا جائے۔ جانوروں میں بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ صرف انسان ایسا ہے جس کو انسان دورِ وحشت کی طرف رُخ کرنے اور مائل رہنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے لیے سائنس اور مشین کی تمام برکتیں فراہم کرتا رہتا ہے۔

موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فن کار، سائنس اور سائنس کار کو انسان و انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو! حالاں کہ ان دونوں کو ہر حال میں انسانیت کا تابع رہنا چاہیے۔ جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو وہاں عرش پروازی زبردست خطرہ ہے۔ اس سے سائنس یا فن کی تنقیص یا توہین منظور نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بھی انسان کی بہترین صلاحیتوں کا ثمرہ ہیں، مقصود دراصل دونوں کے لیے مناسب مقام (حفظِ مراتب) کا تعیّن ہے!

30-35 سال اُدھر سب سے پہلے علی گڑھ میں مولوی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہو تھا، اس وقت بھی سنِ رسیدہ ہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ذہانت، زندہ دلی، محنت و مستعدی کا جو عالم اس وقت تھا وہ ان میں آخر دم تک قائم رہا۔ توانائی کا معلوم نہیں کیسا لازوال خزانہ ان میں ودیعت تھا۔ تھکنا، مایوس ہونا، ہار ماننا تو جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔ چھوٹے بچوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں انرجی (توانائی) پیدا زیادہ، خرچ کم ہو پاتی ہے۔ اس لیے نچلے نہیں بیٹھ سکتے، ہر کام میں بلند آہنگی، تیزی اور قوت آزمائی کا مظاہرہ، نہ خود چین سے بیٹھیں گے، نہ دوسروں کو بیٹھنے دیں گے۔ اس کے بعد بھی توانائی کا پورا کوٹا خرچ نہیں کر پاتے! مولوی صاحب کا بھی کچھ اس طرح کا حال تھا۔ بچوں ہی کی مانند ان میں شوخی و شگفتگی تھی۔ کسی بات کا کیسا ہی ردِ عمل ہو فی الفور اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، بچوں ہی کی طرح جلد خفا اور جلد خوش ہو جاتے۔ بچپن کی نعمتوں کا کیسا اور کتنا عجیب و قیمتی اندوختہ مولوی صاحب کے حصے میں آیا تھا کہ اس نے ان کو اکیانوے سال تک بوڑھا نہ ہونے دیا!

اردو سے ان کا یہ شغف دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غریب ماں اپنی تنہا لڑکی کے جہیز کے لیے ہر طرح کا اچھا اور کارآمد سامان جلد سے جلد جہاں جس سے جس قیمت پر بن پڑے، فراہم کر لینا چاہتی ہو اپنی لڑکی کے بارے میں پاس پڑوس کی کوئی ایسی ویسی بات مشہور کرتے سُن پائے تو بپھر جائے اور اس کی بریت میں وہ سب کر گزرے جو صرف ایک ماں اپنی لڑکی کے لیے کر سکتی ہے اور اسی بنا پر تعریف کے بھی قابل ہوتی ہے اور درگزر کی مستحق بھی!

مولوی صاحب کے تیور اور طور طریقوں کا اس ایک واقعے یا لطیفے سے اندازہ لگائیے، حیدرآباد کے اعیان و اکابر کے لیے لازم تھا کہ مقررہ سرکاری لباس میں دربار یا سرکاری تقریبوں میں حاضر ہوا کریں۔ ایسے ہی ایک موقع پر ہز اگزالٹڈ ہائنس نے مولوی صاحب کو ان کو اپنے معمولی لباس ترکی ٹوپی اور شیروانی میں موجود پایا، دوسرے دن ندیم سلطانی نے حاضر ہو کر مولوی صاحب کو اعلیٰ حضرت کی ناگواری خاطر کی اطلاع دی اور فرمانِ سلطانی سے آگاہ کیا کہ آئندہ دربار کے مقررہ لباس میں حاضر ہوا کریں۔ مولوی صاحب نے نامہ بر کو اپنی ناگواری خاطر نہیں، برہمی مزاج سے نوازا اور آخر میں فرمایا: جاؤ کہہ دینا میں اپنے لباس کو ترک نہ کروں گا، اس نے

معلوم نہیں وہاں جا کر کیا کہا اور کیسے کہا، کچھ دنوں بعد اسی طرح کی ایک تقریب میں پھر سامنا ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت نے ندیم خاص سے جو ہم رکاب تھے پوچھا: کیوں یہ وہی مولوی ہے؟ اس نے سر جھکا کر عرض کیا: 'حضور وہی'۔ پھر فرماں روائے دکن اور 'مجذوب دکن' اپنے اپنے راستے پر ہو لیے!

پچھلے سطور میں کہیں اقرار کر آیا ہوں کہ اس مضمون کے آخر میں مولوی صاحب کے فرمودات سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کروں گا۔ مقصد یہ تھا کہ اس سے ان کی سیرت، شخصیت، نقطۂ نظر، وسعت علم، اصابتِ فکر اور دوسرے صفات کے مختلف پہلو سامنے آتے اور اندازہ ہو سکتا کہ جن خیالات، جذبات و افکار کے اظہار کے لیے انھوں نے جو زبان، لہجہ اور اسلوب اختیار کیا ہے وہ موقع و محل کے اعتبار سے کتنا حسبِ حال ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی کہ اعلیٰ شخصیت اور اعلیٰ انشا پردازی کس طرح ایک دوسرے سے نشو و نما پاتے اور ایک دوسرے کو جلا دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ یہ کام اتنا مشکل نہ ہوگا جتنا کہ اس وقت معلوم ہوا جب ان اقتباسات کے انتخاب و ترتیب کا مرحلہ آیا۔ متوقع کتابوں اور تحریروں کے نہ ملنے پر مایوسی بھی ہوئی لیکن جو دستیاب ہو چکی تھیں وہ بجائے خود اتنی تھیں کہ ان کو پڑھ کر مناسب حال ادب پاروں کا انتخاب کرنا مشکل معلوم ہونے لگا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی ہوا کہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا یہ دشواریاں اس طرح ہجوم کر کے اس شکل میں آئیں کہ بڑی خوشی اور آسانی سے ہمت ہار بیٹھا! اور اسی آسانی سے یہ بھی یقین کر لیا اور خوش ہوا کہ اپنی ہی یونیورسٹی کا اردو کا کوئی اچھا طالب علم اس کام کو شوق محنت اور قابلیت سے مجھ سے کہیں بہتر طور پر انجام دے گا۔

یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مولوی صاحب طالب علموں کو بہت عزیز رکھتے تھے، اکثر ان کے پیچھے دوستوں سے بگاڑ کرنے میں تامّل نہ کرتے۔ مولوی صاحب اردو میں جدید تحریکات و تجربات کرنے والوں میں اس وقت بھی نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے جب بوڑھوں میں بھی ان جیسا بوڑھا مشکل سے ملتا تھا۔ جدید کے محرکات کچھ ہی ہوں مولوی صاحب کو اردو کے لیے نفع ہی نظر آتا تھا۔ جوانی اپنے اوپر بڑھاپے کا کوئی حق نہیں تسلیم کرتی لیکن مولوی صاحب جیسے بوڑھے کا حق نوجوان کی آئندہ نسلوں پر ہمیشہ رہے گا۔ بات وہی ہے جو پہلے عرض

کر چکا ہوں یعنی مولوی صاحب نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے، تخیل میں، عزم میں، عمل میں۔ اس لیے ماتم اس کا اتنا نہیں ہے کہ مولوی صاحب رحلت فرما گئے بلکہ اس کا ہے کہ وہ نوجوانی میں ہم سے جدا ہو گئے۔

اس بنا پر یہ امید کرنا کہ مولوی صاحب کے نام اور کام کو روشن کرنے اور رکھنے کے لیے طالب علم سامنے آئیں گے، بے جا نہیں ہے!

(مطبوعہ: 1۔ سہ ماہی فکر ونظر (علی گڑھ) اکتوبر 1961، 2۔ العلیم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر 1961۔ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم'' کے عنوان سے)

●●●

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد
(1873-1947)

ڈاکٹر ضیاء الدین کا تعلق ماہرہ کے کنبوہ خاندان سے تھا۔ 1873 میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ معین الدین تھا جو محکمہ مال میں ملازم تھے۔ ضیاء الدین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ میرٹھ سے مڈل کا امتحان پاس کر کے 1889 میں وہ ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ چوں کہ علی گڑھ کالج میں سائنس نہیں تھی اس لیے انٹر الہ آباد سے پاس کیا۔ ریاضی سے ان کو بالخصوص فطری لگاؤ تھا۔ علی گڑھ میں بی۔ اے میں ریاضی اضافی مضمون کے طور پر لیا اور 1895 میں اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے۔

ایم۔ اے۔ او کالج میں ان کو اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تھیوڈر بیک اور چکرورتی ان کی ذہانت اور قابلیت کے معترف تھے۔ سرسید بھی ان کی کارکردگی اور کالج سے محبت کی بنا پر ان سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو علی گڑھ کالج سے والہانہ لگاؤ تھا۔ انھوں نے یہاں رہ کر تعلیمی خدمات کے علاوہ دیگر قومی خدمات بھی انجام دیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کالج کے پرنسپل کے عہدہ سے لے کر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور وائس چانسلر کے عہدہ تک فائز رہے۔ انجینئرنگ کالج قائم کیا اور میڈیکل کالج کے قیام کے

لیے جدوجہد کی۔ نان کوآپریشن اور خلافت تحریک کے نازک دور میں یونیورسٹی کے وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اپنی حکمت عملی سے اسے دور کیا۔

رحمت اللہ کمیٹی رپورٹ کے نتیجہ میں ان کو استعفیٰ دینا پڑا لیکن دوبارہ وہ وائس چانسلر منتخب ہوئے۔

آخر عمر میں انگلستان کے سفر پر تھے کہ 13/دسمبر 1947 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ جنوری 1948 میں ان کا جنازہ علی گڑھ لایا گیا، اور سرسید کے پہلو میں ان کو دفن کیا گیا۔

(تفصیل کے لیے دیکھئے ضیائے حیات از محمد امین زبیری)

o

میرے دیار (اضلاع مشرقی) اور اسکول کے دنوں میں یہ خیال عام تھا اور ایسا خام بھی نہ تھا (عام اور خام کی رعایت کی معذرت چاہتا ہوں اس لیے کہ اس ہنر کا التزام ان اطراف میں بھی بہت مقبول تھا) کہ ریاضی میں مسلمان بالعموم کمزور ہوتے ہیں، جس کا سب سے نمائندہ نمونہ اپنے کو سمجھتا تھا۔ چنانچہ رسوائی اور محنت سے بچنے کے لیے ریاضی پر اتنی توجہ صَرف نہیں کرتا تھا جتنا اپنے مسلمان بنے رہنے پر۔ بڑا ہوا، زمانہ اور زندگی ہی نہیں مسلمانوں کے بھی چلن دیکھے تو معلوم ہوا کہ میرے جیسے مسلمانوں کی کمی نہیں۔ اسکول ہی میں خبر مشہور تھی، اور اس کا تذکرہ اس شوق سے کیا جاتا جیسے یہ حقیقت افسانہ ہو یا افسانہ حقیقت کہ علی گڑھ میں ایک ڈاکٹر ضیاء الدین ہیں جن کی ریاضی میں مہارت کی دھوم ولایت تک ہے۔ وہ بڑے سے بڑے عبارتی سوال زبانی حل کر دیتے ہیں۔

معلوم نہیں اب اس لفظ 'عبارتی' کا مفہوم کسی کے ذہن میں باقی رہ گیا ہے یا نہیں۔ جب ریاضی اتنی عبارتی نہیں رہی جتنے عبارتی مسلمان اس زمانے میں۔ ریاضی کے سوالات دو قسم کے ہوا کرتے، ایک کسر کے جن میں صرف ہندسے اور طرح طرح کے علامات ہوتے، دوسرے عبارت میں ہوتے جن کے ہیرو زید، عمر، بکر یا سود در سود یا مختلف سمتوں سے دو تیز آنے والی ریل گاڑیاں ہوتیں جو ایک دوسرے سے ٹکرانے کے بجائے ایک دوسرے سے پہلو بچا کر نکل جاتیں یا وہ کیڑا جو کسی ستون پر جتنا چڑھتا اس سے زیادہ ورنہ اتنا ہی نیچے سرک آتا۔ ریاضی میں جو نیازمند تھے ان کو تھوڑی سی پناہ کسر کے سوالات میں مل جاتی۔ عبارتی سوالات ہم میں

سے کسی کے بس کے نہ تھے۔ ریاضی کے ان مقتولین یا معصومین میں اکثر اس کا مقابلہ رہتا کہ کون کس ارتھ میٹک سے کتنے بڑے سے بڑے سوالات ڈھونڈ لاتا ہے۔ پھر فرصت کے اوقات میں اس کو اس شوق سے پڑھتے جیسے آج کل جاسوسی ناول پڑھے جاتے ہیں اس کے بعد ریاضی کے اپنے اپنے ہیروؤں کی طرح ذہن منتقل ہوتا کہ وہ اس سوال کو حل کر سکتا تھا یا نہیں۔ اس پر بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ کسی کا ہیرو اس سوال کو کر سکتا تھا، اس لیے یہ صحبت اکثر بدمزگی پر ختم ہو جاتی۔

لنگڑی کسر کا مفہوم یا شکل دیکھنے میں ایسی ہوتی جیسے بے شار کنکھجورے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوں۔ کسر کے ان سوالات کا اُتا پتا ہم میں ہر شخص کسی دوسرے کو بتائے بغیر ذہن میں محفوظ کر لیتا تا کہ وقت ضرورت ریاضی کے کسی سورما کی آبرو ریزی کی جا سکے۔ ہم کو ریاضی داں ہونے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی ریاضی کے مربی یا مفکر ہونے کی اور کیسے کیسے جتن اس کے لیے کیے جاتے تھے وہ آج تک یاد ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ولایت سے ریاضی کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ڈگریاں لائے ہیں اور اب ریاضی کا کوئی حل طلب مسئلہ باقی نہیں رہا۔ یہ مژدہ ان ساتھیوں کو جو میری طرح ریاضی میں صفر تھے سنایا جاتا۔ منطق کچھ اس طرح کی ہوتی کہ ہم اور ڈاکٹر صاحب ایک عہد میں ہیں اور مسلمان بھی ہیں اس لیے ڈاکٹر صاحب ہم جیسے ہوں یا نہیں، ہم ان جیسے ضرور ہیں! علی گڑھ آیا اور ریاضی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی لیکن اس کی تہ میں منطق وہی تھی جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے ہم عصر ڈاکٹر گنیش پرشاد کی ریاضی کی بھی بڑی شہرت تھی، یہ کوئنس کالج بنارس میں پروفیسر تھے۔ مسلمان طالب علموں کے لیے یہ بھی عجوبہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہم میں ہر ایک چاہتا تھا کہ کسی طرح ایک نظر ان کو دیکھ لے۔ ہائی اسکول کا امتحان دینے بنارس جانا ہوا۔ اتفاق سے کوئنس کالج امتحان کا مرکز تھا۔ پہلے ہی دن خبر ملی کہ ڈاکٹر گنیش پرشاد تشریف لا رہے ہیں۔ امتحان میں شریک ہونے والے ہم سب امیدوار ایک جانب مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نمودار ہوئے۔ قد و قامت چہرے مہرے کے اعتبار سے

غیر معمولی نہ تھے لیکن ریاضی میں ان کے باکمال ہونے کا ہم پر ایسا اثر تھا جیسے ہم کسی یورپین کلکٹر اور مشرقی دیوتا دونوں کی زد میں ہوں۔ برآمدے میں آئے تو ایک چپراسی نے آگے بڑھ کر ان کے جوتے صاف کردیے۔ دوسرے نے آفس کی چلمن اٹھائی اور ڈاکٹر گنیش پرشاد بغیر کسی طرف نظر اٹھائے کمرے میں داخل ہوگئے، ہم نے اطمینان کا سانس لیا جیسے ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگئی اور ایک موہوم خطرے سے بھی بچ گئے۔ کبھی کبھی ہندو ساتھیوں سے اس پر گرما گرم بحث بھی ہوجاتی کہ ڈاکٹر گنیش پرشاد افضل تھے یا ڈاکٹر ضیاء الدین۔ آج کے دن ہوتے تو اس اختلاف پر معلوم نہیں کیسا اختلال برپا ہوجاتا۔ لیکن اس زمانے میں آپس کے معاملات کو مذہب سے قطعاً دور، علاحدہ اور بلند رکھتے تھے اور اس بحث کو تفریحی، اُلٹے سیدھے کسی فقرے پر ختم کردیتے۔ دوسری طرف ہم مسلمان طالب علم اس فارمولے کو معرض بحث میں لائے یا آپس میں کسی کو بتائے بغیر قبول کرلیتے اور مطمئن ہوجاتے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین برتر تھے اس لیے کہ ہم سب میں وہ تنہا ریاضی کے فن میں کامل تھے۔ دوسروں کا کیا ان کے ہاں تو سبھی ڈاکٹر گنیش پرشاد ہوتے ہیں۔

امتحان ختم ہوا تو ساتھیوں نے ہندو کالج دیکھ آنے کا پروگرام بنایا کالج کے حدود میں داخل ہوئے تو پوچھنے پر ایک شخص نے بتایا کہ سامنے جو مندر دکھائی دیتا ہے وہاں چلے جاؤ سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ مندر کے آس پاس کچھ لوگ تھے جن میں دو خاص طور پر نمایاں تھے۔ دونوں یوروپین، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک مسز اینی بسنٹ [1] تھیں۔ دوسرے مسٹر جی۔ ایس۔ آرنڈیل، مسز بسنٹ اپنی تحریک تھیں سوفی، تقریروں، ہندو کالج سے شیفتگی اور تند سیاسی رجحانات کے سبب سے تمام ملک میں مقبول و محترم تھیں ان کو دیکھ کر ہم سب بہت متاثر ہوئے ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کا دبدبہ اور ایک پُراسرار کشش ملتی تھی۔ مسٹر آرنڈیل کالج کے پرنسپل یا اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نامطبوع حد تک سپید رنگت، سپید ہی دھوتی کرتے میں، ملبوس، لباس، رنگ، نسل و نژاد گرد و پیش کہیں بھی کوئی مناسبت نظر نہ آتی۔ شاید یورپین لباس بھی نہ سجتے ہوں۔

---

1 اینی بسنٹ (1847-1933)

مندر بڑا خوش نما تھا۔ سب سے زیادہ دل کش اور پُرکشش ایک دیوی کی مورت تھی۔ غالباً علم کی دیوی سرسوتی کی۔ پتھر میں نسوانی حسن اور ماورائی تقدس کو اس طرح یک جا کر دینا کہ کون کہاں شروع اور کہاں ختم ہوتا ہے یا دونوں کو علاحدہ علاحدہ دیکھنا اور سمجھنا دشوار ہو جائے انسانی ہنر کا معجزہ ہے۔ مندر کے دروازے پر یا مجسمہ کے آس پاس سنسکرت کا یہ فقرہ کندہ تھا 'ودّیا دھرمے شوبھتے' آٹھویں جماعت تک ہندی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھی تھی اس لیے بغیر کسی مدد کے یہ کتبہ پڑھ گیا اس کے جو الفاظ تھے وہ اسکول میں اکثر کانوں میں پڑا کرتے تھے اس لیے اپنے اطمینان کے معنی بھی پہنا لیے یعنی علم اور ایمان سے نفس انسانی کی آراستگی ہوتی ہے۔ صحیح یا غلط اس وقت یہی بتایا گیا کہ جو کچھ سمجھا تھا وہ غلط نہ تھا۔ خیال آتا ہے کہ علم اور دھرم کے ہندو تصور کو اگر یک جا اور مجسم دیکھنا چاہیں تو ایسا ہی نسوانی پیکر موزوں ہوسکتا ہے جیسا کہ سرسوتی دیوی کا تھا اس کی بھی خوشی ہوئی تھی کہ سنسکرت سمجھ سکا۔ وہ بھی ایسی سنسکرت جو ادھر اُدھر نہیں، خاص بنارس کے شوالے پر نقش تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اور آتی ہے تو کتنی دوسری باتوں کو بھلا دینے والی ہوتی ہے کہ طلوع تہذیب کی اوّلین کرنوں سے روشنی اور گرمی پا کر کچھ سیدھے سادے اَن پڑھ اَن گھڑ لوگوں نے اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے جو دو چار کلمے کہہ دیے وہ آج ان تمام مفروضات و مسلّمات پر بھاری، انسانی فکر و فن کی ترقی و تگ و تاز کی کبھی بھی نفی نہیں کرتے بلکہ ترغیب دیتے تھے۔

علی گڑھ آ کر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو دیکھا۔ میانہ قد، بھرا بھرا جسم اعتبار و یگانگت کو دعوت دیتا ہوا چہرہ، مختصر سیاہ گول گھنی داڑھی، ترکی ٹوپی، معمولی انگریزی لباس، نرم سخن، کچھ سوچتے کچھ کہتے یا کرتے تکلفات سے قطعاً بری لیکن قدیم شریفانہ آداب و انداز کا پورا لحاظ اور رکھ رکھاؤ۔ بچوں اور طالب علموں سے ایسا لگاؤ جیسے انھیں کے لیے بنائے اور بھیجے گئے ہوں۔ طالب علموں اور معمولی متوسط لوگوں میں اسی طرح گھومتے پھرتے اور ان سے لطف و شفقت کی باتیں کرتے تھے جیسے وہ ماہر ریاضیات ہی نہ تھے بلکہ بعض ایسے اعلیٰ صفات کے بھی حامل تھے جن کا ہم کو پہلے علم نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی محبت اور مخالفت کو دیکھنے پرکھنے کے مواقع کم و بیش 32 سال تک ملتے رہے۔ اس طویل مدت کے تاثرات و تجربات کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں

گنجائش نہیں ہے۔ نہ شاید بیان کرنے کی زندگی اب مہلت دے۔ لیکن علی گڑھ کی بڑائی اور بھلائی اور مقصود و موقوف کا ذکر یا موقع ہوا اور اپنے اور اپنوں کو جن حالات میں آج دیکھتا اور پاتا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحب کو یاد کیے یا ان کی یاد دلائے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ کیسا وقت آ گیا ہے، کتنی حسرت و عبرت کہ وہ زندگی میں جتنے معمولی معلوم ہوتے تھے مرنے کے بعد آج کتنے محبوب، کتنے محترم اور کتنے بے مثل معلوم ہونے لگے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بی۔ ایس۔ سی اور ان کے ایک ساتھی ممالک متوسط کے رہنے والے ولایت اللہ صاحب بی۔ اے آرٹس میں یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن لائے تھے۔ دونوں کو ڈپٹی کلکٹری کا آفر ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ وہ کالج، قوم اور ملک کی خدمت کو حکومت کی ملازمت پر ترجیح دیں گے۔ ان کے اس فیصلے کا سرسید پر گہرا اثر پڑا۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک تحریر میں بڑی محبت اور افتخار سے کیا ہے۔ سرسید کو اپنے مقصد اور مشن کی اوّلیں کامیابی کی جھلک ڈاکٹر صاحب کے اس عزم و ایثار میں نظر آئی۔ ہر مسیح اپنا حواری پانے پر اسی طرح مسرور و مطمئن ہوتا ہے اور کیسا حواری جس نے اپنے مسیح کے مشن کو اس تندہی قابلیت اور وفاداری سے ہر دم اور ہر حال میں آگے نہ بڑھایا ہوتا تو مسیح اور مشن کو وہ برکت اور پائندگی نصیب نہ ہوتی، جو ہوئی اس زمانے میں قوم اور خدمت کا وہ تصور نہ تھا جو آج کل ہے جب خدمت یا لیڈرشپ کا تصور خود کے نفع کو جماعت کے ضرر پر اور پارٹی کے مفاد کو ملک کے مفاد پر ترجیح دینا رہ گیا ہو۔ ہم میں بہتوں کو تعجب تھا کہ ڈاکٹر صاحب ڈپٹی کلکٹری پر قوم کی خدمت یا کالج میں معلّم ہونے کو کیوں ترجیح دی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہمارے دنوں میں ڈپٹی کلکٹری کے معنی آمدنی و اقتدار کے اور قوم کا مفہوم حکومت سے لڑائی مول لینے یا اردو اخبارات میں مضمون لکھنے کا تھا۔

ولایت[1] اللہ صاحب نے ڈپٹی کلکٹری قبول کر لی اور حکومت کے بڑے مدارج پر فائز ہوتے رہے، مدھیہ پردیش (سی پی) میں ان کی بڑی مان دان تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ولایت اللہ صاحب میں بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کالج اور کالج کے طلبا کی

1۔ ولایت اللہ، علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور جسٹس ہدایت اللہ، کے والد۔

امداد میں ان سے بڑا کام لیا۔ اس کا اعتراف ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہو کر کیا کرتے تھے۔
ہدایت اللہ صاحب ریٹائرڈ چیف جسٹس سپریم کورٹ دہلی ان ہی ولایت اللہ صاحب کے نام ور
فرزند ہیں جن کے پریسیڈنٹ جمہوریہ ہند کے انتخاب اور والیان ریاست کی پریوی پرس کی ضبطی
سے متعلق مقدمات کے فیصلوں کو تاریخی اہمیت اور ہندوستان گیر شہرت ہو چکی ہے۔ اس سال
ہدایت اللہ صاحب یونیورسٹی کنووکیشن کا خطبہ دینے تشریف لائے تھے۔ طلبا نے ان کا استقبال
بڑی دھوم اور گرم جوشی سے یونیورسٹی یونین میں کیا۔ سپاس نامے میں ان دشواریوں خطروں اور
نزاکتوں کا ذکر کیا گیا تھا جو کچھ دنوں سے یونیورسٹی کو پیش تھے، جن کے سبب سے یونیورسٹی کے
تمام بہی خواہ نہایت درجے غیر مطمئن و مضطرب تھے۔ طلبا کی گزارش اور مہمان کا پُر خلوص، تشفی
آمیز اور حوصلہ افزا جواب سن کر، گزرے ہوئے وہ دن یاد آ گئے جب ولایت اللہ صاحب علی گڑھ
تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں مقیم ہوتے اور سی۔ پی (مدھیہ پردیش) کے مسلمان اور
علی گڑھ کے مسائل پر ایک دوسرے اور اسٹاف کے بعض سینئر اراکین سے مشورے ہوتے اور ان
کے حل تلاش کیے جاتے کتنا عجیب اور امید افزا معلوم ہوا کہ آج جب کہ یونیورسٹی طرح طرح کی
آزمائشوں میں مبتلا اور بلاؤں میں گھری ہوئی ہے ہدایت اللہ صاحب کو وہی رول ادا کرنا پڑے
گا جو اُن کے والد کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے زمانے میں ادا کرنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کالج ہی کے بورڈنگ ہاؤس اور طالب علموں میں نہیں بلکہ اسکول میں
بھی اسی شوق و پابندی سے گھومتے پھرتے اور بچوں سے اُن کے مذاق اور مطلب کی باتیں
کرتے جیسے وہ نوجوانوں سے کرتے۔ کالج کے طالب علموں میں کبھی کبھی بے اطمینانی کی بھی
صورت پیدا ہو جاتی یا بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں شریک ہونے کے لیے طلبا الٰہ آباد
اور وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تو کالج میں صرف فرسٹ اور تھرڈ ایر کے طلبا رہ
جاتے۔ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی سونی اور سنسان ہونے لگتی۔ ڈاکٹر صاحب ان مواقع پر علی گڑھ
کے باہر کے اپنے سارے پروگرام ملتوی کر دیتے اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کو طرح طرح سے
دلچسپ بنانے میں مصروف ہو جاتے، تا کہ لڑکوں میں تنہائی، بے شغلی اور بے دلی کا احساس نہ پیدا
ہونے پائے۔ سب سے موثر نسخہ یہ ہوتا کہ ڈائننگ ہال کے عملے کو ہدایت کی جاتی کہ وہ کھانے

کے مینو کو متنوع کرے۔ ان کی مقدار بڑھائے اور کچھ لذیذ کھانوں کا اضافہ کرے۔ اس کے علاوہ نروراا اور ہردوا گنج کی نہروں پر طلبا کو پکنک لے جاتے۔ طعام و قیام و طرح طرح کی تفریحوں کا پروگرام ہوتا۔ بورڈنگ میں رات گئے تک کبڈی اور نون کی پالی کے مقابلے ہوتے رہتے۔ موسیقی اور مشاعرے کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ بیش تر پہلی ہی ترکیب (ڈائننگ ہال میں 'چیزے فزوں کنند' کارگر ہو جاتی۔ کالج اور اسکول میں جتنے طلبا تھے ان کے والدین، خاندان اور اُن کے اقتصادی حالات سے ڈاکٹر صاحب اچھی طرح واقف ہوتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہر ضلع، کمشنری اور صوبے کے چھوٹے بڑے حاکموں اور اصحاب خیر و ثروت سے بھی واقف رہتے تھے ان کے وسیلے سے وہ طلبا اور ان کے گھر والوں کو حسبِ ضرورت نفع پہنچاتے رہتے۔ یا کوئی مشکل آن پڑتی تو ان کی معرفت اس کا مداوا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں عام طور پر مشہور تھا کہ وہ بھولتے بہت تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو باتیں یاد رکھنے کی ہوتیں ان کو وہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ان کے حافظے یا قوت ارادی کے بارے میں اگر کوئی یہ کہے کہ وہ صرف بھول جانے یا بھلا دی جانے والی باتوں کو بھلا دیتے یا اس کو بھلا رکھتے تھے تو میں اس کی تصدیق کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب نے باوجود اُن طویل، بے شمار، بے غرض اور بیش بہا خدمات کے جو کالج اور اس سے وابستہ چھوٹے بڑے لوگوں کی تمام عمر بجالاتے رہے۔ وہ ہر طرح کی بدنامی اور مخالفت بھی سہتے رہے کالج یونیورسٹی میں منتقل ہوا تو مخالفت دشمنی کی حد تک بڑھ گئی۔ یہ اتنی موقف و منہاج کی نہ تھی جتنی ذاتی اثر و اقتدار کے لیے، تحقیقاتی کمیٹی اور کمیشن قائم ہوتے رہے ان کی رو سے معزول و منکوب بھی ہوئے لیکن ع

حسرت سے نہ چھوٹی کوئے جاناں کی ہواداری

وقفہ وقفہ سے وہ برسرِ کار آتے رہے اور اپنے معمولات میں اس درجہ منہمک ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ معلوم نہیں کس پر کیسا یقین تھا اور کیسی طبیعت و تقدیر پائی تھی کہ ان حادثات سے بدلتے تو کیا متاثر تک نہ ہوئے۔ کبھی بددل اور شکستہ خاطر نہیں ہوئے۔ اپنے دشمنوں تک کو کبھی زبان قلم یا در پردہ کسی طور پر بُرا نہیں کہا۔ نہ ان کی طرف سے کبھی تلخ ہوئے۔ 32-30 سال کی مدت کم نہیں ہوتی اس دوران میں ان کو ہر حال میں دیکھا اور پایا۔ کسی موقع پر ڈاکٹر صاحب کو اس شخص کو

بھی بُرا کہتے نہ سنا جس نے ان کو سب سے زیادہ رسوا کیا تھا۔ کبھی ذکر آ جاتا تو اس خوب صورتی اور شرافت سے ٹال جاتے جو صرف ان کا حصہ تھا۔

تقسیم ملک سے کچھ پہلے سیاسی بحران کا زمانہ تھا۔ کچھ غیر ذمے دار طلبا نے وائس چانسلر کے آفس پر یورش کی۔ ڈاکٹر صاحب کام کر رہے تھے۔ بعض طلبا ناشائستہ طریقے سے پیش آئے تھوڑی ہی دیر میں ہنگامہ ختم ہو گیا ہر طرف سے لوگ اُمڈ آئے، ڈاکٹر صاحب بڑے وقار لیکن خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ارد گرد مجمع تھا جس میں اسٹاف اور آفس کے اراکین طلبا، ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن اور اقربا سبھی شامل تھے ایک صاحب نے ایک طالب علم کا نام لے کر یہ کہنا چاہا کہ آپ نے کیسے کیسے نازک مواقع پر اس کی مدد کی تھی........ جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے چونک پڑے ہوں۔ بے اختیار ہو کر تاکید کرنے لگے کہ خبردار، طلبا کے بارے میں ہرگز ایسی باتیں نہ کرو۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کوٹھی واپس چلے گئے۔ شام کو کچھ لوگوں نے مکان پر جا کر دیکھا تو لان پر چھوٹے بچوں کے ساتھ تفریح کی باتیں کر رہے تھے اور ان کو کچھ بسکٹ اور ٹافی بھی دیتے جا رہے تھے۔ دوسرے دن حسب معمول بورڈنگ ہاؤس اور آس پاس کا چکر لگاتے ہوئے آفس کے کاموں میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اچھے کام کرنے کا بھی کیا فیضان ہوتا ہے جو زندگی کے تمام مکائد و مفاسد کو ناقابل التفات بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جس دن اپنی تعلیم ختم کی اس کے فوراً بعد سے اس دن تک جب وہ 1948 میں انگلستان اور وہاں سے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، علی گڑھ سے وابستہ رہ کر جیسی جیسی دشواریاں، مخالفتیں، سب و شتم اور رسوائیاں جھیل کر، بغیر کسی طرح کی شکایت دل میں رکھے اور زبان پر لائے، مسلمانوں کی کم و بیش تین نسلوں کی خدمت جس خوشی اور دل سوزی سے بغیر کسی امتیاز و تفریق کے انجام دی اس کی مثال اس صدی کے ہندستانی مسلمانوں میں مشکل سے ملے گی۔ ان کو علی گڑھ اور اس کے متعلقین و متوسلین سے جیسا تعلق خاطر تھا اتنا اپنے اعزا و اقربا سے نہ تھا۔ انھوں نے اپنے اثر سے اوروں کو جتنا نفع پہنچایا اور وقت پر دست گیری کی اس کا عشرِ عشیر بھی اپنے عزیزوں کے لیے نہیں کیا۔ وہ جتنی طویل مدت تک جتنے اہم مناصب پر علی گڑھ میں برسر اقتدار رہے اور حکومت اور ملک کے اکابرین میں ان کا جتنا رسوخ تھا اس اعتبار سے اگر وہ

چاہتے تو اقربا اور ہم وطنوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ وفات کے بعد انھوں نے کیا، کیسی اور کتنی منقولہ غیر منقولہ جائیداد یا بیلنس چھوڑا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ میرس روڈ (علی گڑھ) جس پر طبقہ اشراف اور دوسرے دولت مند اشخاص کی نہایت شان دار اور خوب صورت وسیع کوٹھیاں اور باغ واقع ہیں، ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی اور باغ اس حالت کو پہنچ گئے ہیں جیسے وہ کسی کی ملکیت نہ ہوں یا سب کی ہوں۔ مدتوں ملکیت مہاجر کی زد اور ضبطی میں رہ کر واگذاشت ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کے فرزند اور متعلقین کے قبضے میں آئے لیکن پس ماندگان کو اتنے ذرائع و وسائل نہیں میسّر ہیں کہ وہ کوٹھی اور باغ کے کم سے کم حصے کو بھی بہتر حالت میں رکھ سکیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر کیا کمایا کیا کھایا اور کیا چھوڑا، اور یہ سب کیوں اور کس لیے!

آج تک ان پر کسی نے اقربا پروری اور نفع اندوزی کا الزام نہیں لگایا، آج جب کہ یہ عیب یا ہنر ہر سطح پر اس درجہ عام ہو گیا ہے جیسے یہ جنس (Sex) کا کوئی نا قابلِ انسداد مطالبہ ہو گیا ہو اس لیے اس کو ہر قانونی یا اخلاقی گرفت سے بری کر دینا چاہیے جیسا کہ مغرب کی تمدنی زندگی میں آئے دن دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس طرزِ عمل اور طریق احسن پر جتنی حیرت کی جائے کم ہے۔ وہ کتنے عجیب و غریب اور عزّت و محبت کے لائق تھے کہ بڑے سے بڑے اور معمولی سے معمولی شخص دونوں کو نقصان سے بچانے اور فائدہ پہنچانے کی کوشش میں کوئی تفریق یا دریغ نہیں کرتے تھے۔ بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جن کے اور ضرورت مند کے درمیان اتنا کم فاصلہ ہوتا ہو جتنا کہ ڈاکٹر صاحب اور ضرورت مند کے درمیان۔ جس کا جب جی چاہے اور جہاں چاہے ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف مل سکتا تھا۔ وہ نہ کسی سے اکتاتے تھے نہ اس سے بے توجہی برتتے تھے۔ یہ جو ہمارے یہاں تاکید ملتی ہے (اُکتا کر یا بے زار ہو کر) اپنے غلام سے بھی 'اُف' کر کے بات نہ کرو اس کی تمثیل جیسی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ملتی ہے وہ مشکل سے کہیں اور نظر آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب کو بُرا کہنا یا ان کی ہنسی اُڑانا سب کو آتا تھا لیکن ہر کسی کے کام آنے والا ان جیسا کوئی نہ تھا۔ ان پر سب سے عام اور سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا تھا کہ وہ انگریز اور انگریز حکام کی خوشامد کرتے تھے اس پر اپنی طرف سے یہ اضافہ کروں گا کہ انگریز حکام ہی نہیں وہ

آفس کے عملے سے بھی یکساں رسم و راہ رکھتے تھے وہ جانتے تھے کہ حاکموں سے اتنا نہیں جتنا جلد اور قابلِ اطمینان کام دفتر کے عملے سے نکلتا ہے۔ دفتر کے عمال اس لیے ممنونِ کرم رہتے کہ ان کو کوئی دشواری پیش آتی تو ڈاکٹر صاحب متعلقہ حکام سے کہہ سن کر اس کا کام بنا دیتے اسی طرزِ عمل سے خود انھوں نے کیا نفع اُٹھایا اور دوسروں کو کتنا نقصان پہنچایا، اس کو تولیں تو معلوم ہوگا کہ ترازو کا موخرالذکر ہی پلڑا ہر متاع سے لبریز اور گراں بار ہے اور پہلا بالکل خالی ہے۔ آج یہ بات افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس کو حقیقت بنا رکھا تھا!

غالب نے ایک موقع پر کہا ہے، محبوب کے نقشِ پا نے کیا کیا ذلیل کیا ہے کہ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا۔ شعر کی بلاغت اور ناظرین کے ذوقِ سلیم کے احترام میں شعر کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہاں دیکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کیوں کرتے تھے اور کس کے لیے کرتے تھے۔ لوگوں کی غرض جہاں کہیں اٹکی ہوتی ڈاکٹر صاحب ننگ و نام سے بے نیاز ہو کر پہنچ جاتے۔ انگریزی دورِ حکومت میں کس کا بالخصوص پس ماندہ دور ماندہ مسلمانوں کا کام انگریزوں سے نہیں پڑتا تھا اور کام بنتا اسی وقت تھا جب سفارش کرنے والا انگریز اور اس کے بابوؤں سے بخیریت تمام گزر جائے۔ آج کیا ہوتا ہے پہلے تو خیر غیر کفو میں رشتہ کرنا معیوب و ممنوع تھا، آج اپنے کفو سے رابطہ پیدا کرنے میں کیسی کیسی خواریاں نصیب ہوتی ہیں۔ اس سے بھی شاید ہی کوئی ناواقف ہو! ایک ڈاکٹر صاحب کی خوشامد نے ہم کو کتنی خوشامدوں سے محفوظ کر دیا اسے کبھی نہ بھولنا چاہیے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران اناج، کپڑا، اسٹیشنری، دوائیں اور ضرورت کی دوسری اشیا کم یاب ہوتے ہوتے نایاب ہونے لگی تھیں۔ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا، لیکن کیا کہا جائے جب آج کل کی مہنگائی بدرجہا بڑھ چکی ہو اور کبھی کبھی جان و مال و آبرو کے غیر متوقع محاصل اوپر ادا کرنے پڑتے ہوں۔ متذکرہ صدر اشیا کو ادھر اُدھر لے جانے پر بڑی کڑی پابندی لگا دی گئی تھی۔ طلبا اسٹاف اور ان تمام لوگوں کو جو اُن سے وابستہ تھے بڑی تشویش کا سامنا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس زبوں حالی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کہیں جلسہ جلوس تھا نہ مردہ باد یا کشتہ باد کے نعرے نہ جرائم نہ فتنہ و فساد۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کسی نامعلوم مہم پر روانہ ہو گئے

ہیں۔ پانچ سات دن کے بعد واپس آئے تو معلوم ہوا کہ جلو میں گیہوں، چاول، کپڑے، اسٹیشنری اور دواؤں کا ذخیرہ ساتھ آرہا ہے۔ یونیورسٹی میں اطمینان اور آسودگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ حکومت ہند یوپی، ریلوے بورڈ، ریاست کے حکمرانوں، مل مالکوں، کیسے کیسے دفتروں کے کیسے عمال اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے اولڈ بوائز کے قبیلے سے ڈاکٹر صاحب کے کیسے تعلقات تھے اور سب کو موصوف کا کتنا احترام اور ان پر کتنا اعتماد تھا کہ جو مراحل شاید مہینوں میں طے پاتے یا طے پا کر بعد از وقت ہوجاتے، ڈاکٹر صاحب نے اپنے رسوخ سے ہفتوں میں یکہ وتنہا سفر کرکے طے کرادیے۔ یہ مہم اس زمانے میں سر کی جب جنگی مطالبات کے پیشِ نظر بیش تر سویلین مطالبات کو التوا میں رکھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں جب سفر کی سہولتیں اتنی عام اور آسان نہ تھیں جتنی آج ہیں، ان سے زیادہ سفر کرنے والا وہ بھی کم سے کم سامان واہتمام کے ساتھ، شاید ہی کوئی دوسرا رہا ہو۔ ہندوستان کا کوئی قابل ذکر گوشہ ایسا نہ تھا جہاں وہ گئے ہوں اور وہاں کے لوگوں سے ان کی اچھی واقفیت نہ ہو۔ اس کا ایک بڑا سبب اولڈ بوائز تھے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ہر جگہ موجود تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں تعلیمی بورڈ کمیشن، کمیٹیوں اور اہم تعلیمی اور سماجی اداروں کے رکن تھے۔ ہر جگہ کے حکام ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے واقف ہوتے، اور یہ سب 'شجر سایہ دار' کا کام دیتے۔ سفر کرتے تو راستے کے تمام اسٹیشنوں پر خبر ہوجاتی ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو کہ وہ ریلوے بورڈ کے ممتاز ممبر تھے۔ شناساؤں، عقیدت مندوں اور اصحاب غرض کا مجمع ہر اسٹیشن پر ہوتا جہاں ان کی گاڑی رکتی تھی، ان کے مسائل اور مشکلات کو حافظہ میں نوٹ کرتے جاتے۔ سفر کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہوتا کہ ہر اسٹیشن پر جہاں ان کی گاڑی رکتی ڈاکٹر صاحب کے شناسا، عقیدت مند یا اولڈ بوائز کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز لیے موجود ہوتے، سب کا تحفہ قبول کرتے جاتے۔ دوسرے اسٹیشن پر بھی یہی صورت پیش آتی، چنانچہ جو لوگ ناشتہ اور فواکہات لائے ہوئے ہوتے اسے قبول کرتے اور جو خالی ہاتھ آئے ہوتے ان کو وہ تحفہ جات حوالے کردیتے جو پچھلے اسٹیشن پر ملے تھے جیسے مسلمان گھرانوں میں قربانی کے گوشت کی تقسیم ہوتی ہے۔ منزل مقصود پر پہنچتے تو بچا کھچا سامان میزبان کی نذر کردیتے۔

پروگرام کا دوسرا اہم پہلو یہ ہوتا کہ جہاں کہیں قیام ہوتا وہاں اکابر کے علاوہ مقامی اور آس پاس کے اولڈ بوائز بڑے اہتمام سے استقبالیہ دیتے۔ بڑے بڑے افسر تاجر، اکابر شہر اور نادار لیکن ہونہار طالب علموں کے سرپرست یا والدین اور دوسرے اہلِ غرض موجود ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب سب کی سنتے اور سب کی مشکلات کا انصرام زیادہ تر پارٹی ہی میں موجود اشخاص سے کرا دیتے۔ کبھی یہ ہوتا کہ بعض طلبا کے والدین کسی معذوری یا مصلحت کی بنا پر اپنے لڑکوں کو گھر پر نہیں رکھ سکتے تھے ان کو ڈاکٹر صاحب اپنی سرپرستی میں لے لیتے اور علی گڑھ واپس آتے تو ایسے طلبا ساتھ ہوتے۔ ان میں کم سن بھی ہوتے سیانے بھی، ان کو کچھ دن اپنے ہاں مہمان رکھتے، جب وہ اپنے نئے گرد و پیش سے مانوس ہو جاتے تو حسب حالات یا تو متعلقہ بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیتے یا کسی ایسے ممبر اسٹاف کے ساتھ قیام کا بندوبست کر دیتے جس پر ان کا کامل اعتماد ہوتا۔ اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً ایسے طالب علموں کو دیکھنے بھالنے خود پہنچ جاتے، کبھی کبھی ان کو اپنے ہاں کھانے پر یا ناشتے پر بلاتے رہتے۔

سندھ کے بڑے سربرآوردہ اور بااثر زمین دار پیر پگھارو کا المناک حشر شاید ہم میں سے بہتوں کو فراموش نہ ہوا ہو۔ انگریزی حکومت کا عہد تھا۔ بعض انسانیت سوز حرکات کی بنا پر پیر پگھارو پر مقدمہ چلایا گیا ہے پھر جو کچھ ہوا اس سے مفر نہ تھا۔ اس حادثہ سے پگھارو خاندان کو جس تباہی و رسوائی کا سامنا ہوا اس سے ڈاکٹر صاحب بڑے متاثر ہوئے۔ ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف سے ان کو بڑی فکر لاحق تھی، کہتے تھے جلد سے جلد اور خاص اہتمام و احتیاط سے اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو یہ حادثہ اور زیادہ دردناک ہو جائے گا۔ چنانچہ پیر پگھارو کے دو لڑکوں کی تعلیم اور دیکھ بھال کا انتظام علی گڑھ میں کیا گیا۔ عرصے تک ان کو اپنے ساتھ اور اپنے یہاں مہمان رکھا، یہ لڑکے کافی مدت تک اسکول کے بہترین بورڈنگ ہاؤس (انگلش ہاؤس) میں زیرِ تربیت رہے پھر وطن واپس گئے آج وہ سندھ (پاکستان) کے مہذب و ممتاز، مخیر اور معتبر شہری مانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان بچوں کے لیے غیر معمولی محبت سے فی الفور کام نہ لیا ہوتا تو کون جانتا ہے پگھارو خاندان کا کیا انجام ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب کے یہاں آم پارٹی تھی۔ جن لوگوں کو ان پارٹیوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے وہی جانتے ہیں کہ یہ تقریب کیسی ہوتی تھی۔ ہر طرح کے آم سوا ایک قسم کے ہوتے۔ ہر برتن میں ہر جگہ بھیگتے ہوتے اور ہر طرح کا اہتمام ہوتا سوا حفظ صحت کے۔ فارغ ہونے کے بعد چائے شروع ہوئی اور باتیں ہونے لگیں۔ آم پارٹی سے جو لوگ جس طرح متاثر تھے اسی انداز کی باتیں تھیں۔ اس دوران میں ذکر چھڑ گیا 'علی گڑھ بوائے' کا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "عرصہ ہوا آسام کے ایک غیر معروف خطے میں جانا ہوا۔ شام کی چائے میں شرکت کی دعوت تھی۔ بڑے تکلف، سلیقے اور ساز و سامان کی پارٹی تھی۔ کھانے پینے کی منتخب اور وافر چیزیں تھیں۔ صفائی، ستھرائی اور نفاست کا خاص اہتمام تھا جو اس دیار میں غیر متوقع تھا۔ ایک نوجوان نے بڑی اچھی خیر مقدمی نظم پڑھی۔ دوسرے نے شستہ انگریزی میں تقریر کی۔ بالآخر میں نے میزبان سے دریافت کیا کہ پارٹی کا انتظام کس نے کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہی دو نوجوان جنھوں نے نظم پڑھی اور تقریر کی تھی تقریب کے مہتمم تھے۔ میزبان نے کہا آپ کی تشریف آوری کے سلسلے میں ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ آپ کا خیر مقدم کس طرح کیا جائے جو آپ کی شایانِ شان ہو اور ہماری سبکی نہ ہو۔ چنانچہ اس کی تلاش شروع کی گئی کہ کوئی علی گڑھ والا مل جائے وہی اس دشواری اور نزاکت کا مقابلہ کر سکتا تھا، چنانچہ یہ دونوں مل گئے اور دشواری رفع ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان نوجوانوں کو بلا کر پاس بٹھایا۔ کالج سے ان کی زندگی کے متعلق لطف کی گفتگو کرتے اور شفقت فرماتے رہے۔ پارٹی ختم ہونے پر پارٹی میں شریک وہاں کے اعلیٰ حکام اور دیگر اکابر سے ان کی سفارش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی زندگی میں بڑی ترقی اور خوش حالی نصیب ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ 'علی گڑھ بوائے' اس طرح کا ہوتا ہے اسی کو انگریزی میں Rising to the occasion کہتے ہیں۔ یعنی ہر صورت حال کا سامنا کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتا ہو۔ علی گڑھ بوائے کا اطلاق ایسے ہی نوجوان پر ہوتا ہے۔

آموں کے بیان میں ایک بات اور یاد آئی۔ آموں کے موسم میں ڈاکٹر صاحب نینی تال اور شملہ ضرور جاتے۔ صرف 3-2 بار وہ بھی زیادہ سے زیادہ دو چار دن کے لیے۔ ظاہر

ہے اس سے تبدیل آب و ہوا بالکل مقصود نہ ہوتا بلکہ یونیورسٹی کے وہ مسائل ہوتے جو حکومت کے اکابر یا قوم کے صاحبان ثروت اور اہلِ خیر سے متعلق ہوتے۔ ان کی پلیننگ اس طرح سے کی جاتی۔ آم کی فصل کا شباب ہوتا، ڈاکٹر صاحب آموں کی نمائش کا اعلان کرتے۔ اطراف و جوانب سے بکثرت اعلیٰ درجے کے طرح طرح کے آم آجاتے، کمیٹی فیصلہ کرتی کہ کس کو کس درجے کا انعام دیا جائے جو صرف سارٹیفکٹ کی شکل میں ہوتا اور کلکٹر ضلع یا ڈویژن کے کمشنر سے کامیاب مقابلے کرنے والے کو عطا کیے جاتے۔ نمائش میں آم رکھنے والے خوش ہو جاتے۔ ان سارے آموں کو لے کر ڈاکٹر صاحب نینی تال یا شملہ چلے جاتے۔ وہاں ان تمام اکابر میں تقسیم کر دیتے جن سے کالج کا کوئی معاملہ اٹکا ہوتا۔ واپس ہوتے تو معلوم ہوتا کہ وہ سارے مسائل جو معلق تھے رو براہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کالج اور یونیورسٹی کے اندر طلبا کی آزادی اور کبھی کبھی بے راہ روی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ نہ طلبا کے ساتھ رعایت کرنے میں اپنی بے راہ روی کو قابل التفات سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ نوجوان کالج میں آزادی سے رہیں گے تو کالج سے باہر جا کر آزادی کے حدود اور اس کی ذمے داری کا احساس کریں گے۔ البتہ وہ اس کے خلاف تھے کہ باہر کے لوگ طلبا کو ان کے بنیادی فرائض اور مقاصد سے ہٹا کر سیاست کے خارزار میں جھونک دیں۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی سے ان کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہی تھا آج یہ بات کتنی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے، لیکن آج کے نوجوان جس حال کو پہنچ گئے ہیں یا پہنچا دیے گئے ہیں وہ عجیب اور مضحکہ انگیز ہو یا نہ ہو عبرت ناک ضرور ہے۔ غالباً پہلی جنگ عظیم کے بارے میں ایک دردمند یا ستم ظریف نے کہا تھا کہ نوجوان توپوں کا چارا بنائے گئے۔ آج بھی سیاست کے مذبلے یا قمار خانے میں نوجوانوں کی تصویر کچھ کم المناک نظر نہیں آتی۔ یہ ذکر یہاں اتنا خواہ مخواہ نہیں ہے جتنا بے اختیار ہے۔ یوں بھی زندگی میں ہر بہار کی خزاں دیکھنی نصیب ہو اور دوسری طرف بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے چلنے والا کوئی نہ ہو تو میرے اس انحراف کو معاف کر دینا چاہیے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ قصہ پیش کیا گیا کہ فلاں طالب علم کے ایک لڑکی کے ساتھ کچھ ایسے ویسے تعلقات بتائے جاتے ہیں۔ طالب علم کا خط پکڑا گیا اور چہ میگوئیاں

ہو رہی ہیں۔ اس زمانے میں اس طرح کا واقعہ، صحافی اصطلاح میں جتنا سنسنی خیز ہوتا آج بڑے سے بڑے پیمانے پر قتل، آتش زدگی، غارت گری اور آبرو ریزی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے اور خط کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ اس کی تعمیل کی گئی۔ آفس میں طالب علم کی پیشی ہوئی۔ لڑکے کو ایک نظر دیکھ کر کام میں مشغول ہو گئے اور آفس کے کاموں سے متعلق کلرک یا پیش کار کو باہر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر میں سر اُٹھائے بغیر خط کو طالب علم کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا، یہ خط کا کیا قصہ ہے۔ طالب علم کسمسایا اور ہاں نہیں کے درمیان کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے کام بند کر دیا اور طالب علم سے کہا جایئے جو ہوا سو ہوا۔ طالب علم واپس ہونے کے لیے آمادہ ہوا تو بولے ''اور ہاں یہ خط وط نہ لکھا کیجیے۔'' موصوف کے اس کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنی تحریر کے عواقب کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ خط کو لڑکے کے سامنے پرزہ پرزہ کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دینے کے بجائے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس زمانے میں بہت دنوں تک ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ زبان زد رہا اور گفتگو یا بحث کا تفریحی اختتام (تصفیہ) اسی فقرہ پر ہوتا کہ ''جو ہوا سو ہوا، آئندہ خط وط نہ لکھا کیجیے۔''

ڈاکٹر صاحب اپنی پوری ذہانت اپنے تمام اختیارات اور اس گہری اور فطری دل سوزی کو جو ان کو طالب علموں سے تھی اس وقت کام میں لاتے جب کوئی طالب علم ناساز گار حالات کا شکار ہو گیا ہو۔ ان کی یہ صفت جو کمزوری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اکثر مصلحت اندیشی کی منافی ہوتی ان کے زوال وزیاں کا باعث ہوتی تھی، طالب علم کیسا ہی معروف یا غیر معروف، مستحق یا غیر مستحق کیوں نہ ہوتا جب تک اپنی غرض ڈاکٹر صاحب تک نہ پہنچا لیتا ناساز گار حالات سے ہار نہ مانتا۔ وہ جانتا تھا کہ بالآخر ڈاکٹر صاحب اس کی دشواری کا حل نکال لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اسی اقتدار اعلیٰ کے مانند جہاں مجرم، ترحم شاہی King's Mercy کے لیے پہنچ سکتا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ 'شاہ' اپیل نامنظور بھی کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ علی گڑھ کی روایت بن گئی تھی کہ جب تک طلبا ہی نہیں دوسرے بھی اپنی داد فریاد لے کر وائس چانسلر تک پہنچ نہ جاتے چین نہیں لیتے تھے۔ یہ روایت ڈاکٹر صاحب کی قائم کی ہوئی تھی جس کو سوا ذاکر صاحب کے پھر کسی نے نہیں نباہا شاید نباہ بھی نہیں سکتے تھے۔

طالب علموں کے مسائل یا مشکلات اکثر یہ ہوا کرتے۔ داخلہ، حاضری کی کمی، کالج کے مطالبات کی بے باقی، امتحان میں شرکت کا اجازت نامہ، امتحان میں بے عنوانی پر گرفت یا نتائج سے متعلق مراعات خاص ان میں بیش تر مالی اعانت سے متعلق ہوتیں۔ یہ دشواریاں اس طور پر دور کی جاتیں کہ مقررہ ذرائع اور مسائل کے علاوہ کہیں اور سے روپے فراہم کیے جائیں۔ بے باقی کی ضمانت اکثر ممبران اسٹاف، ممبران کورٹ اور ڈاکٹر صاحب خود کرتے۔ اس وقت کی ایک عوامی اصطلاح کے مطابق اس میں طرح طرح کے 'کھپلے' پڑتے جن کی زد بالآخر جا کر ڈاکٹر صاحب پر پڑتی جسے موصوف کسی طرفہ تر 'کھپلے' سے دور دفع کرتے رہتے۔ حاضری کی کمی پوری کرنے کے لیے جتنے قابل قبول عذر ہو سکتے تھے وہ پہلے سے منضبط تھے۔ یہ بالعموم ناکافی ہوتے اس لیے ڈاکٹر صاحب کو ان میں ایسے نکتے پیدا کرنے پڑتے جو مقررہ رعایتوں سے متفرج ہوتے تھے یا ہونے کا امکان تھا۔ اس طرح کمی بیشی میں تبدیل نہ ہو جاتی تو برابر سرابر ضرور ہو جاتی یہ 'تلطف شاہی' اس 'ترحم شاہی' سے بالکل علاحدہ ہوتا جس کا ذکر آچکا ہے ظاہر ہے ایسے عہد معدلت یا معذرت میں عدلیہ، مقننہ یا منتظمہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہوگی۔ ہر سطح پر اور ہر طبقہ میں رسوخ، رسائی اور اس کی رفاقت حاصل کرنے کے لیے، خواہ وہ کسی خدمت یا قیمت پر ملتی ہو۔ ڈاکٹر صاحب اس لیے کوشاں رہتے اور کامیاب ہوتے کہ اس سے وہ علی گڑھ، اس کے طلبا اور عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچا کر ملک کی بحالی اور خوش حالی میں اضافہ کر سکیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں ہی کے خدا کے ہاں نہیں، ہر مذہب و ملت کے خداؤں کے یہاں (اگر ایسے خدا ہوتے ہوں) ڈاکٹر صاحب کو اچھے سے اچھا اجر ملے گا۔

طالب علموں کی ڈسپلن اور امتحان وغیرہ کے بارے میں جب کبھی ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ہوتی اور یہ بالعموم اس وقت ہوتا جب وہ آئین وضوابط کے تقاضوں کو طلبا کے لیے نفع جوئی اور نفع رسانی پر نظر انداز کر چکے ہوتے تو فرماتے ڈسپلن، نصاب اور امتحان وغیرہ کے معیار کا انحصار اتنا آئین وضوابط کی سختی اور غیر مشروط پابندی پر نہیں ہوتا جتنا اراکین اسٹاف کی قابلیت اور طالب علم سے ان کی محبت اور رفاقت پر، اور دونوں کو اپنی اچھی صلاحیتوں کو برسرکار لانے کے لیے آزاد اور صحت مند فضا رکھنا۔ بیش تر طالب علم غیر معمولی طالب نہیں ہوتے۔ متوسط درجے

کے ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لیے ہر ایک کو اعلیٰ طالب علم بنانے کی فکر کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو اعلیٰ اور عملی شخص بننے کا شوق اور حوصلہ دلایا جائے اور سہولتیں فراہم کی جائیں، اس سے تعلیم و تربیت کے بہت سے مسائل خود بخود طے ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب تعلیم، فلسفہ، الٰہیات وغیرہ کے ماہر رہے ہوں یا نہیں، تعلیم و تدبیر سے نوجوانوں کو خوش حالی کی زندگی سے ہم کنار کرنے اور رکھنے کی جیسی غیر معمولی قابلیت ان میں تھی وہ اب تک کسی اور میں کم دیکھی گئی ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کسی مسئلے پر دیر تک گفتگو یا بحث کرتے، باتیں بھی زیادہ مربوط و مسلسل نہ ہوتیں۔ تقریر میں بھی بہت کم ربط یا روانی ہوتی۔ فن تقریر کے جتنے شرائط اور تقاضے تھے ان کے احترام کے بجائے ان سے انحراف ملتا۔ ان کی تحریر پر نظر ثانی کرنے والے ایسے تھے جواب شاید کہیں اور نظر نہ آئیں، یعنی ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے ایک عامی جو مطلب نکال سکتا تھا یہ ماہرین اس کے برعکس نکالتے اور وہی ڈاکٹر صاحب کا مطلب ہوتا! ڈاکٹر صاحب اپنی روزانہ کی کثیر ڈاک سے کافی خطوط اور رمز شناس یا مزاج شناس ماہرین کے حوالے کر دیتے۔ ہدایت یہ ہوتی کہ کوئی Non-committal (جس کا ٹوٹا پھوٹا ترجمہ 'نا قابل گرفت' ہوسکتا ہے) جواب لکھ کر بھیج دیں۔ 'ہاں نہیں' کا یہ جواب بھیج دیا جاتا اور کارگر ہوتا۔ بایں ہمہ وہ اپنے مطالب کو واضح کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے، دوست یا دشمن، موجود ہو یا غیر موجود۔ کوئی بھی ان کے کسی فیصلے یا انتظام کو اخلاقی یا قانونی نقطۂ نظر سے معرضِ بحث میں لاتا تو ڈاکٹر صاحب بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے 'ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔' آج بھی علی گڑھ میں بے تکلف احباب بحث سے اُکتا کر یا اس کو لطف سے ختم کر دینے کے لیے اس فقرے 'ان باتوں میں کیا رکھا ہے' سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے سیاق و سباق میں یہ فقرے جتنے تفریحی معلوم ہوتے ہیں تعدادی و تعدّی کی سیاست میں اتنے نہیں معلوم ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کرنے کے طریقوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے اس خیال کو پیشِ نظر رکھیں جو تعجب نہیں۔ یقین کی حد تک پہنچ چکا ہو کہ مسلمانوں کی ہمہ جہت آباد کاری کا مسئلہ نارمل حالات کا نہیں بلکہ ایمرجنسی کے تحت آتا ہے اور بہت دنوں تک اسی سطح پر کام کرنا پڑے گا۔ اس لیے جو کچھ

کیا جائے فی الفور کیا جائے، بھرپور کیا جائے اور ہر قیمت پر کیا جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال غلط تھا اس لیے ان کے طور طریقوں پر اتنا بدگمان نہ ہونا چاہیے جتنا ایمرجنسی کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب میں آدمی پہچاننے اور اس کو اپنا گرویدہ کرنے کی بڑی نادر صفت تھی۔ عموماً وہ بڑے آدمی سے زیادہ معمولی آدمی پر بھروسا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کا کوئی نہایت اہم اور رازداری کا کام لینا پڑتا تو سینئر اسٹاف کے بجائے ان کی نظر انتخاب معمولی درجے کے اراکین اسٹاف پر پڑتی۔ اس کو بالکل تاکید یا ہدایت نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی احتیاط، دیانت یا دانش مندی سے کام لے، نہ یہ محسوس ہونے دیتے کہ اس کام کو سپرد کرنے میں اس کی طرف سے ان کو کسی طرح کا تذبذب یا تشویش ہے۔ اس کا اثر بڑا اچھا اور گہرا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنا اہم کام کس کے سپرد کیا ہے۔ کام دور اور دیر کا ہوتا۔ اس دوران میں اس کے متعلقین کی خبر گیری بذات خود اس طرح کرتے رہتے کہ اس کے خاندان والوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب مسلسل اس کے متعلقین کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب جب کسی مشکل میں مبتلا ہوتے تو ان کے سینہ سپر یہی چھوٹے اور اوسط طبقے کے افراد ہوتے اور رہتے۔ کالج اور یونیورسٹی میں ان کے اونچے طبقے کے ساتھی بالعموم ان کے مخالف رہے۔ اس کا ایک سبب اور غالباً معمول بھی یہی ہے کہ اونچے طبقے کے افراد اس کے خواہش مند رہتے ہیں کہ چوں کہ وہ صاحب طبل و علم و مال و ملک ہیں اس لیے 'سجدۂ تعظیمی' ان کا حق ہے لیکن ہوتا دراصل یہ ہے کہ پرستش ان کی ہوتی ہے جو پس ماندوں کے پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موخر الذکر میں تھے اس لیے وہ اصحاب کید و کبر کے رشک و رعونت کے تمام عمر شکار رہے لیکن نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت!

ڈاکٹر صاحب غصہ، نفرت یا مایوسی کے جذبات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔ ان کی زبان سے کسی نے کوئی رکیک کلمہ نہیں سنا۔ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی کوئی سخت کلمہ نہیں کہا۔ کبھی برہم و بے زار نہیں پائے گئے۔ اس سے ان میں بے انتہا و بے تکان کام کرنے کی قوت آئی اور حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ فروعات میں پڑنے سے نجات مل گئی تھی اور مفید کاموں کے کرنے کا کافی وقت مل جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ ان کو یہ پہنچا تھا کہ وہ معمولی سے معمولی لوگوں

کی معمولی سے معمولی باتوں سے خوش ہو جاتے۔ تکان اور تشویش کو دور کرنے اور اس سے بچے رہنے کا اس سے سستا اور مجرب نسخہ کوئی اور نہیں۔ کوئی تفریح کی بات یا برجستہ فقرہ سنتے تو بے اختیار خوش ہو جاتے، اور ہلکی سی گلوگیر ہنسی کے ساتھ حاضرین کی طرف دیکھتے جیسے فقرہ کہنے والے، اپنے اور حاضرین سب کے لیے داد کے خواست گار ہوں۔ ایسے موقع پر ہمیشہ کہتے ''ذرا پھر کہیے گا'' اس کے بعد پہلے کی طرح پھر اپنے انبساط کا اظہار کرتے۔ بڑے عالی ظرف، وضع دار اور چھوٹوں پر خاص طور سے شفقت کرنے والے تھے۔

ایک صاحب کو ڈاکٹر صاحب[1] سے رنجش پیدا ہو گئی تھی۔ بات چیت، ملنا ملانا سب بند تھا۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر تھے، تقریب میں مدعو نہیں کیے گئے، نکاح کے وقت دیکھتے ہیں کہ شاداں و فرحاں دائیں بائیں، کسی قدر جھومتے ہوئے، جو اُن کے چلنے کا خاص انداز تھا، چلے آرہے ہیں جو شخص سامنے آیا اس سے معذرت کرتے ہوئے کہ معاف کیجیے گا کام میں دیر ہو گئی۔ میزبان کو گلے لگایا، دولہا کے قریب بیٹھ گئے۔ بے تکلف ہو کر بات چیت کرتے اور چائے پیتے رہے پھر دعا اور مبارک باد دیتے ہوئے جس طرح آئے تھے ہنسی خوشی واپس تشریف لے گئے، میزبان جتنے شرمندہ ہوئے اتنے ہی شاداں و شکرگزار ہوئے، تعلقات میں جو کشیدگی آ گئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے محبت و عقیدت مندی میں تبدیل ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے مسائل و مشکلات اتنی زیادہ اور پیچیدہ نہیں تھیں جتنی ملک کی آزادی کے بعد سامنے آئیں۔ ان میں سب سے زیادہ نامبارک و تشویش ناک سیاسی قسمت آزماؤں کی ناقابلِ انسداد ریشہ دوانیاں اور تباہ کاریاں ہیں۔ بایں ہمہ گذشتہ دور میں بھی علی گڑھ کی زندگی کے مخصوص تقاضے اور روایات تھیں جن سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا انھیں دشواریوں اور نزاکتوں کے پیشِ نظر یہ بات مان لی گئی تھی کہ علی گڑھ کی لیڈر شپ ایسے شخص کے سپرد کرنا چاہیے جو علی گڑھ کا ساختہ پرداختہ، قوم کا معتمد ہو اور جو علی گڑھ کو بڑا بنانے، دیکھنے اور رکھنے کا حوصلہ اور قابلیت رکھتا ہو۔ یہ روایت ڈاکٹر صاحب کی قائم کی ہوئی ہے، اپنے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جسے علی گڑھ سے وابستہ

1. یہ رشید صاحب کی بیٹی سلمیٰ صدیقی کی شادی کی تقریب کا واقعہ ہے۔

مسائل اور مشکلات سے اتنی واقفیت رہی ہو جتنی ڈاکٹر صاحب کو تھی۔ اراکین اسٹاف کے بھی راحت و رنج سے ڈاکٹر صاحب جتنے آگاہ رہتے تھے کوئی اور نہ تھا۔ علی گڑھ میں ہوتے تو کوئی ایسی شام نہ گزرتی جب ان کے یہاں کسی نہ کسی بورڈنگ ہاؤس کے کچھ طلبا اور ان کے وارڈن (اسسٹنٹ ٹیوٹر) چائے پر مدعو نہ ہوتے یا ڈاکٹر صاحب خود کسی نہ کسی بورڈنگ میں گھومتے پھرتے یا طلبا کی کسی تقریب میں شریک نہ ہوتے۔ اس طرح وہ طالب علموں اور ان کی ضروریات سے پورے طور پر براہ راست واقف رہتے، ان کے ہاں ہر کھانے پر یونیورسٹی یا باہر کا کوئی مہمان ضرور ہوتا۔ یہ بات اور تھی کہ مہمان معمولی ہو یا غیر معمولی، کھانا معمولی ہوتا۔ دسترخوان بھی جتنا وسیع ہوتا اتنا کھانوں سے آباد نہ ہوتا۔ بیش تر طلبا سے ڈاکٹر صاحب واقف ہوتے۔ ایک بار ایک طالب علم نے ان کو بتایا کہ اس کی تین پشت علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ پوچھا اپنے والد کا نام بتاؤ۔ اس نے بتایا تو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا دادا کا نام بتاؤ۔ یہ معلوم ہوا تو خوش ہو گئے اور دادا کے طالب علمی کے کچھ واقعات سنائے جیسے وہ کل کی بات تھی۔ چنانچہ اسٹاف اور طلبا میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی مخالف ہی کیوں نہ ہوتا دل میں ان کی عزت محسوس کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے اور اس کے عزیزوں کے بارے میں کتنے اچھے خیالات رکھتے اور کس احترام و محبت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا عملی سیاست کی طرف کوئی رجحان نہ تھا۔ ایک گفتگو یاد آتی ہے۔ کھانے پر مخلصوں کا ایک مختصر اتفاقی اجتماع تھا۔ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل و مقدر کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے، نان کوآپریشن کی تحریک سے پہلے یو پی کی سیاست الہ آباد کی تین شخصیتوں کے گرد گھومتی تھی۔ ایک پنڈت سندر لال ہائی کورٹ کے مشہور وکیل، دوسرے پنڈت موتی لال نہرو، تیسرے سی وائی چنتامنی انگریزی روزنامہ لیڈر کے ایڈیٹر۔ گورنر اور ان کے مشیروں کو متاثر و متحرک کرنے اور رکھنے میں ان تین کا سب سے زیادہ دخل تھا۔ پنڈت سندر لال ہر تحریک و تجویز کے قانونی پہلوؤں کی دیکھ بھال رکھتے اور گورنر اور اس کی منتظمہ کو مطمئن رکھتے۔ پنڈت موتی لال نہرو کی شاہانہ ضیافت و مدارت سے حکومت کے اکابر ممنون و مسخر رہتے۔ چنتامنی اپنے اخبار سے رائے عامہ کو ہموار و سازگار رکھتے۔ کہتے تھے کہ اس سہ گونہ گرفت سے کوئی گورنر اور اس کے

مشیر باہر نہیں جا سکتے تھے۔ ہم میں شاید اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو کہ سیاسی جبر و اقتدار کا یہ نسخہ ہر زمانے اور ہر دور میں کارگر رہا ہے۔ صرف موسم اور مزاج کے اعتبار سے جہاں تہاں بعض اجزا کی کمی بیشی کر دی جاتی ہے۔ اقبال نے جس کی تعبیریوں کی ہے:

''اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات''[1]

سیاست کی وادی میں ڈاکٹر صاحب نے اس لیے قدم رکھے تھے کہ اس سے ان مقاصد مہمہ کے حصول میں مدد ملے گی جو ہمہ وقت اور تمام عمران کے پیشِ نظر رہے۔ یعنی علی گڑھ کی نیک نامی اور مسلمانوں کی خوش حالی مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلاف پیدا ہو جانے سے پہلے تک ڈاکٹر صاحب کا پروگرام کامیاب رہا۔ جوں جوں لیگ اور کانگریس میں کشیدگی بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب سیاست سے پیچھے ہٹتے گئے۔

وہ علی گڑھ کو سیاسی فساد و فشار سے دور اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے وسیلے سے مسلمانوں کی آبادکاری بڑی محنت و محبت سے کی تھی۔ اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ یہ ادارہ سیاست کے شور و شر کا شکار ہو جائے اور تمام امیدوں اور کیے دھرے پر پانی پھر جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی زمانے میں ایک تقریر کے دوران اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جو ہوا سو ہوا اب کانگریس سے مصالحت اور مفاہمت کر لینا بہتر ہوگا۔ یہ بات اربابِ لیگ کے عتاب کا موجب ہوئی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بجائے کورٹ سے زاہد حسین صاحب وائس چانسلر منتخب کیے گئے۔

بہت دن گزرے سینئر ممبران اسٹاف میں ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ سبھی کا اجتماع ہو گیا تھا۔ ان میں تاریخ کے مشہور پروفیسر (سردار) کے۔ ایم۔ پانیکار تھے، جن کی شہرت، قابلیت اور حسن خدمات محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے معترف تھے۔ کہتے تھے، سینئر ممبران اسٹاف میں اس وقت پانیکار جیسا ذہین، قابل، عقل مند، بے خوف اور متاثر و مسخر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان سے دوستی اور دشمنی اسی کو راس آئے گی جو ان ہی اوصاف کا حامل

---

1. بدل کر بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگر چہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات (اقبال)

ہوگا۔ ہندوستان کے آئندہ مرقع میں پائیکار کے خدوخال نمایاں ہوتے رہیں گے۔اس ذکر کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی لیکن اس سے ڈاکٹر صاحب کی مردم شناسی کی صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے شخص کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جس کی حیثیت اس وقت کچھ زیادہ قابل لحاظ نہ تھی، لیکن بعد میں ہندوستان کی سیاسی، علمی اور تہذیبی حیثیت واہمیت کو مقبول و مرتفع کرنے میں اس کا بڑا نمایاں حصہ رہا۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے سینئر ممبران اسٹاف کی مخالفت کو کبھی اہمیت نہیں دی وہ جانتے تھے کہ اس مخالفت میں خدمت اور خلوص کا اتنا نہیں جتنا دوسرے عوامل کا دخل تھا۔ ڈاکٹر صاحب کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے لیکن اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے، ان میں نام کا بھی کوئی پندار نہ تھا۔ ان کو اپنے کاموں میں ایسا اعتقاد تھا اور ان میں ایسا شغف رکھتے تھے کہ کسی دوسرے کی مخالفت پر غور کرنے کی فرصت ملتی تھی نہ اس کی پروا کرتے تھے، اچھے کام کو وہ ہر وقت مخالفت ومخاصمت کے خلاف سپر سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو اردو سے کوئی عشق نہ تھا۔ وہ اس کا حق دینے میں ہنسی خوشی کبھی راضی نہیں ہوئے، فارسی وعربی سے بھی کچھ زیادہ الفت نہ تھی، لیکن ان مضامین کے سربراہوں کی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لطف یہ ہے اردو کو معمولی قانونی اہمیت یا اجازت نہ دینے میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے کٹر مخالفوں کی بھی تائید حاصل ہوتی جو اُن کی کسی اور تجویز کی جو کتنی ہی معقول کیوں نہ ہوتی نہ ملتی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اردو یا بعض اور مضامین کو یونیورسٹی کے Major Subject (بڑے درجے کے مضامین) کا درجہ دینے سے یونیورسٹی کی ساکھ گر جائے گی۔ اپنے پرووائس چانسلری کے عہد میں انھوں نے یونین کلب کے وائس پریسی ڈنٹ کو اس پر متنبہ کیا تھا کہ یونین میں انگریزی کے بجائے اردو مباحثوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہوتا کہ اردو کو یونیورسٹی مضامین کے درجے پر لانا قبل از وقت اور بعید از مصلحت تھا۔ جب یہ دلیل پیش کی جاتی کہ آج سے بہت پہلے ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور کامیابی سے چل رہی ہے جس میں وہ علوم وفنون بھی سکھائے پڑھائے جاتے ہیں جن کی ہمارے یہاں انگریزی زبان میں بھی تعلیم دینے کی ہمت نہیں ہوتی تو بڑے لطف اور رازدارانہ لہجے میں فرماتے: ''ریاستوں کی بات اور ہے، ہم کو اور آپ کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔''

قطع نظر اس کے کہ اردو اور انگریزی میں کس کا درجہ کیا تھا یا ہونا چاہیے تھا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ انگریزی عہدِ حکومت میں اچھی انگریزی جاننا، لکھنا اور بولنا کالج اور یونیورسٹی کے طلبا پر بطورِ خاص لازم آتا تھا۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم طالب علم یا تعلیم گاہ کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ علی گڑھ ہی نہیں بیش تر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے دیسی زبانوں سے کہیں زیادہ توجہ انگریزی پر صرف کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس کے وسیلے سے حکومت کے مختلف محکموں میں ذمے دار مناصب پر فائز ہونے کا امکان بدرجہا بڑھ جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی میں اچھی استعداد کے ساتھی طالب علموں میں بھی امتیاز کا باعث ہوتا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ اچھا کیریکٹر اور اچھا اسپیکر کسی نہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کر رہے گا۔ اس کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں، میرا خیال ہے کہ یکسر منقلب حالات میں بھی کم و بیش انگریزی کی وہی کارفرمائی ہے۔

اکثر ایسے بھی مواقع آیا کرتے جب اردو کی حیثیت دفعتاً قابلِ رشک حد تک پہنچ جاتی۔ یعنی جب یونیورسٹی میں کسی بڑے آدمی کی تشریف آوری ہوتی یا ڈاکٹر صاحب الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوتے، معزز مہمان اردو میں قصیدہ اور سپاس نامہ سن کر خود سراپا سپاس نامہ بن جاتے اور الیکشن کا پمفلٹ یا مینی فیسٹو پڑھ کر ووٹرس ڈاکٹر صاحب پر جاں نثاری اور حریف کی آبروریزی کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ جو اصحاب علی گڑھ میں کسی عالی مرتبت مہمان کی پذیرائی کا منظر دیکھ چکے ہیں وہی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسٹریچی ہال میں قصیدہ اور سپاس نامہ سن کر اور یونین میں چھت کے روشن دان سے گل ریزی کی رسم سے گزر کر مہمان فخر و فیروزی کے کس عالم میں پہنچ جاتا۔ تقسیم ملک اور آزادی وطن کے بعد اردو کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں جو سلوک دیکھنے میں آرہا ہے وہ ایک عجیب المیہ ہے۔ تفصیل میں کون جائے اور تفصیل سننے کی ضرورت یا فرصت کسے۔ عمر کا بہترین اور طویل ترین حصہ اردو کے ساتھ اور اردو کے لیے گزارنے کے بعد اس سے دور، اور علاحدہ رہنا ممکن نہیں رہا۔ ایک زمانے میں سب سے زیادہ روشن خیال وہ سمجھا جاتا تھا جو خدا کا قائل نہ ہو۔ آج سب سے بڑا محبِ وطن وہ ہے جو اردو کا دشمن ہو۔ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ اردو ہر جنگ میں تکبیر کا کام دیتی ہے، اور ہر جیت میں تاوان کا!

کم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ حیثیتوں میں، زیادہ مشکل حالات میں اور زیادہ مدت تک علی گڑھ کی خدمت کی ہوگی۔ طالب علم، پروفیسر، پرنسپل، پرو وائس چانسلر، ممبر مجلس واضعانِ قانون، ریلوے بورڈ، یونیورسٹیوں کی مجالس تعلیمی ومنتظمہ اور متعدد چھوٹے بڑے تعلیمی اور رفاہی اداروں کے رکن، انھوں نے جو خدمات جن سطحوں پر جن مہمات میں اور جس پیمانے پر انجام دیں ان میں ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ مسلمان جس حال کو پہنچ گئے تھے، اور جن مشکلات کا ان کو سامنا تھا اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرسید نے علی گڑھ کی تاسیس اور ڈاکٹر صاحب نے اس کی تبلیغ وتوسیع اور تنظیم نہ کی ہوتی تو مسلمان عزّت اور فراغت کی وہ زندگی بسر نہ کر سکتے جو اُن کو میسّر آئی۔

ڈاکٹر صاحب میں سرسید جیسی آئیڈیلزم (مثالیت، عینیت) تو نہ تھی لیکن مسلمانوں کو طرح طرح کی جن دشواریوں اور نزاکتوں کا سامنا تھا اس کا احساس اور اندازہ ان سے زیادہ شاید ہی کسی اور کو رہا ہو۔ وہ بڑے عملی اور حقیقت پسند تھے۔

اس ادارہ اور مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کے کاموں کو اس طرح اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے جیسے حالات نارمل نہیں، بلکہ ایمرجنسی کے ہوں۔ اس میں ان کو ہمیشہ غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی! ڈاکٹر صاحب بغیر کسی نمائش کے بڑے مذہبی تھے، علمائے کرام، صوفیہ اور مشائخ کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

یہ حضرات بھی مسلمانوں کے تمام دوسرے چھوٹے بڑے لیڈروں سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کا لحاظ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے کوئی ایسا کلام کبھی سننے میں نہیں آیا جو دین اور دین داروں کی سبکی کا باعث ہوتا۔ باطن کا حال اللہ جانتا ہے جس کی شہادت حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شعائرِ اسلام کا ہر موقع پر پورا احترام ملحوظ رکھا تھا۔ ان کو دو بدو نازیبا کلمات سنا دینے کا بعض طبائع کو تامّل نہیں ہوتا تھا، لیکن آخر وقت تک کسی فرعون یا مسخرے کی ہمت نہ ہوئی کہ دین یا ائمہ دین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کوئی ناشائستہ کلمہ زبان سے نکال سکتا اور یہ سب باوجود اس کے کہ ڈاکٹر صاحب دین اور دین داری کے نہ بلند بانگ مبلّغ تھے نہ ہمہ وقت محتسب!

وہ تعلیم وتربیت اور مذہب واخلاق کے آئین وحکمت سے پورے طور پر آشنا تھے جیسے اس زمانے کے شریف وشائستہ مسلمان بالعموم ہوا کرتے تھے، لیکن کسی کا اظہار یا اعلان جارحانہ طور پر نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کے موقف ومقاصد کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے نفاذ اور نتائج اور مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ بھی ان کے سامنے تھا۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ جب تک تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کے لیے مناسب معاشی خوش حالی کے وسائل نہ مہیا ہوں گے اور حکومت کی مشین میں پاور اور کل پُرزے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے اور رکھنے پر قادر نہ ہوں گے، وہ نہ اچھے مسلمان رہ سکتے ہیں نہ اچھے شہری۔ وہ اپنے اس خیال پر شروع سے آخر تک قائم رہے اور جب تک ہوسکا مسلمان نوجوانوں کو حکومت میں حصہ لینے اور پانے کی سہولتیں فراہم کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس پالیسی اور پروگرام اور اس کی کامیابی پر علی گڑھ کے نکتہ چینیوں نے سرسید اور علی گڑھ کو کلرکی اور حکومت کے کاسہ لیسوں کا ورک شاپ قرار دیا تھا۔ حالات اور حکومت کے بدل جانے سے معلوم نہیں ہمارے دوستوں کا کلرکی اور کاسہ لیسی کا تصور بدلا یا نہیں۔ کاسہ لیسی اب اتنی پستی نہیں رہی جتنی پالیسی یا پروگرام جس کا سہارا کبھی رعایا لیتی تھی اب رعایا سے کہیں بہتر و برتر لوگ لیتے ہیں۔ دوسری طرف علمائے کرام تھے جو سرسید اور علی گڑھ کو اسلام سے منحرف قرار دیتے تھے، اور آج تک اس ماتم یا ذکر خیر سے فارغ نہیں معلوم ہوتے۔ غالباً نپولین کا قول تھا کہ فوج پیٹ کے بل پر آگے بڑھتی ہے۔ سرسید اور ڈاکٹر ضیاء الدین کا اس پر اعتقاد تھا کہ فوج ہی نہیں، مذہب اور اخلاق بھی پیٹ کے بل پر آگے بڑھتے ہیں۔ نپولین سرسید اور ڈاکٹر ضیاء الدین سے قطع نظر، ہندوستان کی روح وضمیر کے شاعر ٹیگور نے اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے جہاں انھوں نے کہا ہے کہ عقاب کتنی ہی بلندی پر کیوں نہ پرواز کرے، کھانے پینے کے لیے اسے زمین ہی پر اُترنا پڑے گا۔

مہارشی ٹیگور کے ضمن میں سرآسوتوش مکرجی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ سرآسوتوش کا نام اور مرتبہ غیر منقسم بنگال اور کلکتہ یونیورسٹی کے نامور سربراہ کی حیثیت سے اتنا معروف ہے اور اس احترام سے لیا جاتا ہے کہ ان کے تعارف میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنگال اور

اہلِ بنگال کو سر بلند کرنے اور ان میں مغربی تعلیم کو ترقی دینے اور مقبول بنانے ۔ان کا نام بنگال کی مایۂ ناز شخصیتوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ان کا اتنا ہی گہرا تعلق رہا ہے جتنا ڈاکٹر صاحب کا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے۔ دونوں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے ممبر تھے۔ اس طور پر دونوں کی قومی اور تعلیمی خدمات میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے باوجود ان تمام غیر معمولی اور گراں قدر تہذیبی، ذہنی اور اقتصادی ترقیوں کے جو اہالیان بنگال کو شروع سے میسّر ہیں، سر آسوتوش برابر اس کے قائل، کوشاں اور داعی رہے کہ بنگالی طلبا اور نوجوان، حکومت کی چھوٹی بڑی آسامیوں پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں فائز رہیں۔ دفتروں میں بابو کی اصطلاح بنگال ہی نے دی ہو تو عجب نہیں۔ یوں کلمہ تعظیم کی رُو سے دور دور تک عام ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں، جسے بحیثیت مجموعی حکومت کہہ سکتے ہیں، موثر حصہ لینا یا پانا یا اس کی کوشش کرنا بامقصد اور باعزّت شہری یا شہریت کے لیے لازمی ہے۔ علی گڑھ کے وسیلے سے ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا کی آبادکاری، کارسازی اور حیثیت افزائی کا جیسا بے مثل اور گراں قدر رول پیش کیا ہے۔ وہ نسلاً بعد نسلٍ فخر اور شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ واصل الی اللہ کرا دینے والوں کی ہماری قوم ملک اور تاریخ میں کبھی کمی نہیں رہی۔ لیکن علم، انسانیت، خدمت اور جدوجہد کی زندگی سے واصل کرنے اور رکھنے میں موجودہ صدی میں سر سید سے بڑا کوئی اور شخص نظر نہیں آتا اور سر سید کے مشن اور مقصد کو مقبول، مستحکم اور بارآور رکھنے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی خدمات کو ہم میں سے کوئی کبھی نظر انداز نہ کر سکے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو خیال آیا کہ جنگی ضرورتوں کی بنا پر بہ کثرت کارخانے کھلیں گے، اشیا فراہم کی جائیں گی ان کے لیے انجینئرنگ مکینک اور مخصوص مہارت کے کاریگر درکار ہوں گے۔ مسلمان انجینئر اور کاریگر بہت کم ہیں۔ اگر ان کی فراہمی کا جلدی کوئی بندوبست کر دیا جائے تو یونیورسٹی اور اس کے طلبا کو بیش از بیش نفع پہنچے گا۔ چنانچہ انجینئرنگ کالج کو معرضِ وجود میں لانے کا اہتمام شروع ہو گیا۔ وہ زمانہ یاد آتا ہے، نہ سرمایہ تھا نہ سامان، نہ اسٹاف نہ کلاس روم یا ورک شاپ، مگر وہ سب ہونے لگا جیسے سب کچھ تھا۔ جہاں پر جو جگہ، کمرہ، برآمدہ، احاطہ مل گیا وہ لکچر روم ورک شاپ یا گودام قرار دے دیا گیا۔ یونیورسٹی کے

شعبوں میں سے کسی میں انجینئر نگ کے شعبہ کی شباہت یا شبہ نظر آیا وہاں کے معلموں کو جز و وقتی طور پر نوزائیدہ انجینئر نگ کالج کی خدمت کے لیے لے لیا گیا، اور کام چل نکلا۔ انجینئر نگ کے پورے نصاب کے لیے غالباً 5-4 سال درکار تھے۔ کچھ جنگ کے مطالبے اور بہت کچھ ڈاکٹر صاحب کے مصالح اور ہیر پھیر سے یہ مدت تین سال کردی گئی۔ حکومت کو جنگ میں کامیابی کی بشارت دے کر اور ٹھیکے داروں کو گورنمنٹ کے بڑے ٹھیکوں اور خطاب کی امید دلا کر کام چلاؤ عمارتیں ادھر اُدھر بننے سے زیادہ نمودار ہوگئیں۔ پریکٹیکل کی مدت اس لیے حذف کردی گئی کہ جنگ میں کارآمد اشیا کی تیاری کے لیے کارخانوں میں کام کرنا یونیورسٹی اور کالج کے ورک شاپ میں کام کرنے سے قابلِ ترجیح تھا۔ کچھ ہی عرصے میں انجینئر نگ کالج کو وہ درجہ ملا جو ملک کے اچھے سے اچھے کالجوں کو نصیب تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ بہتوں سے کم عمر تھا اور ایسی بے سروسامانی کی حالت میں وجود میں آیا جس میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی دوسرا انجینئر نگ کالج ظہور میں آیا ہوگا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا جہاں گئے جو کام سپرد کیا گیا اس کو اس خوبی سے انجام دیا کہ مسلم یونیورسٹی انجینئر نگ کالج کی تعلیم، اساتذہ، طلبا اور یہاں کے امتحانوں کے معیار اور طلبا کے ڈسپلن کو ہر چھوٹے بڑے نے سراہا۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے، ڈاکٹر صاحب کو سیاسی مسائل و معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ کلیتاً تعلیم تربیت کے آدمی تھے۔ تمام عمر ان ہی خطوط پر سوچتے اور عمل کرتے رہے۔ ان کی خدمات علی گڑھ کی تاریخ میں بھلائی یا جھٹلائی نہ جاسکیں گی، مثلاً کالج پر نان کوآپریشن کی یورش کا کامیابی سے مقابلہ، ناسازگار حالات اور ناموافق شرائط پر مسلم یونیورسٹی کو قبول کرنا لیکن اس کو مسلسل رُو بہ ترقی رکھنا، انجینئر نگ کالج کا قیام اور میڈیکل کالج کی تحریک و تاسیس کو بروئے کار لانے کا اقدام و اہتمام، میڈیکل کالج کی مہم کو سر کرنے میں ڈاکٹر صاحب کے دست راست، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر سید ہادی حسن مرحوم تھے۔ ہادی صاحب فارسی کے مشہور اسکالر اور پروفیسر اور انگریزی و فارسی کے بے مثل مقرر تھے۔ بلا کا حافظہ تھا جس کا تقریر میں اظہار ہوتا تو سامعین مبہوت رہ جاتے۔ خوش رُو، خوش آداب، خوش طبع، خوش باش اور جامہ زیب تھے۔ جہاں پہنچ جاتے ہر چھوٹے بڑے کو اپنا لیتے۔ نواب محسن الملک

کے خاندان سے تھے اور حیدرآباد کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت دنوں تک اس یونیورسٹی کی شہرت وشائستگی کا نشان بنے رہے۔ ان کی وفات سے یونیورسٹی کی وہ رونق ختم ہوگئی جسے ہادی صاحب کہتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ اور کبھی کبھی تنہا سارے ہندوستان کا دورہ کرکے جس طرح چالیس پچاس لاکھ روپے کم سے کم مدت میں میڈیکل کالج کے قیام کے لیے اکٹھا کرلیے تھے اس سے اس زمانے کی یاد تازہ ہوتی تھی جب مسلم یونیورسٹی کے لیے چندہ فراہم کرنے سرآغاخاں اور علی برادران ہندوستان میں دورہ کرتے تھے اور اس تحریک کی شہرت سارے ہندوستان میں تھی۔

انجینئرنگ کالج کی طرح ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں میڈیکل کالج کے قیام کا خیال بھی دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں آیا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے گورنمنٹ سے وہ وسیع مرتفع پرانا قلعہ اور ملحقہ اراضی بھی حاصل کرلی تھی جو یونیورسٹی کے شمال میں تھوڑی دور پر واقع ہے۔ جدید ترین معیار کے مطابق ایک اعلیٰ درجے کے میڈیکل کالج کی تاسیس کے لیے ہندوستان کے نام ور ڈاکٹروں کی مدد سے مکمل اسکیم کا خاکہ تیار کرالیا تھا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ پر امریکن سرپلس اسٹورز (American Surplus Stores) سے ڈاکٹر صاحب نے اس زمانے میں ایک لاکھ سے اوپر نہایت قیمتی کم یاب اور کارآمد سامان بڑے سستے داموں پر خرید کرکے جمع کرلیا تھا۔ اسی طرح عمارت کے لیے سیمنٹ اور لوہے کی سلاخیں بھی کثیر مقدار میں فراہم کرلی تھیں جو لڑائی کا زمانہ ہونے کے سبب سے بڑی مشکل سے محدود مقدار میں دستیاب ہوتی تھیں۔ میڈیکل کالج کے التوا میں پڑ جانے سے یہ تمام سامان سالہا سال ضرورت کے وقت میں کام آتا رہا۔ انھوں نے گورنمنٹ سے ایگریکلچر فارم اس لیے حاصل کرلیا تھا کہ اس میں یونیورسٹی کا زراعتی کالج قائم کیا جائے گا یہ سلسلہ کچھ چلا لیکن بعض مجبوریوں کے باعث گورنمنٹ کو واپس کردینا پڑا۔

اس کا افسوس رہے گا کہ میڈیکل کالج کی تاسیس وتشکیل ڈاکٹر صاحب کے عہد میں نہ ہوسکی۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا المیہ نہیں ہے بعد میں آنے والوں کا بھی ہے۔ زاہد صاحب[1] کے

---

1. زاہد حسین 25/اپریل 1947 تا 16/اگست 1947 وائس چانسلر رہے۔

بعد نواب محمد اسماعیل صاحب[1] نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمے داری سنبھالی تو ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ موصوف مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھیں۔صرف میڈیکل کالج کو قائم کر دینے اور چلا دینے کا انصرام ڈاکٹر صاحب کو تفویض کر دیں۔نواب صاحب نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔اس کے بعد میڈیکل کالج کا مسئلہ کچھ اس طور پر معرضِ التوا میں آیا اور آتا رہا کہ ذاکر صاحب کے عہد میں بھی رو براہ نہ ہوسکا۔اگر میڈیکل کالج ڈاکٹر صاحب کی درخواست کے مطابق وجود میں آجاتا تو شاید ان کو بہت سی مایوسیوں کا سامنا نہ ہوتا جن کا ہوا۔اچھے اور ضروری کاموں کو لیت ولعل یا معرض التوا میں رکھنے سے ان کے فیض وفوائد معدوم نہیں تو محدود ہو جاتے ہیں۔اگر ڈاکٹر صاحب نے میڈیکل کالج کی اسکیم کو ترقی وتکمیل کی حد تک نہ پہنچا دیا ہوتا جس کے بعد اس کا سرکاری طور پر باضابطہ اعلان ونفاذ باقی رہ گیا تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس یونیورسٹی میں ایک میڈیکل کالج قائم بھی ہوسکتا یا نہیں، اور قائم بھی ہوتا تو کب اور کیسا۔انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج کے قیام سے ہماری یونیورسٹی کی اہمیت وقدر وقیمت میں جیسا بیش بہا اضافہ ہوا اس میں محکمی آئی اور قوم وملک کے سود وبہبود کا سرچشمہ قرار پائی اس کا ہر شخص کو احترام ہے۔یہ کارنامے ڈاکٹر صاحب کے ہیں۔علی گڑھ کی طرف سے ملک وقوم کو ڈاکٹر صاحب کی یہ قیمتی پیش کش ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب کے شب وروز اور آج کے لیل ونہار میں بڑا فرق ہے۔یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس کی شدت اور تواتر آئندہ بڑھتا رہے گا، البتہ ایک چیز خاص طور پر محسوس ہوتی ہے۔پہلے ہم ناسازگار حالات میں بھی پُرامید رہتے تھے۔اب سازگار حالات میں بھی پُراندیشہ رہنے لگے ہیں۔اس کے اسباب پر جتنا سب کو اتفاق ہے اس کے علاج پر اتفاق یا اختیار نہیں ہے۔موجودہ نسل کا بہت بڑا مسئلہ اور خطرہ ہے اور زندگی کے برتنے میں یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے۔اس طویل زمانے میں جب ڈاکٹر صاحب اس ادارے کے سربراہ

---

1 نواب محمد اسماعیل خاں، اگست 1947 تا نومبر 1948 وائس چانسلر رہے۔دسمبر 1948 میں ذاکر حسین صاحب ان کے بعد وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

رہے، چھوٹے بڑے حادثے اکثر پیش آتے رہے۔ آج کی طرح پہلا سوال یہ نہیں ہوتا تھا کہ پولیس کدھر ہے اور فوج کہاں ہے؟ بلکہ یہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کدھر ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہمیشہ یہی معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب باخبر، موجود اور برسرِ عمل ہیں۔ یہ معلوم کر کے سب اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے۔ خطرے کے وقت یونیورسٹی کی پوری بستی کا ایک شخص واحد پر اتنا بھروسہ کرنا اور رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس دلیری اور احساسِ ذمے داری کا سرچشمہ کہیں اور تھا جواب شاید نایاب و نایافت ہے۔

1947 اور اس سے کچھ پہلے قتل و غارت گری کا جو عالم تھا وہ کسے نہیں معلوم۔ یونیورسٹی بڑی درماندگی اور اضطراب کے عالم سے گزر رہی تھی۔ علی گڑھ اور دہلی کے درمیان ٹرینوں پر دردناک حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب فوج کے اعزازی لفٹنٹ کرنل بھی تھے۔ یونیورسٹی میں اس کے یونی فارم میں شاید ہی کبھی دیکھے گئے ہوں۔ اس تہلکے کے زمانے میں وہ برابر یونی فارم میں دہلی اور علی گڑھ کے درمیان سفر کرتے رہے جیسے پٹرول ڈیوٹی پر ہوں۔ کہتے باوجود عام بدامنی اور بدنظمی کے اب بھی پولیس، فوج اور پبلک، یونی فارم کا احترام کرتی ہے اور قتل و غارت گری کی روک تھام میں اس سے مدد ملتی ہے۔ صبح کی گاڑی سے دہلی کے لیے روانہ ہو جاتے۔ وہاں تمام دن اس ادارے کے تحفظ کی تدابیر میں معلوم نہیں کہاں کہاں کے چکر لگاتے۔ شام کو علی گڑھ واپس آ جاتے اور رات گئے تک حکام ضلع سے گفتگو کا سلسلہ قائم رہتا۔ کئی ہفتے یہی پروگرام رہا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب سے کم عمر اور زیادہ توانا شخص بھی تردّد اور تگ ودَو کے اس فشار کا شاید ہی متحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ کسی وقت تھکے ہارے یا مایوس و ملول نہیں پائے گئے۔ ان کو جیسے اس کا یقین ہو کہ وہ ہر دشواری پر قابو پا لیں گے اور کیسے کہا جائے کہ یہ یقین غلط تھا۔ اس لیے کہ ہر وہ شخص جوان کے قریب تھا جانتا تھا کہ وہ ہر خطہ پر کرائسس کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بظاہر غیر معمولی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان میں کشش اور کرامات کے بھی آثار نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن تھا یہ کہ وہ غیر معمولی حد تک معمولی نظر آتے ہوئے غیر معمولی حد تک غیر معمولی حالات و حوادث پر قابو پا لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اپنے غیر معمولی طویل زمانۂ اختیار میں اس ادارے اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے جتنے

منصوبے ڈاکٹر صاحب نے بنائے ان میں ان کو زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ ریکارڈ سر سید کے بعد ہندوستان میں شاید ہی کسی اور مسلمان لیڈر کے حصے میں آیا ہو!

ایک موقع پر ایک عزیز نے یہ سوال کیا کہ آخر اس کا کیا سبب تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھا بتانے والے جتنے لوگ تھے اتنے ہی برا سمجھنے والے بھی تھے! اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ اس شخص کے بھلا یا بُرا ہونے کی اتنی پہچان نہیں ہے جتنا اس کے غیر معمولی ہونے کی۔ اس کے بعد دیکھنا چاہیے اچھا یا برا جاننے والے کس قرینے یا قماش کے لوگ تھے۔ مثلاً صاحب ثروت و اقتدار یا رہین ستم ہائے روزگار۔ ڈاکٹر صاحب کو بُرا کہنے والے عموماً اوّل الذکر تھے۔ موخرالذکر ہمیشہ ان کے دعا گو اور شکر گزار رہے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب تمام عمر درماندہ کے حامی و مربّی رہے۔ صاحبِ ثروت و اقتدار کے فتووں کو انھوں نے ہمیشہ نا قابلِ التفات سمجھا اور ٹھیک سمجھا۔

جیسا کہ پچھلے اوراق میں کہیں ذکر آ چکا ہے، ڈاکٹر صاحب کے فردِ اعمال کا سب سے بڑا جرم انگریز پرستی یا حکام دوستی بتایا جاتا ہے۔ اپنے وقت کے مسلمانوں کو افلاس و ادبار سے نکالنے اور عزّت و فراغت تک پہنچانے میں ڈاکٹر صاحب کا خالصتاً للہ یہ عمل یا طرز کار سیّآت میں نہیں بلکہ حسنات میں آتا ہے جس کا اجر غریب اور کسمپرسی کے جذبۂ شکر گزاری اور اللہ تعالیٰ کے کرم بے حساب کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ صاحبان اثر و اقتدار کے افعال و اقوال جن کا وزن و وقعت اللہ کی ترازو میں جتنا اور جیسا کچھ ہو گا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ آج غریب کا آدمی بننا جتنا آسان، پُر منفعت اور شہرت بخش ہے اتنا ڈاکٹر صاحب کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے!

ملک تقسیم ہو گیا۔ وطن آزاد ہوا لیکن ہم غلام رہے یا وسیلے بن گئے اُن نامبارک قوتوں کے جو اس آزادی کے ساتھ آزاد ہو جائیں۔ آزادی سے بڑی نعمت نہیں اگر اس کی ذمے داری کا احساس ہو اور اس سے بڑی آفت نہیں اگر یہ ذمے داری کے احساس سے خالی ہو۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ کو خدا حافظ کہہ کر انگلستان چلے گئے اور وہاں سے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ جہاں نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ چوں ہے نہ چرا۔ ان کا علی گڑھ کو خدا حافظ کہنا کوئی بندھا ٹکا فقرہ نہ تھا بلکہ ایک انجام کا اندیشہ اور اس کے لیے صمیم قلب سے ایک دعا تھی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے یا ایسا ہی

ہوا بھی کہ علی گڑھ سے باہر اور علی گڑھ کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یونیورسٹی کو آخری بار ہمیشہ کے لیے چھوڑتے وقت کیا عجب انھوں نے محسوس کیا ہو کہ اس پر کیسا وقت آنے والا ہے اور اس کے بچانے یا بیچ ڈالنے والے کون ہوں گے اور کہاں ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جذباتی نہ تھے۔ لیکن علی گڑھ سے ان کو جو لگن تھی، تمام عمر کی لگن و جذبات کی نمی و نرمی بغیر نہ پیدا ہوسکتی تھی نہ قائم رہ سکتی تھی۔ دور دراز دیار غیر میں مرض الموت میں ان کے دل میں کچھ حسرتیں کچھ تمنائیں اُبھری ہوں گی۔ کس کے نہیں ابھرتیں، لیکن خیال ہوتا ہے علی گڑھ کے لیے کچھ کم نہ ہوں گی۔ اس لیے کہ وہ تمام عمر ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور آرزوؤں کا مرکز رہا۔ علی گڑھ کو انھوں نے جیسا پایا، جس طور پر بنایا، بچایا اور بڑھایا، بارگاہِ الٰہی میں اس کو اپنی خدمت اور عبادت کے طور پر پیش کیا ہوگا۔ مرضی الٰہی ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمے داری سپرد کرتی ہے اور اسی ذمے داری کو پورا کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے اس کو صلہ دیتی ہے، یا بازپُرس کرتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بارگاہ الٰہی سے کیسی سرفرازی نصیب ہوئی ہوگی۔

40 سال ہوئے دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے علی گڑھ کے نامور فرزند، ہر معرکہ کے مجاہد اور ہر محفل کے محبوب، مولانا محمد علی انگلستان گئے تھے جہاں انھوں نے تاریخی فقرہ کہا تھا کہ وطن کی آزادی لے کر واپس جاؤں گا یا جان جاں آفریں کے سپرد کردوں گا۔ آزادی نہیں ملی، اور محمد علی اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ میت بیت المقدس لے جائی گئی اور جوار اقصیٰ میں سپرد خاک کی گئی۔ ملت کے کیسے مجاہد کو اس کے مالک نے کیسی سرفرازی بخشی۔ اس اقصیٰ کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

> "وہ خدا عجز و درماندگی سے پاک ہے جو اپنے بندے (محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے دنیا و دین کی برکتیں دے رکھی ہیں اور اس کے جانے سے مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی قدرت کے چند نمونے معائنہ کرائیں..... "[1]

---

1 قرآن مجید کی سورۃ بنی اسرائیل کا ترجمہ (پارہ 15)

اس مقدس سرزمین میں ہزاروں انبیائے کرام مبعوث ہوئے، پیام رحمت و راستی سے دلوں کو روشنی و تازگی بخشی، زندگی کو برگزیدہ و بابرکت بنایا اور واصل بحق ہوئے۔ اتنی پاک ہستیاں، ان کی یادیں اور یادگاریں شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں مدفون ومنور ہوں۔ شب معراج میں سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرش اعلیٰ کی طرف صعود فرمانے سے پہلے یہاں انبیائے مرسلین کی روحوں کی نماز میں قیادت فرمائی۔ اس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوئی کہ حضور اکرم اشرف الانبیا اور خاتم المرسلین تھے، نیز یہ کہ معراج جو تنہا شرف رحمتہ للعلمین کے حصے میں آیا، حضور ہی کے طفیل اس کی سعادت ظلی تمام انبیا و مرسلین کو نصیب ہوئی جو اس نماز میں شریک تھے۔ جس طرح حج کا ثواب و شرف ان لوگوں کے بھی حصے میں آتا ہے۔ جن کی طرف سے کوئی دوسرا یہ فریضہ ادا کرائے، شب معراج میں حضور کا حضرت ام ہانیؓ کے مکان سے براہ راست عرش اعظم کی طرف صعود فرمانا بھی ممکن تھا۔ مسجد اقصیٰ سے ہو کر جانے میں ممکن ہے یہ مصالح بھی پیش نظر رہے ہوں۔

24 سال ہوئے ہندوستان کو آزادی ملی۔ ڈاکٹر صاحب وطن سے انگلستان چلے گئے جیسے وہ آزادی ان کے لیے نہ رہی ہو، وہاں جاں بحق ہو گئے۔ سولہ سال پہلے یہی حادثہ محمد علی کو پیش آیا تھا اور ان کے جسدِ خاکی کو بیت المقدس پہنچایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میت علی گڑھ کے بیت المقدس میں لائی گئی اور سرسید کے پہلو میں سپرد خاک کی گئی ان طلبا کے ماتم و میمنت اور احترام و عقیدت کے ساتھ جن کی خدمت و خیر خواہی اور فراغت و فراغ کے لیے مرحوم نے اپنی تمام عمر صَرف کر دی تھی۔ سرسید کے پہلو اور پائیں میں جگہ پانے کے صرف ڈاکٹر صاحب مستحق تھے انھوں نے سب سے زیادہ اپنے سردار کے کاموں کو آگے بڑھانے اور بارآور کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں تمام عمر وقف رکھی تھیں۔

یونیورسٹی کی مسجد میں داخل ہوتے ہی اس کی فضا، اس کی روایات اور اس میں صاف، ستھرے، پاکیزہ خیال و خصائل اپنے طلبا کو نماز پڑھتے دیکھ کر اور اس میں مدفون گراں مایہ ہستیوں کی یاد سے دل طرح طرح سے شاد ماں ہوتا اور سکون پاتا ہے۔ پھر ذہن میں وہ آیت جگمگانے لگتی ہے جو مسجد کے بیرونی دروازے کی پیشانی پر کندہ ہے جس میں مسجد کا یہ تصور پیش کیا گیا ہے:

"...... ہاں وہ مسجد جس کی بنیاد شروع دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے
اس کا البتہ حق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو کر امامت کیا کرو کیوں کہ اس
میں ایسے لوگ ہیں جو خوب صاف ستھرے رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ
خوب صاف ستھرے رہنے والوں کو پسند کرتا ہے......"[1]

کتنی عجیب بات ہے کہ اس کتبے کی تائید و تکریم اس عربی عبارت سے ہوتی ہے جو وکٹوریہ گیٹ[2] پر نقش ہے اس کا مفہوم یہ ہے:

"قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے لیے
مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ
الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے
اخلاق مہذب اور شائستہ بنائے جائیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں
کماحقہ، کوشش کی ہے اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ
نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کوشش کی جزا دے اور اجرِ عظیم
عطا کرے۔"

پھر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مدرستہ العلوم کے تصور و تاسیس میں مسجد تقویٰ، مسجد اقصیٰ اور مسجد قرطبہ سب کی فضا اور فیضان پیوست ہو ـــــ ڈاکٹر صاحب یہیں آسودۂ رحمت ہیں۔

(سہ ماہی 'فکر و نظر' علی گڑھ، مارچ 1971)

●●●

---

1. قرآن مجید کی صورت برأت (پارہ۔11) کا ترجمہ
2. وکٹوریہ گیٹ۔ یونیورسٹی کا قدیم بڑا دروازہ۔

شفیق الرحمٰن قدوائی

(1901-1953)

شفیق الرحمٰن قدوائی بڑا گاؤں ضلع بارہ بنکی میں 1901 میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے طالب علم رہے۔تحریک خلافت کے دوران کالج کو چھوڑا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے سلسلہ میں کئی بار جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ ایک مخلص سیاسی اور سماجی شخصیت کے مالک تھے۔آزادی کے بعد دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیمات ہوئے۔ 1953 میں انتقال ہوا۔جامعہ ملیہ کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

o

جامعہ کے جن عزیزوں دوستوں سے میرا پرانا اور گہرا تعلق رہا ہے، ان میں شفیق صاحب بھی تھے۔ ان سے ملاقات کم ہی ہوتی تھی، بس یوں ہی سال دو سال میں ایک آدھ بار وہ بھی چلتے پھرتے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور شفیق صاحب دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیمات ہوئے تو ملنے کے مواقع بڑھ گئے۔ پھر تو تعلقات کچھ ایسے ہوگئے کہ کوئی تردّد ہوتا یا خوشی میسّر آتی تو شفیق صاحب ضرور یاد آتے اور کچھ ایسا لگتا جیسے وہ شریک ہوجاتے تو تردّد کم اور خوشی زیادہ ہوجاتی!

کبھی ملاقات ہوجاتی تو بڑی خوشی ہوتی۔ اس طرح کی خوشی جو خلوص اور ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہے اتفاقات کا نہیں، میں شفیق صاحب کو اپنا کارنامہ سمجھتا جس کی زندگی کے نقشے میں کارنامہ کا خانہ خالی ہو اس کے نزدیک معمولی سے معمولی کارنامہ کا احساس بھی بڑے فخر و مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ کارنامہ اتنا بڑا ہو جتنا کہ شفیق صاحب، لکھنے کو تو میں یہ لکھ گیا لیکن یہ بات بھی فوراً ہی ذہن میں آئی کہ شفیق صاحب کس کا کارنامہ نہ تھے!

میں زندگی کی مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں کا خاصا دل دادہ رہا۔ اب بھی ان سے تائب نہیں ہوا ہوں۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ زندگی کے مصائب و مکروہات جن کا ماتم اکثر کیا جاتا ہے۔ ان راحتوں اور لذتوں کے ہوتے ہوئے آسانی سے سہے جاسکتے ہیں۔ ذہنی آسودگی کا مدار اچھی خاصی حد تک (مجھ دنیادار کے نزدیک) مادی راحتوں اور جسمانی لذتوں پر ہے۔ لیکن میں خاصا شرمندہ ہوا ہوں اپنے آپ سے جب سامنا ایسے لوگوں کا ہوا جنھوں نے

اپنی زندگی پر ان مصائب و مکروہات کو حلال اور راحتوں اور لذتوں کو حرام کر رکھا تھا۔ ان میں جان پہچان کے لوگوں میں بار بار ذاکر صاحب اور شفیق صاحب آئے ہیں۔ انھوں نے معلوم نہیں کس دھن میں شاید کبھی سوچا تک نہیں کہ جوانی دولت اور شان شوکت کے کیا مزے تھے۔ جس مزے میں وہ گم تھے، وہ میرے اور میرے جیسے راحت پسندوں کے لیے کس قدر کڑوا ہوگا اس کا اندازہ کچھ اس شرمندگی سے کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں کے سامنے میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے، اور تن آسانی کا میرا جیسا خوگر ایسا کون ہے جو نہ محسوس کرے گا!

شفیق صاحب دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم ہوئے اور وہ فراغت نصیب ہوئی جو وہ چاہتے رہے ہوں یا نہیں میں چاہتا تھا اور ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ ان کو نصیب ہو، لیکن وہ ان فراغتوں میں کبھی نہ بدلے اور یہی نہیں کہ نہیں بدلے بلکہ ان کی خوبیاں اور نکھر گئیں۔ دولت اور فراغت کے خلاف ہونا آرٹ، ادب زندگی اور اس طرح کی دوسری باتوں کے صحیح و صالح تصور کے لیے آج کل ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ میں اس کا کچھ زیادہ نہیں قائل ہوں اس لیے کہ آرٹ، ادب، امیری، غریبی وغیرہ کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے جیسے وہ میرے لیے ہوں نہ کہ میں ان کے لیے۔ امیری ہو یا غریبی افراد کی زندگی پر ان کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی بھلانے کی نہیں کہ افراد کی زندگی کا امیری غریبی پر بھی بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ آرٹ اور ادب اشخاص پہ معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن غیر معمولی شخص سے آرٹ اور ادب زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع و انقلاب سے معصوم ہوتی ہے۔ اختراع و انقلاب صرف افراد کا حصہ ہے۔ دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ فراغت سے قرین ہو کر شفیق صاحب کی شخصیت کے بہت سے دل آویز پہلو جو پہلے سایہ میں تھے اب روشنی میں آ گئے تھے!

کبھی کوئی ایسی ہی بات آن پڑتی ہے تو میں دہلی جاتا ہوں لیکن یہ جانا ہوتا ہے بڑے جبر سے۔ جسے میں اس بہانے گوارا کر لیتا ہوں جیسے یہ جانا صرف واپس آنے کے لیے تھا۔ شفیق صاحب اس فکر میں رہتے کہ میں کبھی ان سے ان کے مکان پر ملوں جہاں وہ میری خاطر مدارات جی بھر کر کر سکیں۔ اس سے میں بچنا چاہتا تھا، میں جانتا تھا کہ ان کا ایک ایک لمحہ اس طرح

کی خاطر مدارات کے کام سے کہیں بہتر کاموں کے لیے وقف ہے۔ مہمان بننے سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں کھاتا پیتا ہنستا بولتا مہمان نہیں ہوں بلکہ اس دنیا میں چند دنوں کا مہمان رہ گیا ہوں اور لوگ خاطر مدارات کرکے اتنا خوش نہیں ہورہے ہیں جتنا کسی مریض یا مسافر کی خدمت کرکے ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ کوئی بھلا مانس مہمان ضرورت سے زیادہ خاطر مدارات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

معمول یہ تھا کہ میں اپنے آنے کی اطلاع ٹیلی فون پر کرکے دعا سلام کرلیتا۔ ایک بار ٹیلی فون ہی پر ٹھہرنے نہ ٹھہرنے پر ردوقدح ہوتی رہی۔ میں نے ان کی بات مان لی، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان کے آفس پہنچ گیا۔ بولے یہ کیا حرکت ہے میں نے کہا بات یہ تھی کہ میں نے تمام عمر آپ کو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے دیکھا اور خدا جانے جھوٹ یا سچ بعضوں نے مانگتے کھاتے بھی دیکھا ہے۔ آج یہ خیال آیا کہ ذرا وزارت تعلیمات کی کرسی پر آپ کی چھپ تختی دیکھ آؤں! بڑے زور سے ہنسے اور رہ رہ کر ہنستے رہے، پھر کہا بالکل جھوٹ۔ آپ صرف چھدّا اُتارنے آئے ہیں۔ میں نے کہا یہ بھی غلط نہیں۔ لیکن آپ کو دیکھ کر لطف آگیا، بولے وہ کیسے؟ میں نے کہا بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے گنیش جی کا جمعیتہ العلما ایڈیشن ہو۔ قہقہہ لگا کر کرسی پر اُچھل پڑے۔ میں نے کہا قہقہہ نہ لگایئے۔ جنوبی ہندوستان میں آپ نے کبھی گنپتی کا میلا دیکھا ہے۔ وہاں گنیش جی کو سر پر بٹھاتے ہیں لیکن پھر دریا بُرد کردیتے ہیں۔ بولے کیا ہرج، یہ تو بڑی اچھی بات ہے، نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا!

آج وہ لطیفہ بے اختیار یاد آگیا اور دل بھر آیا۔ وفات کی خبر سن کر دہلی ان کی کوٹھی پر پہنچا تو چھوٹے بڑے امیر غریب مرد عورت کا کیسا غمگین مجمع اور کیسی یاس بھری فضا آنکھوں کے سامنے آئی۔ بڑے آدمیوں کی وفات پر جو ہجوم اکٹھا ہوتا ہے، اور جس طرح میت اپنے ٹھکانے پہنچائی جاتی ہے وہ کس نے نہ دیکھا ہوگا۔ بہت قریب کے عزیز اور دوست تو واقعی مغموم اور مضطرب ہوتے ہیں۔ کچھ تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں، لیکن بہت بڑی تعداد خانہ پُری کے لیے ہوتی ہے اور جا بجا لوگ روزمرہ کے مسائل اور پروگرام پر اس بے تکلفی

سے گفتگو کرتے، ہنستے بولتے اور ردو قدح کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے وہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے نہیں بلکہ کسی ایٹ ہوم میں تفریح کی غرض سے جمع ہوئے ہیں!

لیکن شفیق صاحب کی وفات پر جو بات واضح طور پر نظر آئی وہ یہ کہ حاضرین میں دولت اقتدار شائستگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے جتنے لوگ تھے سب کے سب یکساں طور پر مغموم تھے۔ ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو دیکھ کر گمان ہو سکتا کہ وہ محض خانہ پُری کے لیے آ گیا تھا۔ ہر شخص مرحوم کی کسی نہ کسی بات کو یاد کر کے بے قرار ہو جاتا تھا اور اس طرح بے اختیار ہو کر بے قرار ہوتا تھا کہ اسے اس کا احساس باقی نہ رہ گیا تھا کہ وہ کیا تھا، اور کیا کر رہا تھا! کیسی کیسی خواتین کتنی بڑی تعداد میں کس کس مذہب اور فرقہ کی مائیں بہو بیٹیاں ہر رسم و قید سے بے نیاز اور ہر اجنبی غیر اجنبی محرم و نامحرم سے بے خبر شفیق صاحب کی یاد میں آنسو بہا رہی تھیں! مرحوم کیسی محبت اور عزّت ان لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے تھے اس کا اندازہ کرتا ہوں تو زمانہ اور زندگی کی ساری ناسازگاریوں کی طرف سے منہ موڑ کر فرد کی عظمت اور انسانیت کے شرف پر بے اختیار ایمان لانا پڑتا ہے۔

شفیق صاحب کسی نہ کسی ضروری ہی کام سے علی گڑھ آتے جس میں چندہ جمع کرانا لازمی طور پر شامل ہوتا۔ اس کا چندہ اس کی ممبری، بڑے ہی کھردرے قسم کا کھدر پہنے ہوتے۔ اسی طرح کا رومال یا چادر کندھے پر کھدر ہی کی صدری، ان کا کھدر دیکھ کر کچھ ایسا خیال آتا جیسے دنیا میں کپڑے کا اطلاق پہلے پہل اسی کھدر پر ہوا جو شفیق صاحب کے حصہ میں آیا تھا، اور خود ان کو اور ان کی سج دھج دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ دنیا کسی کا کچھ بگاڑ سکتی ہو یا نہیں، شفیق صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بگڑ جانے کی چیز شفیق صاحب نے اپنے ہاں رکھی ہی نہ تھی۔ ان کو دیکھ کر پرانے زمانے کے دور افتادہ خود کفالتی گاؤں کی یاد آ جاتی تھی۔ جہاں زندگی کی کسی ضرورت کے لیے گاؤں سے باہر کی امداد کی محتاجی نہیں ہوتی تھی جو ضرورت پیش آئی اپنے طور پر اپنے ہی گاؤں میں پوری کر لی! شفیق صاحب بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔ وہ اپنے لیے کسی دوسرے کی خدمت کے محتاج نہ تھے، اپنی خدمت خود کر لیتے اور اپنے سے خوش ہو لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے نفس کا اعتماد کچھ اس طور پر حاصل کر لیا تھا کہ وہ اس کی آسودگی کے لیے کچھ کریں یا نہ کریں وہ ان سے راضی اور خوش رہتا۔ آخر آخر میں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے شفیق صاحب کے نفس نے

شفیق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہو! وہ ہمیشہ مسکرا کر ملتے ہنستے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کے دل میں نہ مایوسی کے لیے کوئی جگہ تھی نہ سازش کے لیے۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور ہنسی سے اپنی مکمل جیت اور آپ سے مکمل تعاون کا اظہار و اعلان کرتے معلوم ہوتے ان کے ہنسنے پر آپ مکمل بھروسہ کر سکتے تھے!

شفیق صاحب نے بڑی سخت بیماری اٹھائی۔ کتنی دوڑ دھوپ کی گئی کیسی کیسی دعائیں مانگی گئیں۔ کیا کچھ زیر باری نہ ہوئی، لیکن ہوا وہی جسے نہ ہونے دینے کے لیے یہ سارے جتن کیے گئے تھے۔ انسان کی سیرت و شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا طمع قائم نہیں رہ جاتا۔ جب سارے دوسرے سہارے ٹوٹ چکے ہوں اس وقت بھی اپنا سہارا پکڑے رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ شفیق صاحب نے اپنا سہارا مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ ان کے اچھے اور بڑے ہونے کی یہ دلیل سب پر بھاری ہے۔

بعض عزیزوں دوستوں کو اس پر اطمینان نہ تھا کہ ان کا علاج اور دیکھ بھال ٹھیک ہو رہی تھی۔ لیکن شفیق صاحب کو اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رہتا تھا۔ وہ اس کو گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا پیچ ہو اور کسی کو رسوا ہونے کا امکان ہو، ڈاکٹر اور نرسوں سے اپنی ضرورت اور تکالیف بتانے کے بجائے برابر ان کی خدمات کا شکریہ ادا کرتے رہتے۔ کوئی ملنے آتا تو اس کا خیر مقدم اس طرح مسکرا کر کرتے جیسے وہ بالکل تندرست تھے۔ اپنی مسرت و محبت کے اظہار سے وہ ہمیشہ تیماردار کی ڈھارس بندھاتے۔ یہ کام آسان نہیں۔ تندرستی اور فراغت میں جو لوگ بڑے ہنس مکھ یار باش اور دلیر پائے گئے اکثر بیماری اور تنگ دستی میں ان کو چڑچڑا، بودا اور دوستوں، تیمارداروں کے لیے خاصا تکلیف دہ پایا گیا ہے! شفیق صاحب نے محبت کی تازگی و توانائی مصیبت جھیلنے اور دوسروں کی خدمت کرتے رہنے میں ڈھونڈی اور پائی تھی اس لیے مصیبت میں ان کی خوبیاں اور زیادہ جگمگانے لگتیں۔ بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سایہ سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں!

شفیق صاحب اودھ کے بڑے سربرآوردہ شریف وضع اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بچپن کا حال مجھے زیادہ معلوم نہیں لیکن آج سے 50-40 سال پہلے اس

طرح کے خاندان کے بچے جس ناز ونعمت کے پلے ہوتے تھے۔ اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے، پھر وہ علی گڑھ کے طالب علم ہوئے۔ اس عہد میں امیری اور امارت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھی تھا۔ کالج میں ان کا شمار اونچے طبقہ والوں میں ہوتا تھا، لیکن نان کوآپریشن کی تحریک علی گڑھ پہنچی تو فراغت اور بے فکری کی زندگی سے اس طرح ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔

اس وقت سے آخر وقت تک مرحوم نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں قید و بند کے جیسے جیسے مصائب اٹھائے، جامعہ ملیہ کے دورِ ابتلا و آزمائش کو جس بے جگری اور تازہ روی سے جھیلا اور ان سب کس مپرس کو لکھائی پڑھائی کی نعمت سے بہرہ مند کرنے کے بے رنگ و بے نام ونمود کام کو انھوں نے جس خاموشی اور خلوص سے پروان چڑھایا اور چھوٹے بچوں اور بڑے مقاصد کی پرداخت میں جس طرح وہ لگے رہے اور مر مٹے وہ مرحوم کو ان خادمان خلق کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جن کے کارناموں کی شہرت ان معنوں میں تو نہیں ہوئی جن معنوں میں ہم آپ شہرت کو شہرت سمجھتے آئے ہیں۔ لیکن بہ فرض محال کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ہم بڑے لوگوں کو کہیں اس ترتیب میں دیکھ پائیں جس میں ہم نے نہیں بلکہ خدا نے ان کو خاصان بارگاہ کی حیثیت سے اپنے ہاں جگہ دے رکھی ہے تو مجھے یقین ہے شفیق صاحب کا درجہ ان بہت سے لوگوں سے اونچا ہوگا جن کو ہم نے اونچا قرار دے رکھا ہے! اور یہ کچھ شفیق صاحب ہی پر موقوف نہیں ہے، بے شمار ایسے حقیر اور گمنام لوگ گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے جن کو لوگوں نے نہیں پہچانا، لیکن وہ اپنے کردار کے اعتبار سے اتنے بڑے تھے کہ ہماری جان پہچان کے بہت سے بڑے لوگوں کا درجہ ان سے نیچا ملے گا!

قطع نظر اس سے کہ خدمت کرنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا شفیق صاحب میں کتنا حوصلہ تھا اور اس حوصلے کو انھوں نے کہاں کہاں اور کس طرح پورا کر دکھایا ان کی طبیعت میں بڑی دل لگی بھی تھی۔ ان کو شاید ہی کسی نے دل گرفتہ پایا ہو۔ کبھی کبھی تو میں نے یہاں تک محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے اپنے آپ کو خوش رکھتے تھے۔ وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے لیے کوئی اور متفکر یا مضطرب ہو، شفیق صاحب کبھی ہار نہیں مانتے تھے۔

کہتے تھے کہ نیت بخیر ہو تو جیت ہمیشہ اپنی ہوگی۔ اس کا تعلق نہ نصیبے سے ہے نہ فتح وشکست سے۔ وہ دوستوں کی ہر تفریح میں اس طرح دلچسپی لیتے تھے جیسے وہ تفریح دوست کے لیے نہیں بلکہ خود ان کے لیے تھی۔ دوستوں کا بیان ہے کہ ان کی ہر تفریح نامکمل رہ جاتی تھی، اگر اس میں شفیق صاحب کی شرکت نہ ہو۔ سیر شکار، کھیل کود، سفر حضر، ہنسی مذاق، رزم و بزم سب میں شفیق صاحب اس طرح حصہ لیتے تھے جیسے اسی کے لیے بنے تھے۔ یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ طبیعت کا یہ رنگ ان کے خلوص وخدمات کا نتیجہ تھا یا ان کے خلوص وخدمات نے طبیعت کا یہ انداز اختیار کرلیا تھا۔

شفیق صاحب کو چھوٹے بچوں سے بڑی الفت تھی۔ جامعہ سے ان کو جو لگاؤ تمام عمر رہا اور بچوں اور بالغوں کی تعلیم وتہذیب کے کاموں میں ان کو جو سرشاری تمام عمر رہی یہ اسی الفت کا فیضان تھا۔ اچھے اور بڑے آدمی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ان کو بچوں سے شغف ہو۔ ان کو ان معصوموں کی بعثت میں اپنی خدمات کے مفید اور بامقصد ہونے کی بشارت ملتی رہتی ہے۔ مستقبل کی پرورش وپرداخت ماضی کی گود میں نہ ہو تو حال بقول ایک بزرگ کے جو رعایت لفظی کے پیش امام ہیں، بدحال ہو جائے! جس طرح ہم دنیادار اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ مال ملکیت چھوڑ جانے کے لیے تمام عمر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، اچھے اور بڑے لوگ بچوں کو شائستگی اور صحت مندی سے آراستہ واستوار کرکے پوری نسل انسانی کے لیے خیر وبرکت کا ورثہ چھوڑ جانے کی دُھن میں رہتے ہیں۔

شفیق صاحب بڑی محنت کرتے تھے۔ اس سے زیادہ محبت کرتے تھے یہی اور اتنا ہی نہیں۔ وہ بڑے جری بھی تھے۔ 1947 میں دہلی پر قیامت نازل ہوئی تو وہ قرول باغ میں تھے۔ مظلوموں اور بے کسوں کو بچانے کے لیے وہ دن رات بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ ان کو دوسروں کے جان ومال وآبرو کی ویسی ہی فکر تھی جیسی ہمارے آپ جیسے دنیاداروں کو اپنے جان و مال اور آبرو کی ہوتی ہے، گولیاں چلتی رہیں، گولے پھٹتے رہے، چھرے چلتے رہے، آگ لگتی رہی، ناموس لٹتی رہی، لیکن شفیق صاحب دیوانہ وار خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے کسی سے مدد نہیں مانگی، کسی سے فریاد نہ کی، خود مدد پہنچاتے اور فریاد کو پہنچتے رہے۔ وہ اپنے کردار کی رُو سے جیسے مسلمان تھے ویسے ہی حلیہ اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی دور سے مسلمان پہچان لیے جاتے

تھے۔ان کو جو کوئی جہاں چاہتا ٹھکانے لگا دیتا، اور مجھے پورا یقین ہے شفیق صاحب اپنا بچاؤ نہ کرتے اور قاتل کے سامنے بھی مسکراتے ہوتے۔لیکن ہوا یہ کہ بڑے سے بڑا شقی بھی ان کو گزند پہنچانے کی ہمت نہ کر سکا۔

بہت دنوں بعد ملاقات ہونے پر میں نے پوچھا شفیق صاحب آپ کو سکھوں نے چھوڑ کیسے دیا۔آپ کا حلیہ اور جسم تو ایسا تھا کہ مارنے والے کو ایک کے بجائے دس کا ثواب ملتا تو حسب معمول زور سے ہنسے اور بولے لوگ ثواب اتنا کما چکے تھے کہ اس کا بازار بھاؤ بالکل گر گیا تھا!

شفیق صاحب کی طبیعت میں شوخی بھی تھی اور شرارت بھی، جس سے وہ دوستوں اور ساتھیوں اور خود اپنے آپ کو ہشاش بشاش رکھتے تھے۔مہم کیسی ہی ہو شفیق صاحب ساتھ ہوں تو کوئی شخص تھکا ہارا نہیں محسوس کرتا تھا۔وہ لوگوں کو خوب پہچانتے تھے اور بہت جلد پہچان لیتے تھے، اور جو جس قماش کا ہوتا اس سے نبٹتے بھی اسی طرح تھے۔جو بات کرنا چاہتے تھے اسے کسی نہ کسی طرح کرا ہی لیتے تھے۔ان پر کبھی کبھی جلال بھی طاری ہو جاتا لیکن ہوتا صرف چند لمحوں کے لیے۔وہ بہت جلد پھر اپنے جیسے شائستہ اور شگفتہ ہو جاتے۔

ایک بار میرے سپرد ایک کام کیا تھا۔اپنی کوششوں کا نتیجہ ان کو سنانا تھا، میں نے کہا شفیق صاحب اور تو سب ٹھیک ہے البتہ فلاں صاحب قابو میں نہیں آتے۔بولے ٹھیک ہے، اس سے کام لینے کا اور طریقہ ہے۔میں ٹھیک کر لوں گا، آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ دوسرے ہی دن معلوم ہوا کہ وہ صاحب راہِ راست پر آ گئے۔مجھے جتنی خوشی ہوئی اتنی ہی حیرت بھی۔شفیق صاحب سے اس کرامات کی تفصیل پوچھی، بولے میرا پرانا دوست اور ساتھی ہے۔ لیکن اس میں ایک مرض ہے، اس پر بڑا آدمی ہونے کا کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے پھر وہ نہ اپنے باپ کی سنے گا نہ اپنی بیوی کی! اس وقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔جب افاقہ ہو تو پھر کوشش کرنا چاہیے۔میں نے کہا شفیق صاحب یہ باپ اور بیوی ہی کیوں کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے۔ بولے اس میں نکتہ یہ ہے کہ پرانی چال کا آدمی ہو تو اس کے دل میں سب سے زیادہ احترام باپ کا ہوتا ہے اور نئی چال کا ہو تو سب سے زیادہ بیوی سے کور دبتی ہے۔

دوسرے یہ کہ باپ ہمیشہ شفقت اور شرافت کی بنا پر مشورہ دیتا ہے بیوی نفع اور نقدی کے پہلو مدنظر رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان دونوں کو خاطر میں نہ لائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس پر بڑا آدمی ہونے کا بھوت سوار ہے اور ان طریقوں کے کام میں لائے بغیر راہ راست پر نہ آئے گا۔ جو بھوت اتارنے کے لیے ہمارے دیس میں مجرب مانے گئے ہیں! ضمناً یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگر ادنیٰ طبقہ کا کوئی آدمی ہو اور ادنیٰ حرکتیں کرنے لگے تو تحمل اور تواضع سے کام لیجیے رام ہو جائے گا اور اونچے طبقہ کا آدمی گھٹیا پن پر اُتر آئے گا تو اسے یقین دلا دیجیے کہ گالی اور گھونسے سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، فوراً ہوش میں آ جائے گا!

شفیق صاحب کے جنازے پر جیسے دہلی کی ساری خلقت ٹوٹ پڑی تھی، جنازہ مٹکاف روڈ سے روانہ ہوکر جامع مسجد ہوتا ہوا جہاں نماز جنازہ ادا کی گئی سہ پہر میں جامعہ نگر پہنچا اور مرحوم کو جامعہ کے گورستان میں جہاں ڈاکٹر انصاری[1] اور بریگیڈیر عثمان[2] آسودۂ خاک تھے دفن کیا گیا۔

اس دوران میں عزّت اور محبت کے وہ سارے مظاہرے دیکھے جو دہلی کی حکومت اور دہلی کے چھوٹے بڑے باشندوں کی طرف سے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی وفات پر بڑے سے بڑے پیمانے پر کیے جاسکتے تھے۔ پھر شفیق صاحب کی زندگی کے وہ 30-25 سال یاد آنے لگے جو انھوں نے اپنی دُھن میں گزارے تھے۔ علی گڑھ سے چل کر جامعہ پہلے قرول باغ میں آباد ہوئی اس کے بعد اوکھلا (جامعہ نگر) کو منتقل ہوئی۔ اس درمیان میں جامعہ اور جامعہ والوں پر کیا گزری اس کا کچھ اندازہ اس یادگار خطبہ سے ہوسکتا ہے جو ذاکر صاحب نے 1946 میں جامعہ کی جوبلی کے موقع پر دیا تھا، اور کچھ اس سماں سے بھی جو اس وقت ہمارے سامنے تھا۔ اس داستان رزم و ریاضت کو تصنیف کرنے کے لیے کسی ہومؔر یا حاؔلی کی ضرورت ہے۔

جنازہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی گئی اور میت جامعہ نگر (اوکھلا) پہنچائی گئی، میں ذرا دیر پہلے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار سے کچھ فاصلہ پر جامعہ کی عالی شان عمارت کے سایہ میں

---

1 ڈاکٹر مختار احمد انصاری

2 بریگیڈیر محمد عثمان

ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا، اور جنازہ کے ساتھ جمِ غفیر کا لمحہ بہ لمحہ نہایت ترتیب اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ قریب آنا دیکھنے لگا۔ پھر وہ زمانہ اور وہ مواقع یاد آئے جب دن کی مصروفیت و محنت سے فارغ ہو کر شفیق صاحب تنہا شہر سے جامعہ نگر واپس آتے تھے، تھکے ماندے گرد میں اَٹے اکثر بھوکے پیاسے! جامعہ کے حدود میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ جامعہ کو ہر طرح سے اور ہر طرف سے اُگتے پنپتے دیکھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہو رہے ہوں۔ کوئی شناسا مل جاتا تو خوش ہو جاتے، کچھ کلمے دل لگی اور محبت کے کہتے اور ایسا محسوس کرتے جیسے اپنے گھر آنگن اور اہل و عیال میں پہنچ گئے۔

آج اسی جامعہ کی حدود میں شفیق صاحب کی میت لائی جا رہی تھی کتنا بڑا تفاوت تصور کی نگاہ کے سامنے تھا! کل تک وہ کس طرح جامعہ میں آیا کرتے تھے، آج کس طرح لائے جا رہے تھے۔ اتنا زبردست مجمع، جامعہ کی سرزمین اور شفیق صاحب کہاں اور کس حال میں!

شفیق صاحب جو اس مجمع میں اور ایسے موقع پر سب سے آگے ہوتے ہر جگہ ہوتے، اور اپنی محبت، شگفتگی، حوصلہ مندی اور حوصلہ افزائی سے ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا ہوتے، آج کہاں اور کس حال میں تھے۔ آج ان کی نعش کو دفنانے کے لیے لا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ان کو قبر میں اتار کر تختہ اور مٹی سے بند کر کے چلے جائیں گے، اور جس طرح آج شفیق صاحب دفن کر دیے گئے۔ ان کے لیے جو رنج و الم تھا وہ بھی جلد یا دیر کسی اور قبر میں دفن کر دیا جائے گا! اور پھر کچھ ایسا ہو جائے گا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا!

زندگی کا یہی دستور چلا آ رہا ہے، اور رہتی دنیا تک اس میں فرق نہ آئے گا۔ دنیا کا کاروبار اور آپس کا نفع نقصان اتنا پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے اور پیٹ پالنے، جان بچانے، عزت پانے، لذت اٹھانے، نام اچھالنے اور روزمرہ کے معمولات ادا کرنے کا جذبہ اتنا قوی اور عالم گیر ہے اور ان کی ہمہ وقت اتنی دیکھ بھال رکھنی پڑتی ہے یا وہ ہمہ وقت ہماری اتنی دیکھ بھال رکھتے ہیں کہ ہم کسی حادثہ کو اپنے آپ پر زیادہ دیر تک مسلط نہیں رکھنا چاہتے اور رکھ بھی نہیں سکتے۔ دنیا کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ وہ موت کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ثابت نہیں ہونے دیتی بلکہ زندگی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام بتاتی ہے۔ ایسا انعام جو ہر محرومی کی تلافی کرتا رہتا ہے۔ ایسا

انعام جو بے بود اور غیر متعین ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عالم اور عامی کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے۔ زندگی کی ہماہمی اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کوئی شخص موت کے عمل دخل پر زیادہ دیر تک غور کر سکے!

تو گویا شفیق صاحب کی زندگی اور موت کے کوئی معنی نہ تھے۔ تھوڑی دیر تک بیزاری اور بے بسی کا یہی عالم رہا۔ میرے قریب کچھ اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وضع قطع، حرکات سکنات اور بول چال سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دہلی کے باہر کے تھے۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بات بات پر زبان سے ناملائم کلمے نکالتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جائے گی۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار تھا۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آخر یہ کس لیے شہر سے میت کے ساتھ پیدل چل کر آئے تھے۔ تجہیز تکفین ہو چکی، پولیس کے دستے نے لاسٹ پوسٹ سر کی۔ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ جماعت بھی اٹھی، ایک نے اپنے ساتھی سے جو ذرا دور تھا پکار کر کہا، سالے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ میں بھی تو چل رہا ہوں۔ ایک بیڑی پھینک پھر ایک دھیمی دل دوز آواز میں جو شاید اپنے ہی کو سنانے کے لیے تھی بولا۔ چلو چھٹی ہوئی دتی بھر میں ایک ہی شریف آدمی تھا۔ آج وہ بھی اُٹھ گیا۔

(مطبوعہ رسالہ ساقی، جنوری 1954)

●●●

مولانا سید سلیمان ندوی

(1884-1953)

سید سلیمان ندوی 22/اپریل 1884 میں پٹنہ ضلع بہار میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1901 میں دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہوئے، اور 1908 میں علم الکلام کے استاد کی حیثیت سے ندوہ ہی میں ان کا تقرر ہوا۔1912 میں رسالہ 'الندوہ' کے ایڈیٹر ہوئے۔ شبلی کی وفات کے بعد اعظم گڑھ آ گئے۔ 1915 میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ 1916 میں رسالہ 'معارف' کا اجرا کیا۔ 1940 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ 1950 میں وہ پاکستان چلے گئے۔ متعدد موضوعات پر سو سے زائد مضامین تحریر کیے، تصانیف کی تعداد بھی کثیر ہے۔

22/نومبر 1953 کو کراچی میں انتقال ہوا۔

○

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی۔ مولانا سہیل[1] کے توسل سے بہت دن ہوئے، شاید 32-30 برس! تعطیلوں میں تفریحاً مولانا اور دوسرے عزیز دل دوستوں سے ملنے اعظم گڑھ گیا تھا۔ سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم[2] سے بڑا شغف ہے۔ شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! کبھی کبھی یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولانا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے۔

فرمایا چلو تم کو حضرت مرحوم کے جانشیں سے ملاؤں، میں نے کہا مولانا آپ کے ہوتے کون جانشیں ہو گیا۔ یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں۔ آپ اپنے حاشیہ نشینوں کا ایمان کیوں پرکھتے ہیں، جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں، اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اور اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ سے اس طرح پوچھا کہ اس کی سرخی کچھ داڑھی مونچھوں پر رہ گئی، کچھ ہتھیلی پر آئی اور وہاں سے بچہ کے کُرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہاں سے آ گیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہیں۔

---

1. اقبال سہیل (1955-1884)

2. علامہ شبلی (1914-1857)

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا۔ سید صاحب سے ملاقات ہوئی، سہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل کے اور احباب و بزرگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ سید صاحب بڑی شفقت سے ملے، ابھی لطف و مرحمت کی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ سہیل صاحب نے کوئی ادبی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جسے معارف کے اوراق میں کبھی دیکھ چکے تھے۔ سید صاحب نے ہاں نہیں میں بات ٹال دی، شبلی منزل میں کسی اور کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا سے الجھے، مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا۔ طالب علمی میں ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کی آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زبردستی کچھ قرض لے کر چل دیے، اور مولانا کسی اور سے نمٹنے کسی اور طرف چلے گئے!

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے اور پھر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ سید صاحب سے ملنے اور ان کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڑھ آنا ہوتا، تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے، میرا، میرے بچوں کا، میرے عزیزوں دوستوں کا بڑا خیال کرتے تھے۔ اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اپنے سے شرمندہ ہونے لگتا۔ یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائد قوم کا اچھا خاصا اجتماع ہو جاتا۔ ایسے مواقع پر یونیورسٹی کے طلبہ یونین میں کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے۔ علی گڑھ میں اکابر شعرا مجتمع ہو جاتے، دو ایک دن بڑی رونق کے گزرتے۔ میرے ہاں مختلف الخیال حضرات یکجا ہو جاتے، مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب (گونڈوی)، ذاکر صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، سید الطاف حسین صاحب (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) ان میں کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت میں تشریف لاتے تھے۔ کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لیے۔

گھر پر وہ مسائل نہیں چھیڑے جاتے تھے، جو کورٹ میں پیش ہونے والے ہوتے۔ اس لیے کہ شریک ہونے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جو پہلے سے رائے قائم نہ کر چکا ہوتا تھا، اس وقت کورٹ کا یہی رنگ تھا۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لیے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا پُر لطف ہوتا تھا۔ ذاکر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حمایتوں کے دلائل

اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے، اور کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سمجھ دار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہو جاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم 24-1923 سے علی گڑھ آنے جانے لگے تھے۔ کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے جو علوم شرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا۔ تقسیم کے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے۔ سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے، اور اکثر اہم مواقع پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا۔

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف[1] صاحب ہم وطن تھے۔ دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے، بعض مذہبی امور میں بھی ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے، جس کے بارے میں جو خیال رکھتے تھے اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مفاہمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کیے جاسکتے تھے۔ علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے جس کسی کو اپنی طبیعت کا نہیں پاتے تھے، نہ اس کے قریب جاتے تھے، نہ اسے قریب آنے دیتے تھے۔

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڑھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے، اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے یا ملک میں ان کی بڑی مان دان تھی۔ ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوش گوار تعلقات کا موجب ایک طور پر مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب[2] فاروقی جون پوری ناظم دینیات تھے، جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ

1۔ مولانا سلیمان اشرف پر رشید صاحب کا مضمون گنج ہائے گراں مایہ کلیات رشید احمد صدیقی حصہ دوم میں شامل ہے۔

2۔ ابوبکر محمد شیث فاروقی (1940-1880) 'گنج ہائے گراں مایہ' میں ان پر رشید صاحب کا خاکہ ہے۔

تعلقات تھے، اور خود مولانا سلیمان اشرف صاحب مولانا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔

سید صاحب کا مزاج مولانا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا۔ سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ کسی حال میں برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے۔ سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا، لیکن ان کی تصانیف پڑھی ہیں۔ جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا، ان سے ملا ہوں۔ خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں۔ علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے، (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، ان کی شاعری، ان کی نثر، ان کے خطوط سب میں حسن طبیعت اور 'سوز دروں' کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں، اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے یا لے سکتے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے۔

سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا، وہ ان کا علمی تبحر ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی۔ وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لیے کام میں نہیں لاتے تھے۔ علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے۔ کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں، جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو۔ ایک مثال مذہب سے دی جاسکتی ہے۔ بطور کلیہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے ہوش کی زندگی میں اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، انھوں نے مذہب کو آڑ بنالیا۔ پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں۔

بات کہاں پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سید صاحب کا علم کیا تھا اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے۔ علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں جو صرف علم کا بیوہار یا بیوپار کرنا جانتے ہیں۔ علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے۔ آج کل دنیا میں جو ہلچل،

افراتفری یا بے دلی اور بے زاری پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں، لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں، جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے۔ دنیا میں ہر مرض کی تیر بہ ہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں، اگر اچھے اطبا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرہ کا موجب بن سکتی ہیں، یہی حال علوم کا ہے!

سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے، ان پر ان کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی، محرمانہ تھی، وہ محض فنی اصول پر کسی مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہیں کر دیتے تھے بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے ردّ یا قبول میں دماغ اور دل دونوں متفق ہو جائیں۔ سید صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل (خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے) طرح طرح سے بحث کی ہے، لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا، جہاں یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنف نے اپنی بات دھوکے، دھمکی سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے یا منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا جلی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر منوانے کی کوشش کی ہو۔ جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشتراکی بالعموم کیا کرتے ہیں! سید صاحب نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی نپی تلی کہی، اور اس طرح کہی اور اس لیے کہی کہ ان کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی۔ جس پر انھوں نے بڑی محنت، قابلیت اور وقت صَرف کیا تھا اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ علم کا معلم سے یہی تقاضا ہے!

سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کے خطبات مدراس ہیں۔ شاید سب سے پہلے میں نے ہی سید صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان خطبات کا اچھی انگریزی میں ترجمہ ہو جائے، تو بہت مفید ہوگا۔ سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا۔ بعض عزیزوں نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن پھر کیا ہوا، اس کا علم نہیں۔ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اکثر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و نظر نے پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئیں۔ دور جانے کی

ضرورت نہیں، صرف دارالمصنفین اعظم گڑھ کی گذشتہ چالیس سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے! یہ گمان اور قوی ہوجاتا ہے، جب ہم اس امر کو بھی مدّنظر رکھیں کہ دارالمصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں!

دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا۔ سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ملے گا۔ اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ باہر کے مسلمانوں کی عام حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا ان کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام[1] کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا، اور ان کی دیکھا دیکھی یا سُنی سُنائی ہم ہندستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیشِ نظر تھا۔ لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہوگیا کہ معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی، ادبی پرکھ اور عالمانہ بصیرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ معمولی سے معمولی دعویٰ کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے۔ ماخذات کے لیے کس کس بے کنار سر وسنسان اور دشوار گزار جنگل اور گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ تب کہیں جا کر کسی رہ رو کے نقشِ قدم ملے ہوں گے، اور جلوۂ منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا۔ معلوم نہیں، اس تصنیف پر سید صاحب کو کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی بڑے .... فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے۔

سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ سیرت شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کردیا ہے۔ اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے، وہ سید صاحب

---

1 عمر خیام (1033-1123)

کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب سے اتنی نہیں ہے، جتنی اس شغف کے بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہوسکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا۔ یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا اسلوب تحریر بھی شبلی سے مختلف ہے۔ شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے۔ تخئیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے۔ جذباتی اور تخئیلی فن کاروں کے یہ خاص صفات ہیں۔ یہ صفات فنونِ لطیفہ کے لیے جتنے کارآمد ہوسکتے ہیں، تاریخ تحقیق یا تنقید کے لیے نہیں! شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کیے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے۔ سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے، اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم اکثر و بیش تر چلتا تھا، اپنے ہی راستے پر، اور اپنی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے۔ سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے۔ وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخئیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی۔ دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے۔ بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا، اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

یہاں سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا ہے بھی نہیں، کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف میں بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ کتنے مستند حوالے کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین میں کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا۔

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا۔ ان کے ذہن میں تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھیں۔ کام کی باتیں ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے، اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ اپنے ذخیرۂ معلومات کی ذہنی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہوں، جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب وجدید ترین اصولوں پر مرتب کی گئی ہو۔ میں نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہیں دیکھا ہے، لیکن ان کی تصانیف پڑھنے اور ان سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں، وہ بیان کر دی ہیں۔ ممکن ہے استنباط نتائج میں غلطی سرزد ہوئی ہو!

حسب نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمت ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلّم ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقوں پر پرانے استادوں اور بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی۔ جدید علوم و فنون سے براہ راست انھوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انھوں نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو چاہے اربابِ سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عامتہ الناس کا اجتماع، جدید افکار اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے مبادلۂ خیال کرنے میں اسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں، یا جس کا ذہن بندھے ٹکے خانوں میں اسیر ہے، یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔ علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خالص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہم سری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے۔

نوجوانوں کے ذہنی رجحانات کے بارے میں ایک بار سید صاحب سے گفتگو آئی تھی، فرماتے تھے کہ عربی فارسی ماخذات پر عام نوجوان طالب علموں کو عبور نہیں۔ ان ماخذات سے

متفرق و نامکمل باتیں جو یورپین تصانیف میں نظر آجاتی ہیں، وہ ان کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہیں۔ یہ نوجوان ذہین اور افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے ہیں۔ یہ قیاس صحیح نہیں ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتوں سے بےزار اور تاریخ و روایات سے بےگانہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق وسباق بتانے والا کوئی نہیں! بات کچھ اور آگے بڑھی تو فرمانے لگے، اس صورت حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے۔

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی قوتوں کو ابھارا، سیاسی اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے یورپ میں تاحال مسلمانوں کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہل فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی افتاد مذہبی تھی۔ انھوں نے اسلامی تصانیف سے جہاں تہاں سے ایسے اقتباسات لیے جو اُن کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لیے مفید تھے۔ ہر ملک میں علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکساں رہی ہے، یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے اور مصنفین کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیش نظر رکھتا ہے۔ حقیقت کو کم! پھر کچھ لطیفے سناتے رہے کہ کس طرح کے اقتباسات کہاں سے لے کر کس طرح کے فتنے اٹھائے جاسکتے ہیں یا اٹھائے گئے ہیں، اور انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ غلط بیانیاں کہاں کہاں پہنچیں، اور کیا رنگ لائیں۔

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں نے سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں۔ اسٹاف کلب اس طرح کی فرمائش کسی سے بہت کم کرتا ہے۔ تقریر کا موضوع غالباً فنِ تاریخ پر مسلمانوں کا احسان یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا۔ سید صاحب نے سوا گھنٹہ سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع سے خاص ذوق تھا بیان کرتے تھے کہ سیّد صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم میں ہوں۔ جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر پر گرتے ہیں، اسی طرح سید صاحب سے لوگوں نے ماخذات نوٹ کیے۔

سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے، جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرروں کا دستور ہے۔ کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت، کچھ ملک وملت کی ابتری یا اپنی نااہلی کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ سید صاحب کبھی اس طرح کی باتیں نہ کرتے، اپنی جگہ سے اُٹھے، تقریر کرنے کی جگہ پر کھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا۔ مذہبی موضوع ہوا تو بسم اللہ پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی، اور تقریر شروع کردی۔

آواز میں اُتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤں نہ پٹکتے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہہ کر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شورِ تحسین اُٹھے۔ جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ وعبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی، البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرے رعایت لفظی کے ساتھ کہہ جاتے، لیکن یہ رعایت لفظی صرف تفریحی نہ ہوتی بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا۔ سید صاحب جس بات کو چھپا کر اُجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے، وہاں اس طرح کی مناسبات لفظی سے کام لیتے۔ سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگوں کی صحبت میں تھوڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا۔ یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا تو اور زیادہ محظوظ ہوتے!

سید صاحب تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے۔ اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے الجھتے ہیں۔ سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان واعتماد سے دُہراتے جارہے ہوں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کب ختم ہوگی، کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے۔ تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے، لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا۔ ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے فکرے ضرور ہوتے ہیں، جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی جادو بیان مقرر ہوا اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے، لیکن سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو

بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جاسکے۔ وہ تقریر کے فن وفسوں سے بے نیاز تھے، لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں اُتر جاتی تھیں۔

ان تقریروں میں بڑا اخلوص، بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی۔ سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس کے ثبوت میں قوی سے قوی سند نہ پیش کرسکتے ہوں۔ سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا، ذاتی معاملہ ہو، علمی یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی، اور شریفانہ رائے دیتے تھے۔ مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں، لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں۔ اس لیے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھاسکوں گا۔ ان میں سے سید صاحب ایک تھے!

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے تھے، اور دوسروں کا نقطۂ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے۔ بحث میں وہ کبھی جز بز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی ناواجب لب ولہجہ کیوں نہ اختیار کرتا سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔

سید صاحب کا تعلق دارالمصنفین سے تقریباً 32-30 سال تک رہا۔ ان کی قیادت میں اس ادارہ کا یہ زمانہ کامرانی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دارالمصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لیے دارالمصنفین سے علاحدہ ہوکر بھوپال میں ملازمت کرلی۔ جو بات سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کو ان کے سامنے میں کسی مشکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا، اور کیوں ہوا۔ میرا یہ رویہ سید صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا۔ تاوقتے کہ مجھے اس کا یقین نہ ہوجاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لیے نہیں پیش کرتے تھے کہ ان کے خیال میں اس سے میرے ترددات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا۔ ایسی صورت میں ان کے فکر اور پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں۔

سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا، جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے دارالمصنفین کیوں چھوڑا اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا۔ بلکہ کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آئندہ کا پروگرام کیا ہوگا وغیرہ۔ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دن قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

عرصہ ہوا ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا کہ وہ کسی طرح علی گڑھ آجائیں، جہاں ان کی بڑی ضرورت تھی۔ پھر ڈاکٹر ذاکر حسین[1] صاحب وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں، لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب سید صاحب ارادہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے۔ بھوپال کے قیام کے دوران میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لیے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لیے وقف کردی تھی، وہ مسلّم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا جو اُن کے سامنے تھا۔ کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریباً یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبا ان کی تصنیف ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ سید صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب 'میکدہ'، 'چھٹا تو پھر ہرج کیا'، 'مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو'! لیکن سید صاحب نہ مانے یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے، لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقلاً علی گڑھ آگئے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا!

سید صاحب بڑے سمجھ دار، شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کی خدمت و خاطر کرنے میں مجھے بڑی لذت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی۔ کسی ذاتی معاملہ میں میرا ان کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سید صاحب کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا

1. ڈاکٹر ذاکر حسین (1969-1897)

ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لیے نہ کرتے۔ سید صاحب اپنی بڑائی، اشارتاً یا صریحاً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بڑائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرتاً خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لیے کسی بڑی تقریب کے منتظر نہ رہتے تھے۔ چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈھ لیتے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے، اور کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔

اکثر یہ بھی محسوس ہوا جیسے سید صاحب کسی قدر حزیں رہتے ہوں، کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں، لیکن یہ حزن ان میں طبعی نہ تھا۔ اس لیے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تو صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں۔ سید صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا، اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ ان کو کوئی الم پرست، خوش مزاج یا کم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا۔ ممکن ہے یہ زندگی کے آخری دور کے تغیرات کا نتیجہ ہو۔

مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں ذرا کم ہی یاد اللہ رکھتا ہوں۔ ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساس کم تری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگزر اور درد مندی اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں، اور ان اخلاقی خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا جن سے مذہب نے روکا ہے۔

اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لیے جس احساس ذمہ داری اور احترام انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں، جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ دنیا و عقبیٰ زمان و مکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن یہ دونوں انسانی زندگی ہی کے دو رُخ ہیں اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے، اور جو شخص دنیاوی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، وہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کو پھیلانا نہیں چاہتا، کہنا صرف یہ تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ میں جس نااہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجائش نہیں نکلتی، وہ اس مقصد کے لیے مذہب کو آلہ بنا کر ملک وملت کا محسن بن جاتا ہے۔ سید صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے، لیکن کس طرح ان باتوں سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہوں تو اس کی یاد سے دل تروتازہ اور روح بالیدہ ہوتی ہے۔

مذہب کے معاملہ میں سید صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانش مندانہ اور عالمانہ تھا۔ ان کی ذاتی، قومی، تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت وحرمت میں اپنی بہترین صلاحیتیں بے دریغ صرف کیں اور جہاں تک بن پڑا، مذہب کو خودغرض لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے نہیں دیا۔ جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سید صاحب کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم وتربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ قدیم طور طریقوں پر ہوئی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے۔[1] تفصیلات میں جانا نزاکت سے خالی نہیں لیکن اتنا کہنے میں مضائقہ بھی نہیں کہ انھوں نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گزاروں کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

یونیورسٹی میں رہ بس جانے کے سبب سے میں نے مسلمانوں کی گذشتہ 25-20 سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے۔ اطمینان یوں کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل، آرٹ وغیرہ کا جو حصہ ارزانی ہوا تھا، وہ ذرا واجبی ہی تھا۔ اس لیے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اٹھتا کیسا ہی اٹھتا، میں اپنے اس بیڑہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا۔ یعنی نہ ان تحریکوں اور تہلکوں سے کبھی آنکھ مچولی کی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ عقل، صحت، آبرو سب بحال رہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکوں میں بیش تر سیاست دانوں نے عوام، علما اور طالب علموں کو آنکھ بند کر کے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لیے استعمال کیا۔ پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام، علما اور طالب علموں کے بھی دن پھرے۔ اب انھوں نے سیاست دانوں کی خبر لینی شروع کر دی، کہیں اور کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہیں کم کہیں زیادہ۔

1. دارالمصنفین تشریف لانے سے پہلے سید صاحب دکن کالج پونا میں پروفیسر تھے۔ (رشید احمد صدیقی)

سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا، اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اونچ میں شریک رہے۔ کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو، اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے لیے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی، اسی پر اخیر دم تک قائم رہے۔ یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دینے میں صرف کی، معمولی طریق پر نہیں بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریر سے اور اپنی سیرت کی پختگی اور پاکیزگی سے۔ سید صاحب ہماری قومی زندگی میں کس درجہ دخیل رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوئے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے سید صاحب کی تقریر، تحریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہوا۔

کچھ عرصہ سے سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم شناسا شخصیتوں کی وفات کا تذکرہ تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے، اور ہر حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے۔ سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے۔ کسی حسن ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کے زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر جگمگاتے نظر آتے ہیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح زندگی کو سید صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہوں، اور وقت آنے پر ان کو معارف میں نقل کر دیتے ہوں۔ سید صاحب میں یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی ان کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتب تھا کہ 40-30 سال کے واقعات بقید سال و ماہ و مقام بے تکلف اس طرح لکھتے جاتے، جیسے ان کے سامنے وقوع میں آ رہے ہوں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہوں گے، بلکہ ساری باتیں ان کے حافظہ میں جیتی جاگتی محفوظ ہوں گی!

ان مضامین کے لکھنے میں سید صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ مورخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہوں۔ ان مضامین کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سید صاحب وہ فضا نہیں پیدا کر سکے یا پیدا نہیں ہونے دیتے تھے جس کے بغیر یہ مضامین اتنے موثر نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہیے اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہیں ہوتی، جتنی ایک طرح کی نذر عقیدت کی، تاریخی دستاویز میں ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں ایک اعتبار سے نذر عقیدت پیش کی جارہی ہو، وہاں ذاتی تاثرات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ان مضامین کو جہاں تاریخی دستاویز ہو کر نہ رہ جانا چاہیے، وہاں خالص شاعری یا نری بین و بکا بھی نہ ہونا چاہیے۔ یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے، جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے۔

یہاں ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ سید صاحب کا حافظہ کتنا قوی، ذہن کتنا مرتب، تاریخی احساس کتنا بیدار، اپنے اور بے گانوں سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

ایک زمانہ سید صاحب پر ایسا آیا، جب ان پر درماندگی سی طاری رہنے لگی تھی۔ ذہنی اور جسمانی دونوں اس زمانہ میں علی گڑھ بہت کم تشریف لائے۔ علی گڑھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی تو میں نے ان کو تھکا ہارا ہی پایا۔ غالباً یہی دور تھا، جب وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب[1] مرحوم و مغفور کے آستانہ مبارک پر اکثر حاضر ہوتے تھے۔ حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی۔ زیادہ وقت اوراد و وظائف اور عزلت میں گزرنے لگا تھا۔ ممکن ہے، یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سید صاحب کو دل کی کچھ تکلیف ہوئی تھی۔ یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ وہ زمانہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑے انتشار کا تھا۔ مجھے سید صاحب کے اس رجحان

---

1 مولانا اشرف علی تھانویؒ (1863-1943)

سے بڑا اثر ذ دہوا۔ میں نے ایک موقع پر غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں، جب جہاد کی صف کو مرتب اور مضبوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے۔

سید صاحب میرے اس طرح کے فقروں یا خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے۔ دوستوں اور عزیزوں سے ان کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے۔ پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خشک بھی ہو جاتا، لیکن سید صاحب کے ہاں سے کوئی جواب نہ آتا۔ ایک دفع علی گڑھ آ گئے طبیعت بحال تھی، میرا جی نہ چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤں۔ سید صاحب نے خود اس قصہ کو چھیڑا، میں نے اپنے رویہ کی معافی مانگی۔ کہنے لگے نہیں نہیں، باتیں سب ٹھیک تھیں، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گزرا۔ پھر مسکرا کر فرمایا:

''دیوانگی ہم عالمے دارد''!

میں بھی ہنس پڑا اور سید صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا۔ سید صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر نہ رہوں گا، وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہیں، ان پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے، وہ کسی حال میں اپنی پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گزرے لوگوں کی طرح اور ان کے سامنے نہیں کر سکتے۔ آپ کو تو اسی جگہ کھڑا رہنا ہے جہاں آپ کی اُمّت آپ کو کھڑا دیکھنا چاہتی ہے! سوال یہ نہیں ہے کہ آپ پر کیا گزرے گی، سوال یہ ہے کہ آپ کی اُمت کدھر جائے گی۔ سید صاحب نے بات ہنسی میں ٹال دی۔

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی۔ ان کو دیکھ اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے۔ رسوا نہ کریں گے، اور جب تک ساتھ رہیں گے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں۔ اپنی ہی نہیں، ہماری ذمہ داریوں کا بھی احساس، وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے، ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے۔

لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا، اور سجل رکھتے تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی۔ بستر بند کٹا پھٹا، میلا کچیلا، تڑا مڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا، تکیہ کا غلاف اور چادر، نہایت صاف اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ، وافر، خوش نما،

لوٹا گلاس، ناشتہ دان، صابون، صابون دان سب منجا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا دبیز اور بہت صاف دھلا ہوا۔ سفر کتنا ہی مختصر ہو، بکس میں پہننے اوڑھنے بچھانے کا کافی سامان رکھتے تھے۔ کلام پاک اور اوراد وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوب صورت جزدان میں ہوتی۔ عبادت ہمیشہ چھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لیے تحفہ ضرور لے جاتے۔ تشریف لاتے تو نام بہ نام سب کی خیریت پوچھتے، اور چوں کہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے۔ اس لیے میرے تمام دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی خیریت سناتے۔ کسی کا پیغام سناتے، کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمائش پہنچاتے۔ فرمائش ساتھ دی جاتی تو بڑی خوشی کے ساتھ لے جاتے، اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے!

سفر میں نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کرلیا کرتے تھے۔ جہاں ٹھہرتے وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لیے حاضر رہتا۔ میں نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ میں دیکھا، یا نج کی صحبت میں سفید دوپلیہ ٹوپی میں جو مجھے سید صاحب پر خاص طور سے بڑی دل کش نظر آتی۔ کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے، اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے۔ اس لیے کہ میں نے سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا۔ موزہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف و ثابت ہوتا۔ رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے۔

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہوجاتا تھا۔ جو چیز جتنی چمچے میں آجاتی، اتنی ہی پلیٹ میں رکھ لیتے۔ کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا، لیتے تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے۔ جو چیز پسند آجاتی اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے۔ دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کرکے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے۔ جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی!

سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہوکر وہ میزبان کے فرائض غصب کرکے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے۔ جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں۔ یعنی خود ہر کھانا میزبان کے

سامنے پیش کرنا، اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وجہ بتائے، اور وجہ بتائے تو یہ تعزیت کا رزولیشن پاس کریں، یا کوئی چورن تجویز کریں۔

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا، لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے۔ میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے اور انہی کے لیے ہے۔ بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جارہا ہے۔ اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے، شان دار اور سادہ لوح واقع ہوئے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے تو ذمہ داری ان کی ہے، میری نہیں۔ میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لیے کہ میں اس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کروں گا، اور اپنے طور پر اپنے لیے خوش ہوں گا نہ اس لیے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے، اور عاقبت سنورتی ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں نہ ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور ان کو برت سکتے ہوں۔ کھانے پر کھانے سے یا کھانے والوں کے ساتھ تبختر بے جا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ اس نزاکت کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے۔ بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے! کھیل میں، کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے۔ خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اترے ہیں۔ سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے، اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصا اونچا درجہ ہے۔

سید صاحب نے دارالمصنفین کا کام غالباً 1915 میں سنبھالا۔ اس وقت سے لے کر تقسیم ملک تک کم و بیش 32 سال وہ اس ادارہ میں یا یہ ادارہ سید صاحب میں اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا۔ دارالمصنفین کا خیال کیجیے تو ذہن

فی الفور سید صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سید صاحب کو دیکھئے تو دارالمصنفین سامنے آجاتا تھا۔ کسی ادارہ کی روایت وشخصیت اسی طرح وجود میں آتی اور برگ و بار لاتی ہے۔

شبلی منزل ایک خالص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا۔ کتنے دانایان سیاست، اربابِ فضیلت اور شیدائیانِ شعرو ادب کا وہاں سے نسبت رکھنا، اپنے لیے ایک امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستوں کو شبلی منزل میں قیام کا اتفاق ہوا ہے اور جنھوں نے وہاں کی مدارات ومہمان نوازی، رفقا کا آپس کا میل محبت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے۔ وہ بتا سکیں گے کہ اعظم گڑھ کا یہ مختصر ساخطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے۔ شمالی ہند کی روایتی، تہذیب و دانش وبینش کی نہ صرف نمائندگی کرتا رہا، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دارالمصنفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھاتے متنوع، اور بہت اچھے پکے ہوئے نیچے پایہ کی ہموار اور یکساں چوکیوں پر نہایت تکلف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوب صورت اور ستھرے برتنوں میں یہ کھانے چنے جاتے۔ لوگ حسب مراتب قالین اور چاندنی پر چوکیوں کے گرد بیٹھ جاتے۔ سید صاحب میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔ یہ تقرب اور اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتیں، اور زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا ہوجاتا!

مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ علی گڑھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہے، ان کو بروے کار لانے میں علی گڑھ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے!

رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہولیتا اور سید صاحب کے معتقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی کوئی اور نہ ہوتا۔ اس لیے سید صاحب سے بات کرنے میں مَیں ذرا بے تکلفی اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا۔

سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا، اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے!

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ سید صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقوں کا ذکر کیا، جو گزشتہ عہد کے مسلمانوں میں رائج تھے۔ پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے۔ سید صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دل نشیں تھی۔ وہ رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف وسعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا قوام اعتدال پر نہ آئے گا۔ محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہوگا۔

میں نے عرض کیا سید صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم وتربیت حاصل کیے بغیر اختیار نہیں کیا جاسکتا، اور دنیا میں کاموں کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے اور تیزی سے بڑھتی جارہی ہے کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ سید صاحب نے اس سے اتفاق کیا لیکن فرمایا کہ ان کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا۔ مثلاً آٹھویں نویں جماعت تک جہاں پہنچ کر بچوں کی اخلاقی بنیاد ایک حد تک استوار ہو جاتی ہے۔ پھر فرمانے لگے، ہمارے ہاں بچوں کو تعلیم دینے اور ان کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے سپرد ہے، یا ملّا کے اور دونوں ایسی معاشی زبوں حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات ٹھکانے سے انجام نہیں دے سکتے۔ جہاں سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا وہاں صلاح وفلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے۔

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے۔ وقت زیادہ گزر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے:

> ''رشید صاحب! شب آخر گشت وافسانہ از افسانہ می خیزد!'' زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے، جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے۔ جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا، سیکھا، پڑھا تھا، اب وہ برگ وبار لانے

والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا! اس برگ و بار کا کیا ہوگا، جب
سے تمدن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا یہ کارخانہ قائم رہے گا اس طرح
کے کتنے حسرت ناک سانحے پیش آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے!''

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیت ذہنی) میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا سید صاحب! آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کہ ایسا شریف اور صاحب علم وفن ہے، جس کے دل میں نہ آئی ہوگی۔ عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے متقرب بندوں میں ہیں۔ آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دے سکتے تھے، وہ دے نہ سکے۔ غم اسے ہو، جس نے ایسا ہونے نہ دیا۔ جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا، آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے۔ جب آپ کو یا مجھے کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی!

سید صاحب مسکرائے، لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہار قابلیت، طلاقتِ لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجھکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجھلا کر بولا۔ سید صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق، فلسفہ الٰہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علامہ لوگوں کو مل جاتا ہو، تو مل جاتا ہے۔ اس خاکسار کو تو آج تک نہیں ملا۔ سید صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا۔ مسکرا کر بولے، اور کیوں جناب آپ نے علامہ اور خاکسار میں کوئی خاص رعایت تو مدّنظر نہیں رکھی ہے! مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا، سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں پر آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں، مجھے آپ کی طرف سے اطمینان رہے گا۔

پھر میں نے کہا، سید صاحب آپ نے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے تو نہیں اٹھتی، لیکن مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی۔ جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی،

وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا۔ فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آ گیا، تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا، اور کہا بار خدایا خشکی ختم ہو گئی۔ میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے۔

سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد نام اللہ کا!

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اب جا کر آرام کیجیے۔ آج بڑی دیر ہو گئی!

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے۔ یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور، گو معلوم نہیں۔ کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب وہاں خوش نہ رہیں گے۔ تقسیم ملک کے بعد ایک بار کسی قدر اطمینان کی ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا، رشید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے کیا ہوگا۔ اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا۔ سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا۔ اس لیے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ سید صاحب پر کیا گزرتی ہے۔

سید صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا۔ سید صاحب کے لیے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جا کر کس بنا پر رسوا ہوا، اور طلبا کے لیے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی۔ اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا، جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گراں مایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں۔ پھر علما کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبا کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ اب تک طالب علم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا!!

اگر ایک عالم کی موت عالَم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کو کیا کہیں گے!

(گنج ہائے گراں مایہ کے عنوان سے رسالہ معارف (اعظم گڑھ، سید سلیمان ندوی نمبر) مئی 1955 میں شائع ہوا)

●●●

افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق

(1901-1958)

ڈاکٹر عبدالحق 2رفروری 1901 میں جنوبی ہند کے شہر کرنول میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان میونسپل ہائی اسکول کرنول سے 1910 میں پاس کیا۔ مدراس یونیورسٹی سے 1922 میں بی۔اے کیا اور 1924 میں ایم۔اے کرنے کے بعد محمڈن کالج مدراس (موجودہ گورنمنٹ کالج مدراس) میں عربی، فارسی اور اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ 1936 میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آکسفورڈ میں داخلہ لیا اور ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ 1937 میں محمڈن کالج مدراس میں پرنسپل مقرر ہوئے اور سات سال اس عہدہ پر قائم رہے۔ 1947 میں ڈائرکٹر آف انسٹرکشن مدراس (مالیات) کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔

1953 میں آپ نے بحیثیت پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خدمات انجام دیں جس کی مدت چھ ماہ رہی۔ اسی سال حکومت مدراس نے ان کو مدراس پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین منتخب کرلیا۔ اس عہدہ پر آپ سات سال رہے۔

13 مارچ 1958 کو دل کا دورہ پڑنے سے آپ کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق ایک ماہر تعلیم، سماجی خدمت گزار اور جنوبی ہند کے سرسید کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی مسلمان اس فکر میں مضطرب پھر رہا تھا کہ رات بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے۔ اسٹیشن کے چھوٹے بڑے اہل کار کسی نہ کسی سبب سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک ہندو نوجوان نمودار ہوا۔ اجنبی کی پریشانی دیکھ کر قریب آیا، وجہ دریافت کی، صورت حال معلوم ہونے پر اسے ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود دیر تک آفسوں کا چکّر لگاتا رہا کبھی بابوؤں سے ردوقدح کرتا، کہیں منت سماجت، بالآخر واپس آیا اور مسلمان کو مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا۔ مسلمان نے حیرت اور شکرگزاری کے ساتھ ہندو دوست سے متعارف ہونا چاہا تو بڑے اصرار کے بعد اس نے بتایا، مجھ پر ایک زمانہ بڑے آلام و افلاس کا گزرا ہے، نہ کوئی سہارا دینے والا تھا، نہ دلاسا، اس مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت میں پہنچا اور اپنی مصیبت بیان کی، سب کام چھوڑ کر بڑی شفقت سے پیش آئے، امید بندھائی اور روزگار کا ایسا بندوبست کر دیا کہ میری زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ یہیں سے ان کے احسان کو اس طرح محسوس کیا جیسے مجھ میں بڑی اچھی صلاحیتیں اُبھر آئی ہوں اور مایوسی و بےزاری سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا ہو۔ پھر میں نے ایک عہد کیا کہ جب تک جیوں گا جس مسلمان کو تکلیف اور تردّد میں دیکھوں گا حتی الوسع اس کی مدد کروں گا!

پچھلے سال کا ذکر ہے میری لڑکی اور داماد ایک طویل سیاحت سے فارغ ہو کر جاپان سے سیلون پہنچے۔ خط بھیج کر مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسا انتظام کر دوں کہ ایک دو روز مدراس میں قیام کر کے وہاں کی سیر کر لیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا، سب جانتے ہیں کہ

ڈاکٹر صاحب کا شمار مدراس کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنے یا دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور کام اپنے ذمہ لے رکھے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کوٹھی پر چھوٹے بڑے طرح طرح کے لوگ طرح طرح کے کاموں سے صبح سے رات تک برابر آتے جاتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب ان سب سے بڑی توجہ اور تلطف سے پیش آتے، جیسے کسی ایسے معالج کا مطب ہو جہاں ہر مریض کا علاج مفت کیا جاتا ہو، اور مطب صبح سے رات گئے تک مسلسل کھلا رہتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ علاج کی نوعیت بھی جداگانہ ہو، مثلاً دوا، دعا، گنڈا تعویذ، دان پن، سعی سفارش، رشتہ ناتا، اتنا ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں آؤٹ ڈور پریکٹس پر بھی نکل جاتے۔ کسی سے چندہ مانگنے کے لیے، کسی سے سفارش کرنے، کہیں تقریر کرنے، کہیں شادی غمی میں شریک ہونے، کبھی کسی مہمان کو مدراس کی سیر کرانے!

ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام سے مدراس سے باہر جانے والے تھے۔ میرا خط ملا تو پروگرام ملتوی کر دیا۔ ہوائی جہاز کے اڈے پر پہنچے اور دونوں کو اپنے گھر لائے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے بالکل آسان تھا، اور اس میں نزاکت یا قباحت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا کہ گھر والوں کو ضروری ہدایت دے کر دورے پر چلے جاتے۔ میں جانتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کسی طرح کی کمی نہ آتی۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ اور بچوں کی عزّت اور محبت کے سلوک سے میں خود ایک بار بہرہ مند ہو چکا تھا۔ اس وقت کس حسرت سے وہ موقع یاد آتا ہے جب میرے لیے ہر طرح کی سہولت فراہم کر کے ڈاکٹر صاحب نے پہلے پہل مدراس بلایا تھا۔ میری اس 'زحمت فرمائی' سے ان کو کتنی مسرّت ہوئی تھی، جیسے 'زفرق تا بقدم' شاداب وشادماں ہو گئے ہوں! اخلاص اور اخلاق برتنے کا ڈاکٹر صاحب کا ٹکنک جداگانہ تھا۔ وہ اپنے الطاف واکرام کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار سے پہلی ہی بار ہر اُس شخص پر لگا دیتے تھے، جس کو اس کی ضرورت ہوتی۔ ان کے اس طریقۂ کار سے جرمنوں کے اس معروف اصولی جنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جہاں بتایا گیا ہے کہ دشمن کے کمزور پہلو پر حرب وضرب کی اپنی پوری طاقت یک بارگی مرکوز کر دو!

ڈاکٹر صاحب نے اسی پر اکتفا نہ کی، اپنے گھر پر ان کے لیے ایک طرح کی پکنک کا انتظام کیا۔ میری لڑکی، داماد اور نواسہ نیز اپنے لڑکے لڑکیوں کو پاس بٹھا لیا۔ انگیٹھی منگائی،

کھانے پکانے کی طرح ڈالی، پکاتے جاتے اور بتاتے جاتے کہ مدراس میں مسلمانوں کے یہ کھانے اور مٹھائیاں نوابوں کے دورِ حکومت سے مشہور چلی آتی ہیں۔ یہ چیزیں کھانے کی میز پر دوسری چیزوں کے ساتھ چُنی جاتیں۔ اصرار سے کھلاتے اور ان کی لذت اور لطافت بیان کرتے ،کبھی سبھوں کو ساتھ لے کر مدراس کی سیر کو نکل جاتے۔ مختلف مقامات کی تاریخی اہمیت بتاتے ، اپنے جمع کیے ہوئے طرح طرح کے تاریخی نوادر اور مسلمانوں کے عہد کی قلمی کتابیں، نقاشی ، وصلیاں ، مغربی مصوری کے بعض شاہکار دکھاتے اور ان کی صراحت اس لطف سے کرتے جیسے تاریخی حقائق نہیں بلکہ لطیفے بیان کر رہے ہوں!

باوجود ان باتوں کے مجھے نہیں لکھا کہ انھوں نے میری فرمائش کس خلوص اور خوبی سے پوری کردی تھی، اپنا کتنا ہرج کیا تھا، یا پھر اس طرح کی فرسودہ رسمی معذرت کرتے کہ انھوں نے کیا ہی کیا تھا۔ گھر میں جو دال دلیا تھا، وہ پیش کر دیا، بہت کم قیام کیا، مہمان کو بڑی تکلیف ہوئی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے وغیرہ! مدراس میں قیام اور ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی اور شفقت کی تفصیل مجھے اپنی لڑکی سے معلوم ہوئی جس نے علی گڑھ پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کی ثناخوانی شروع کردی۔ جیسے ڈاکٹر صاحب کے نہیں بلکہ اپنے کارنامے کا ذکر کر رہی ہو۔

اتفاق یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو جلد ہی اکزی کیٹو کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لیے علی گڑھ آنا پڑا۔ جس دن تشریف لائے اس سے ایک روز پہلے لڑکی داماد علی گڑھ چھوڑ چکے تھے۔ سنا تو متاسف ہوئے۔ ان کے متاسف ہونے کا معصوم بزرگانہ متبسم انداز نہیں بھولتا، فرمایا۔ اس دفعہ علی گڑھ آنے کا شوق یوں اور زیادہ تھا کہ سبھوں سے یہاں ملتا۔ میں نے کہا کہ سب آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ کہنے لگے، ارے یہی تو ان کو بتانے آیا تھا کہ میرے گھر والے ان سب کو کتنا یاد کرتے ہیں!

عبدالحق صاحب کو ذاکر صاحب یہاں کی پرو وائس چانسلری پر بڑے اصرار و اعتماد سے لائے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور کے کہنے سے وہ اپنے طرح طرح کے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر جن سے ان کو بڑا اشغف تھا، یہاں آنے پر رضامند نہ ہوتے، اس لیے اور کہ ان

کاموں کو سنبھالنے اور ترقی دینے والا اس نواح میں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ آئے تو ذاکر صاحب نے اپنا مہمان بنا کر رکھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی ایک نازک دور سے گزر رہی تھی، پرانی بساط اٹھ رہی تھی، نیا نظام استوار نہیں ہو پایا تھا۔ ذاکر صاحب یہاں کے در و بست پر حاوی نہیں ہو پائے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ طویل علالت کے بعد صحت بحال ہوئی تو امریکہ جانا پڑا۔ عبدالحق صاحب نے وائس چانسلری کا کام سنبھالا۔

اس حصّۂ ملک اور اس یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالحق اجنبی نہ تھے، تو کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھے۔ البتہ خاص خاص حلقوں میں لوگ اتنا جانتے تھے کہ مدراس میں مسلمانوں کے لیے ہر طرح کی تعلیمی سہولت فراہم کرنے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اسلامی علوم و ادب پر اچھی نظر ہے۔ علوم جدیدہ سے بھی آشنا ہیں اور ہر جماعت میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہاں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ شکل صورت، وضع قطع، رہن سہن، شرعی مسلمانوں جیسی پرانی چال کی ترکی ٹوپی سر پر، داڑھی، ڈنڈا، اٹنگا پاجامہ، پان کھانا، حقہ پینا، مصافحہ کرنا، جو جہاں بلائے بے تکلف چلے جانا، ہر مجلس میں ہر چھوٹے بڑے سے ہنسنا بولنا، کسی نے میلاد پڑھنے کو کہا، پڑھ دیا، کسی نے وعظ کہنے پر اصرار کیا وہ کہہ دیا، کسی نے بچہ کی بسم اللہ کرا دینے کی درخواست کی، وہ پوری کر دی، ذاکر صاحب کی خوب صورت خورد سال نواسی (نیلوفر) بہت مانوس ہو گئی تھی، کاموں سے فرصت ہوتی تو اسے کبھی گود میں لیے ہوئے کبھی انگلی پکڑ کر صبح شام لان پر ٹہلتے ہوئے اس کی خاطر تفریح کی باتیں کرتے رہتے۔ کبھی وہ فرطِ مسرّت سے بے اختیار ہو کر داڑھی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچتی تو اسے خوش کرنے کے لیے کراہتے اور ہنستے۔ کہتے ارے اب معلوم ہوا تیری ڈر سے تیرے نانا نے داڑھی چھوٹی رکھی ہے کہ تو کھینچ نہ پائے۔ اچھا رہ جا اب تجھے گود میں نہ لوں گا، پیٹھ پر بٹھاؤں گا۔ پھر دیکھوں تو میری داڑھی پر کیسے قبضہ کرتی ہے۔ ان کا یہ مشغلہ اور مذاق برابر جاری رہتا، چاہے ملنے کے لیے کوئی طالب علم آ جاتا یا اسٹاف کا ممبر یا ضلع کا افسر یا شہر یا مضافات کا کوئی رئیس۔ ملنے والے سے بھی باتیں کرتے جاتے اور بچی کی تفریح بھی بنے رہتے۔

ایک طرف نیلوفر جیسی خوب صورت چنچل ذہین بچی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی نورانی شکل اور لطف و مرحمت سے لبریز آزمودہ کار محکم شخصیت۔ میں جب کبھی بچی کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں یا ان کی انگلی پکڑے لان پر ٹہلتے دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے قدیم، جدید کو زندگی اور زمانے سے روشناس کرا رہا ہو، نیز پرانی اور نئی قدروں کا ایک دوسرے سے کس سطح پر کیا رشتہ ہے۔ ادھر یہ قصہ تھا، اُدھر یہ بات پھیلی کہ ڈاکٹر عبدالحق تو قال اللہ قال الرسول قسم کے مولوی تھے۔ علی گڑھ کو کیا جانیں اور ماڈرن یونیورسٹی کے طور طریق کو کیا سمجھیں۔ کچھ ایسے لوگ جو دنیا کو ہر لعنت سے پاک اور ہر نعمت سے بہرہ یاب کرنے پر اپنے آپ کو مامور اور دوسروں کو صرف فتور عقل و نیت میں مبتلا سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملے اور اس طرح گفتگو شروع کی جیسے ان پر علوم جدیدہ کے بصائر و معارف کے وہ دریچے کھول رہے تھے جن تک ڈاکٹر صاحب کی رسائی نہ تھی یا عالمی نظم و نسق کے وہ نکتے واضح کر رہے تھے، جن سے ڈاکٹر صاحب بے بہرہ تھے۔ یہ بھی کافی نہ سمجھ کر کہیں کہیں خیرہ چشمی کی بھی جھلک دکھا دیتے۔ ڈاکٹر صاحب یہ ساری باتیں بڑے تحمل اور شفقت سے سنتے، کبھی مسکراتے کبھی داد دیتے۔ ایک آدھ کلمے ایسے بھی کہہ دیتے جس میں مسلمانوں کی اخلاقی روایات اور وقت کے مطالبات کے علاوہ یونیورسٹی کے تحفظ اور ترقی کے مسائل کی طرف اشارہ ہوتے۔

وقتاً فوقتاً اس طرح کے انٹرویو ہوتے رہتے اور فضا کچھ اس طرح بدلنے لگی کہ وہ لوگ جو اسلامی روایات کو قصۂ ماضی سمجھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ان اقدار اور روایات کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض نے پچھلے طرز عمل پر اظہار پشیمانی کیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے تشریف لے جا چکے تھے، یہ فرمائش کی گئی کہ اسٹریچی ہال میں انگریزی میں تقریر فرمائیں۔ موضوع بحث کچھ اس طرح تھا، 'کیا فقہ اسلامی رومن لا سے ماخوذ ہے'۔ ڈاکٹر صاحب فرمائش پوری کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک ایک دن کے وقفے سے غالباً تین لکچر دیے۔ اسٹریچی ہال حاضرین سے لبریز ہوتا، بغیر کسی یادداشت کے سہل اور شستہ انگریزی میں بے تکلف تقریر کرنے، کتنی مدلل، پُر مغز اور فکر انگیز وہ تقریریں تھیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، قانون کا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خصوصی مطالعہ نہ تھا۔

اس تقریر نے ان کی قابلیت اور شخصیت کا نقش لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے بٹھا دیا۔ کتنے خوش ہوتے تھے، جب کوئی طالب علم کسی علمی موضوع پر ان سے رہنمائی کا خواست گار ہوتا۔ دقیق سے دقیق مسائل کی تشریح آسان سے آسان طریقوں اور مثالوں سے کرتے۔ کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا علم اور اخلاق طلبا کو اس طرح 'اڑ کر لگتا ہو' جتنا کہ ڈاکٹر صاحب کا!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے علی گڑھ میں بھی کام کرتے دیکھا اور مدراس میں بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ کام بہت زیادہ کرتے تھے لیکن مصروف بالکل نہیں نظر آتے تھے۔ برخلاف دوسروں کے جو کام بہت کم کرتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے لیکن مصروف ہمہ وقت نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مصروفیت کام سے نہیں ہے۔ احساس ذمہ داری سے ہے، یہ احساس اپنی ذمہ داری سے متعلق نہ ہو تو دوسرے کی ذمہ داری سے سہی، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص کام کرتے کرتے تھک گیا ہو، اور اٹھنا چاہتا ہو، اسی وقت کوئی دوسرا کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ قدرتاً جھنجھلا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پر یہ حالت کبھی طاری نہیں ہوئی، کتنا ہی کام کتنی ہی دیر تک کیوں نہ کر چکے ہوں۔ کوئی اور کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ اس سے اسی تازہ روئی سے متوجہ ہو جاتے تھے جیسے وہ اس سے پہلے صرف تفریح کر رہے تھے، کام اب شروع کریں گے۔ یہ بات میں نے بہت ہی کم لوگوں میں پائی۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ صاحب غرض! کام کا نہ کھلنا تو سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ صحت اور سکون میسّر ہو تو کام کرنا اور کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے۔ لیکن یہ ثبات ہوش و حواس جس پر صاحب غرض نہ کھلتا ہو اس کو میں اولیاء اللہ کے طبقے میں جگہ دیتا ہوں۔ صاحب غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے، اہل حاجت سے نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم اور دین کا چرچا تھا۔ اس عہد میں علم کا سرچشمہ دین تھا۔ ہر دین کا مقصد خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت ہے۔ یہ فضا جو ہر قابل کے لیے یوں ہی کیا کم سازگار ہوتی ہے کہ اس پر معاشی تنگ حالی سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔ ابتدائے زندگی میں تنگ دستی سے بہتر اور سستی تربیت گاہ میں نے آج تک نہ دیکھی۔ بشرطیکہ تنگ دستی کا یہ زمانہ محنت اور ایمان داری سے کاٹ دینے کی اللہ توفیق دے۔ اس پر ایک

عزیز نے طنزاً فرمایا کہ اللہ کی توفیق ہی درکار ہو تو محنت مزدوری کے بجائے براہ راست دولت اور فراغت ہی کی دعا کیوں نہ مانگی جائے! میں نے کہا کہ بات ٹھیک ہے لیکن اللہ کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ مجھے محنتی اور ایمان دار بنا کر خود کفیل بنا دے اور میری طرف سے بے فکر ہو جائے۔ آپ کو دولت و فراغت براہ راست دے کر وہ اپنی نت نئی مشکلات میں اضافہ کرنا کیسے پسند کرے گا۔

علم اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوب صورتی سے پورے کیے وہ مجھے کہیں اور کم نظر آئی۔ میری تقدیر کو بنانے میں اسلام کو بڑا دخل ہے۔ اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے یا جو میری سمجھ میں آسکا ہے اس سے بڑا تصور انسان کے ذہن و تخیل میں نہیں آسکتا۔ انسان اور اپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا۔ بایں ہمہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہ ملا جس کو میں اس اسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا۔ اسلام ہی نہیں، میں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں، لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے۔ بیش تر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علاحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو، جیسے اس میں 'برہمنیت' راہ پا گئی ہو، اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو۔ لیکن وہ اتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے تو اس کا مامور ہونا اس کی آزمائش پہلے ہے فضیلت بعد میں! فضیلت برہمن کے حصہ میں اور آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اسلام میں نہیں ہوتا۔ مامور من اللہ ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانش مندی نہیں ہے!

اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا مسلمان ہوتا، اور یہ میں نے اس لیے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور ان کو دور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مسلمان میں بھی ہوتا! اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا سابقہ ایسے مسلمان سے اب تک نہ ہوا ہو، ورنہ ایسے مسلمان بے شمار ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر

عبدالحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو، دوسرے اس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں...... انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، شاید وہ بھی ڈاکٹر عبدالحق جیسا مسلمان بننا پسند کرتے ہوں! اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لیے اکثر ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے!

ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملہ میں کوئی سمجھوتا نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے، جیسا کہ ہم آپ اکثر کر لیا کرتے ہیں۔ یعنی عقائد اور اعمال کی ذمہ داریوں سے بہ قدر ستر فی صدی اپنے آپ کو مستثنٰی قرار دیے جانے کا روز ولیشن باختیار خود پاس کر دیتے ہیں۔ ستر فی صدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اجر عموماً ستر گنا ہی ملتا ہے! وہ اسلام کے بتائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر عامل تھے۔ بایں ہمہ وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوش منداور ہمدرد تھے، جیسے ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست۔ وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محبت و مشفق تھے! جیسے ان سے دور یا علاحدہ رہنا بد نصیبی اور ان کا اعتبار حاصل نہ کرنا محرومی ہو۔ ان کے مخالفوں کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ نہ ان کو متعصب قرار دے کر اپنا مطلب نکال سکتے تھے، نہ پرانے خیال اور پرانی چال کا آدمی کہہ کر ان کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ ان کی نظر جتنی علوم دین، تاریخ اور سیر پر تھی، اس سے کچھ کم واقفیت دنیوی علوم سے نہ تھی۔ یونیورسٹیوں کے قواعد و قوانین اور سرکاری تعلیمی دفاتر کے آئین و ضوابط پر ان کو پورا عبور تھا۔ ان سے کوئی یہ کہہ کر بازی نہیں لے جا سکتا تھا کہ اس ملک یا کسی دوسرے ملک کا جدید ترین اصول، نظام یا نصاب تعلیم، یا وہ تھا جس سے وہ آشنا نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو چھوٹی بڑی ہر طرح کی تعلیم گاہوں کے تمام مدارج اور معلومات سے گہری اور عملی واقفیت تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ کالج میں تعلیم شروع کرنے کا اپنا بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز قصہ لکھا ہے۔ بیان کرنے میں طوالت ہو گی، اس لیے نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ اسی حادثے کا

فیضان ہے کہ انھوں نے دوسروں کے لیے تعلیم کو آسان اور ارزاں بنانے میں تمام عمر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتیں صرف کیں۔ علوم مشرقیہ سے قطع نظر جہاں تک علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے لیے آسان اور ارزاں بنانے کی کوشش اور کامیابی کا تعلق ہے، اور اس غرض سے انھوں نے جتنے کالج قائم کیے، وہ ایسا کارنامہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کا ہمسر ریاست مدراس میں (شاید باہر بھی) نہ پہلے کوئی گزرا ہے نہ آج موجود ہے! ان کے کاموں میں مَیں نے جتنی برکت دیکھی بہت کم کہیں اور نظر آئی۔ اچھے کاموں میں وہ تائیدِ غیبی کے قائل تھے، اور اس کی بعض ایسی آپ بیتی سنایا کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ ہر اچھا اور برا آدمی تائیدِ غیبی پر ایمان رکھتا ہے!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی مایوس، مغموم یا منغض نہیں پایا، سوا ایک بار کے جب وہ متفکر نظر آئے۔ تمام دن ان پر یہ کیفیت طاری رہی، دوسرے روز حسبِ معمول ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔ صورتِ حال کچھ اس طرح کی پیش آئی تھی کہ اُس کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا تو اس ادارے کے ایک بنیادی مقصد کو نقصان پہنچتا تھا۔ دوسری طرف اس کو دور کرنے یا بدلنے کی کوشش میں اس کا خدشہ تھا کہ کہیں ادارے کی شہرت نہ مجروح ہو جائے۔ فرماتے تھے، دن بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہا، رات کو کھانے اور نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر اس مسئلے کا حل سوچنے بیٹھا۔ تمام شب اُدھیڑ بن میں گزر گئی، فجر ہوتے حل سمجھ میں آیا اور اس کا فارمولا مرتب کر سکا۔ میں نے عرض کی فارمولے میں ایک آدھ جگہ فارمولا کم جرأت زیادہ نظر آتی ہے۔ فرمایا، آپ نے ٹھیک کہا لیکن ہر موثر اور کارآمد فارمولے میں دو تہائی سوجھ بوجھ، اور ایک تہائی جرأت کا ہونا ضروری ہے۔ حسبِ ضرورت آپ اس تناسب کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں، لیکن یہ چاہیں کہ بغیر جرأت کے کام بن جائے تو یہ ممکن نہیں!

ایک صاحب کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب امریکہ سے واپس آرہے تھے، ڈاکٹر صاحب ان کو لینے دہلی گئے۔ ایک صاحب اور ساتھ تھے۔ جہاز سے اترتے ہی ذاکر صاحب نے علی گڑھ کا حال پوچھا، جو صاحب ساتھ تھے انھوں نے حالات اور واقعات کو مایوسانہ انداز میں بیان کرنا شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بات کا رُخ بدل دیا، اور اپنے مخصوص انداز خوش دلی و خود اعتمادی سے بولے نہیں صاحب حالات ایسے نہیں ہیں کہ فکرمند ہوا جائے۔ یہ تو زندگی کے

معمولات میں سے ہیں، جہاں اتنے تعلیم یافتہ نوجوان اکٹھا رہتے سہتے کھاتے پیتے پڑھتے لکھتے کودتے پھاندتے ہوں وہاں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے۔ اور اب تو ذاکر صاحب آگئے ہیں سارے معاملات یوں بھی رو براہ ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر ذاکر صاحب کو موٹر میں بٹھایا اور علی گڑھ واپس آگئے اور ذاکر صاحب نے دیکھا کہ صورتِ حال وہی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تھی!

ڈاکٹر صاحب عربی فارسی کے عالم متبحر، اردو شعروادب کے شیدائی اور انگریزی اردو کے بڑے اچھے مقرر تھے۔ ان کی تقریریں دل نشیں، بے تکلف اور پُر مغز ہوتی تھیں۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع، معلومات اتنی متنوع، ذہن اس درجہ رسا اور طبیعت ایسی شائستہ اور شگفتہ تھی کہ وہ کسی موضوع پر برجستہ بھی تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ موضوع ان کے مدتوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اردو یا انگریزی میں گفتگو یا تقریر کرتے تو لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا جیسے انھوں نے تمام عمر مدراس اور اس کے نواح میں نہیں بلکہ دہلی، لکھنؤ یا اس کے آس پاس بسر کی تھی۔

تقریر میں ڈاکٹر صاحب فلسفہ، منطق یا سائنس کے اسرار وغوامض کو دخل نہ دیتے۔ خطابت کے فن سے واقف ہونے کے باوصف اس کے حربوں سے کام نہ لیتے، نہ کسی شخص یا جماعت کا مذاق اڑاتے، نہ کسی کو رُلانے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ غرض آرائش گفتار کے لیے جو باتیں درکار ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب ان میں سے کسی کے محتاج نہ تھے۔ سیدھی سادی بات کہتے، لیکن ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا اور اعتماد واعتبار کی ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ بات دلوں کی گہرائی میں اتر جاتی اور خبر نہ ہوتی۔ ایسا کچھ احساس ہوتا جیسے چوں کہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں اس لیے اس کے صحیح اور معقول ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

میرے نزدیک کسی شخص کا دلّی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا اردو کا لب ولہجہ بھی معیاری ہوگا۔ گفتگو میں صحت زبان ہی کافی نہیں ہے۔ لب ولہجہ کا شستہ ہونا بھی ضروری ہے۔ دلّی کے بعض مشہور اشخاص یا گھرانوں سے قطع نظر دلّی والوں کا لب ولہجہ بالعموم خشک اور خشن ہوتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اردو چوں کہ 'کھڑی بولی' پر بنی ہے اس لیے دلّی اور اس کے اطراف کے رہنے والوں کا لب ولہجہ بھی کھرا اور کھڑا ہوتا ہے۔ دوسری طرف جو لوگ

کھڑی بولی کے علاقوں سے علاحدہ لیکن متجانس پراکرتوں کی سلاست اور شیرینی سے آشنا ہیں وہ اردو کے مناسب حال لب ولہجہ پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔ شمالی ہند کی پراکرتوں کے علاوہ چوں کہ اردو کا گہرا ربط فارسی عربی زبانوں سے بھی ہے اس لیے بحیثیت مجموعی اردو لب ولہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا یوں بھی آسان نہیں ہے۔ بتوں کی مانند اردو لب ولہجہ کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جن کو اب تک نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مدراس کے ہوتے ہوئے صحیح اور فصیح اردو بولتے تھے۔ یہاں تک کہ تلفظ کی کوئی ضرب خفی یا جلی ایسی نہ ہوتی جس سے اس کا شبہ ہوسکتا کہ وہ شمالی ہند کے اس خطے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں کا اردو کا لب ولہجہ معیاری ہے!

کسی ماضی کی اہمیت کا مدار محض اس کے ماضی ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری کر سکتا ہے۔ حال و مستقبل کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اصولاً یا کلیتہً ماضی سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے گذشتہ دینی، علمی اور تہذیبی کارناموں کا بڑا احترام تھا۔ یہ بات کچھ تو ان کے مطالعے اور مشاہدے کا براہ راست نتیجہ تھی، اور کچھ اس خلقی ورثے کا تصرف تھا جو ان کو اپنے خاندان کے اکابر سے ملا تھا۔ اپنے ان تصورات کی تشکیل میں وہ طرح طرح سے کوشاں رہتے۔ چنانچہ 1942 میں محمڈن کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر انھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کی ایک نمائش ترتیب دی تھی، جس میں ایسے تاریخی شواہد اور نوادر اس سلیقے سے اس پیمانے پر پیش کیے گئے تھے کہ اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ اس نمائش کی تفصیلی روداد معارف کے صفحات میں شائع ہو چکی ہے۔ وہ نمائش تو اب میسّر نہیں لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے طالب علم اس نمائش کی تفصیل کا مطالعہ معارف کے متذکرہ شمارے میں کریں۔

مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہو جائے، اس سلسلے میں ایک بار عرض کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مدراس کے سب سے اچھے آدمی کو (جہاں تک مجھے علم ہے) علی گڑھ نے پالیا۔ اب اتنا اور چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ نمائش بھی کسی طرح علی گڑھ آجائے، میری دانست میں یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ کا اسے ایک مستقل اور ممتاز جز ہونا

چاہیے۔ رفتہ رفتہ یہ شعبہ اسلامی تہذیب وتمدن کے ایک اعلیٰ درجے کے میوزیم کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا، تجویز نہایت مفید اور مناسب ہے۔ اس کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرنا پڑے گا۔ دوڑ دھوپ درکار ہوگی، شخصی اثرات کو کام میں لانا پڑے گا۔ ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک سے بھی مدد لینی پڑے گی۔ کچھ دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد جو چیز آپ کے ذہن میں ہے وہ عملاً سامنے آسکے گی۔ پھر ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے چلے گئے اور اب جب کہ وہ اس جہاں میں نہ رہے۔ اس اسکیم کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے!

ڈاکٹر صاحب کے پاس عربی، فارسی، اردو کتابوں کا بڑا نادر قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ تھا۔ اس طرح کے نوادر پر ان کی معلومات نہایت وسیع تھی۔ میں نے ان صحبتوں میں بھی ان کو دیکھا ہے جہاں مخطوطات کے اچھے اچھے 'اصحابِ خبر ونظر' موجود ہوتے۔ سبھی ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور تفصیلی معلومات پر متعجب ہوتے۔ ایک بار کچھ اسی طرح کا تذکرہ تھا۔ فرمانے لگے، تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا تو وہاں دو ہی باتوں کی زیادہ فکر رہتی، ایک یہ کہ عربی، فارسی، اردو کے نوادر کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ دوسرے یہ کہ مشہور مستشرقین کون کون تھے، اور ان تک رسائی کیوں کر ہو!

فرمانے لگے، ہندوستان میں مخطوطات تک پہنچنے میں چند باتوں نے میری رہبری کی۔ اس طرح کے مخطوطے والیان ریاست یا رؤسا تک کھنچ کر پہنچ جاتے، کیوں کہ زمانۂ حال تک یہی لوگ اصحاب علم و ہنر کے مربی ہوتے یا پھر اس طرح کے نوادر خانقاہوں میں یا سجادہ نشینوں کے ہاں ملتے۔ اس لیے کہ یہ بزرگان دین خود صاحبِ علم وفضل ہوتے اور اس طرح کے لوگوں کا ماویٰ وملجا بھی، امور دین کی تلقین بھی اردو ہی میں کرتے تھے۔ اس لیے ان کے فرمودات بیاضوں میں محفوظ ہوتے۔ میرے خاندان کے بزرگوں کا تعلق مختلف اور متعدد خانقاہوں اور سجادہ نشینوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے۔ اس لیے اس طرح کے علمی اندوختوں سے مجھے واقفیت رہی ہے۔ ایک بات اور ہے جس پر لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندو حکمراں اور رؤسا بھی اس طرح کے مخطوطات کے شائق ہو گئے تھے۔ چنانچہ بعض بڑے قیمتی اور نایاب قلمی اور مطبوعہ نسخے ان کے کتب خانوں میں آج بھی مل جائیں گے۔ مگر ان کے تلف ہو جانے کا امکان اب بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار میں نے پوچھا، ڈاکٹر صاحب عربی فارسی سے آپ کا شغف تو سمجھ میں آتا ہے۔ اس کی سیاحی میں معلوم نہیں کتنی پشتیں گزری ہیں۔ یہ اردو کا شوق کہاں سے آیا۔ فرمایا، مدراس اور اس کے نواح میں اردو کا چرچا قدیم الایام سے رہا ہے۔ یہاں کے مسلمان جب تک اردو میں دست گاہ نہ پیدا کر لیتے تعلیم اور تہذیب میں اپنے کو کامل نہ سمجھتے۔ اردو میں شاعری کرنا مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کے بعض قبائل میں یہ دستور ہے کہ جب تک کوئی نوجوان حج کر کے نہ آجائے قبیلے میں شادی کا مستحق نہیں قرار پاتا۔ البتہ اس مرتبے کے شاعر ادھر نہیں ہوئے، جیسے شمالی ہند میں ہوئے۔ پھر بھی اردو شاعری کو وہاں بڑی وقعت اور قبول عام نصیب رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی نے اردو کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ مدراس اور ارکاٹ کے مصنفین اور شعرا اور ان کی تصانیف کے بارے میں مَیں آپ کو بڑی مفید اور اہم معلومات فراہم کردوں گا۔ ایک زمانے میں وہاں کی اردو تاریخ لکھنے کا ارادہ ہوا تھا۔ اس کے لیے کافی مواد بھی دستیاب ہوگیا، لیکن پھر دوسرے کاموں میں ایسا پھنسا کہ ادھر متوجہ نہ ہوسکا۔ میٹریل کے علاوہ بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ پھر ہنس کر فرمایا، اگر پبلک سروس کمیشن مدراس کی مستقل صدارت [1] ملی تو کمیشن سے مستعفی ہوکر اس تاریخ کا کام کروں گا۔

---

[1] آہ! کسے معلوم تھا کہ جس دن یہ صدارت تفویض ہوئی اسی دن ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر دفعتاً وہ تبسم نمودار ہوا جسے اقبال نے 'نشانِ مردِ مومن' بتایا ہے! اصغر مرحوم کا یہ شعر آج کتنے دنوں کے بعد یاد آیا ہے:

کائناتِ دہر کیا روح الامیں بے ہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

زندگی کی کوئی آزمائش ڈاکٹر صاحب سے ان کی خلقی مسکراہٹ چھین نہ سکی، لیکن ان کی آخری مسکراہٹ نے زندگی سے اس کی ہر آزمائش چھین لی! بعض دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر سن کر اسی طرح کی بے غیرتی کا احساس ہوا!

اس موقع پر جزع وفزع، صبر وشکر، ایمان ویقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں لیکن کسی ایک کو لکھنے کا جی نہیں چاہتا — خاکم بدہن! حادثہ اتنا بڑا میں اتنا چھوٹا توازن کیسے قائم رہے۔ خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا، غم میں قائم نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، وہ تو جانتا ہے اس طرح کا غم مجھ ناتواں کے لیے کیسی بے پناہ آزمائش ہے!

سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم وبیش چھ ماہ قیام کر کے ہمارے دلوں میں جب اپنے لیے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات و جذبات پیدا کر لیے جو اتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کر سکا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لیے انھوں نے نے تمام عمر کام کیا۔ تعلیمی اور عملی ہی نہیں، معلوم نہیں کتنے اور کام! یہ بات اور زیادہ احترام اور اچنبھے کی اس وقت معلوم ہونے لگتی ہے جب ہم یہ جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے 'راضی وخوش نوذ' ہونے میں ذرا دیر لگاتے ہیں۔ بہ نسبت مدراس اور نواح مدراس کے مسلمانوں کے جو زیادہ سیدھے سادے اور بہت جلد عقیدت اور احسان مندی کے جذبات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتاً وفات پا جانے سے ان پر کیا عالم گزرا ہوگا!

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا۔ صاحب زادی کی شادی کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات غریب لڑکیوں کی بھی شادی کرائی۔ ہر طرح کی مالی امداد پہنچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب یقیناً دولت مند نہ تھے، لیکن اچھے کاموں میں روپے صرف کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے تھے۔ ایک بار کچھ اسی طرح کا ذکر آ گیا تو فرمانے لگے، میں بڑا دولت مند ہوں اس لیے کہ میری اپنی دولت کے علاوہ دوستوں اور عزیزوں کی دولت بھی میرے لیے وقف رہتی تھی!

سائنس کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ اس کا گذشتہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تھا۔ حسب دستور مسلم یونیورسٹی کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وہاں موجودگی علی گڑھ کے لوگوں کے لیے مزید کشش کا باعث تھی، جن کی خاطر تواضع، آرام وتفریح کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمہ داری قرار دے لیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جتنے اصحاب کی گنجائش ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ہو سکتی تھی وہ تو وہاں ٹھہرے۔ بقیہ کا انتظام دوسرے تمام شرکا کے ساتھ کانگریس نے علاحدہ کیا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی مصروفیت اور دوسرے کاموں سے تھوڑی سی بھی مہلت مل جاتی تو

وہ علی گڑھ کے دوسرے نمائندوں کی خیر خیریت لینے نکل جاتے، جیسے ان سب کے میزبان مدراس میں وہی تھے۔ ایک دن علی گڑھ کے تمام لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے۔ معلوم ہوا کہ دو چار اصحاب جو دور مقامات پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ غالباً سواری کا انتظام نہ ہونے کے باعث آ نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے مضطرب ہوئے اور گاڑی لے کر روانہ ہو گئے۔ سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے، کھانا ختم ہونے کے بعد ان کو ان کی قیام گاہ پر چھوڑ آئے اور طرح طرح سے بار بار معذرت کرتے رہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ ان مہمانوں کے لیے سواری کا انتظام کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں جو منزلت اتنی جلدی میسّر ہوئی اس کے میرے نزدیک بعض واضح اسباب ہیں۔ باوجود ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے کے وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کے لیے اتنے ارزاں اور سہل الحصول تھے جتنی سانس لینے کے لیے ہوا، ہمیشہ محبت اور عزّت سے پیش آتے تھے۔ لوگوں کے دکھ درد کو حتی الامکان دور ورنہ کم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان پر لوگوں کو بھروسہ تھا کہ وہ کسی شخص یا جماعت کی ناواجب پاسداری نہ کریں گے۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ قاعدہ قانون سے نہ صرف پورے طور پر واقف تھے بلکہ ان کی پابندی سمجھ داری اور ہمدردی سے کرتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی مفسد اور متفنّی کیوں نہ ہو، ڈاکٹر صاحب کو بدنام نہیں کرسکتا تھا، نہ عوام میں نہ خواص میں! وہ ہم میں کسی سے علم میں کم نہ تھے۔ عمل میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ ان علوم کے عالم باعمل تھے، جن سے ہم میں بہت کم لوگ آشنا ہیں اور جن پر عمل کرنے والا شاید کوئی نہیں، یعنی دین اور اخلاق کا علم! کبھی کبھی کچھ اس طرح کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں علی گڑھ بالکل ایک نئے تجربے یعنی 'مردِ مومن' سے دوچار ہوا ہو!

(مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، جولائی 1958)

●●●

نواب محمد اسماعیل خاں مرحوم

(1884-1958)

نواب محمد اسماعیل خاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پوتے اور نواب محمد اسحاق خاں کے بیٹے تھے۔ وہ اگست 1884 میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ گئے۔ کیمبرج سے بی۔اے اور انرٹیمپل سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپسی کے بعد میرٹھ میں وکالت شروع کی۔ والد کے انتقال کے بعد جائداد کے انتظام کی ذمہ داریوں کے سبب وکالت کو خیر باد کہہ دیا۔

تحریک آزادی میں عملی حصہ لیا۔ ابتدا میں کانگریس میں شامل ہو گئے، لیکن ملّی قیادت کے پیشِ نظر کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی، اور آخر وقت تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آپ کا تعلق آپ کے والد نواب محمد اسحاق خاں کے زمانے سے ہی تھا۔ نواب محمد اسحاق خاں وقار الملک کے بعد تقریباً چار سال تک ایم۔اے۔او کالج کے سکریٹری رہے تھے۔ 1931 سے 1935 تک آپ ٹریژرر کے عہدہ پر فائز رہے۔ اکتوبر 1947 سے 1948 تک آپ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین ہوئے۔ جولائی 1958 میں میرٹھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

نواب محمد اسماعیل خان، نواب محمد اسحاق خان[1] کے بیٹے اور نواب مصطفیٰ خاں کے پوتے تھے۔ شیفتہ[2] کو دیکھا نہیں، لیکن ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا حال کتابوں میں پڑھا ہے۔ شیفتہ کی بڑائی میں کیا شک جب حالیؔ اس پر گواہی دیتے ہوں!

نواب اسحاق خاں یو پی میں سیشن جج تھے۔ ان کے ہم عصر نواب محمد علی[3] بھی، دونوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریزوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس زمانے کے انگریزوں کو! انگریز حکام کا کتنا ہی دباؤ کیوں نہ پڑے فیصلے بے لاگ دیتے تھے۔ مسلمان نوکری پیشہ طبقے میں ان کے نام فخر و مسرّت سے لیے جاتے تھے، جیسے یہ ان کے ہیرو ہوں!

کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ دونوں انگریزی سرکار کی ملازمت میں تھے، لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا درجہ ان لوگوں میں بہتوں سے کم نہ تھا، جو اس زمانہ میں لیڈر کہلاتے تھے۔ بلکہ بعض اعتبار سے ان کی دلیری کا زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ حکومت کی ملازمت میں ہوتے ہوئے ایمان و انصاف کے معاملے میں حکومت کے عتاب کی پروا نہیں کرتے تھے۔ پنشن پا کر دونوں نے ایم۔اے۔او کالج کا انتظام سنبھالا اور اسی خدمت کے دوران میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی!

---

1 نواب محمد اسحاق خاں (1860-1918)

2 نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (1806-1869)

3 نواب محمد علی سرسید کے بڑے بھائی سید محمد کے پوتے اور سرسید کے بیٹے سید حامد کے داماد تھے۔ سول اینڈ سیشن جج مراد آباد، پنشن پا کر ایم۔اے۔او کالج کے ٹرسٹی اور سکریٹری ہوئے۔

نواب وقارالملک کے بعد نواب محمد اسحاق خاں آنریری سکریٹری ہوئے۔ ان کے عہد کے چند واقعات آج تک یاد آتے ہیں۔ ایک کلیات خسرو کی تدوین اور طباعت، دوسرا نظام آصف جاہ سادس کا علی گڑھ میں ورود، تیسرے کالج کے یورپین اسٹاف کا متحد ہو کر استعفیٰ دینا اور اس کا منظور کرلیا جانا، نواب صاحب ہی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں مسز سروجنی نائیڈو علی گڑھ تشریف لائیں، اور اسٹریچی ہال میں وہ مشہور تقریر کی اور ان کے خیر مقدم میں مولانا سہیل نے وہ نظم پڑھی جو اب تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے!

دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی کو فن کا کمال دکھانے کے لیے پہلے علی گڑھ میں نواب صاحب ہی نے دعوت دی تھی۔ یکی بارک کے صحن میں رات کو محفل سجائی گئی تھی۔ عزّت اور محبت کے الفاظ میں نواب صاحب نے باقر علی کا تعارف کرایا تھا، جس کا آخری فقرہ اب تک یاد ہے۔ ''میر باقر علی آج داستان سنائیں گے، کل خود داستان بن جائیں گے!'' باقر علی تھے کہ نواب صاحب کے ہر فقرے اور ہر لفظ پر بچھے جا رہے تھے، اور طلبا کا انداز پذیرائی دیکھ کر جیسے پھولے نہ سماتے تھے۔

داستان شروع کی تو یہ عالم تھا کہ کبھی اس طرح محفل سناٹے میں آجاتی جیسے دور دور کوئی متنفس موجود نہ ہو، اور کبھی تحسین و آفریں کے نعروں کا یہ عالم ہوتا کہ دور دور تک کے لوگ چونک پڑتے۔ کیسے شریف، شائستہ، صحیح المذاق، زندگی کی صحت مند توانائیوں سے لبریز اور تہذیبی روایات سے آراستہ نوجوان طلبا کا اجتماع تھا۔ پھر یکی بارک کی وہ فضا جس میں خود کتنی داستانیں کس کس روپ میں کہاں کہاں خوابیدہ یا بیدار تھیں!

داستان گوئی[1] یوں تو ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس رات میر باقر علی کی داستان گوئی کا کمال دیکھ کر یقین آگیا کہ افسانہ طرازی اور افسانہ طراز کیا ہوتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے فن کار کو آپ کیا کہیں گے جو ماضی کو مستقبل کے لیے ہمیشہ زندہ رکھ سکے!

معاف کیجیے گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی دور کہیں پھینک دیا، ماضی کو میں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا۔ یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو

[1] میر باقر علی داستان گو۔

کبھی کبھی ماضی کا کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں۔ کہتا یہ تھا کہ نواب اسحاق خاں ہم لوگوں کو لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خود بڑے خوش ہوتے تھے۔ رہ رہ کر قہقہے لگاتے، بوڑھے داستان گو کی پیٹھ تھپکتے، با قرعلی فرطِ مسرّت وافتخار سے کھڑے ہو ہو کر تعظیم بجالاتے، اور عالم کیف و جذب میں پہنچ کر اس طرح داستان سنانے لگتے جیسے آج کی رات آخری تاریخ تھی، اس کے بعد نہ یہ فن رہے گا، نہ فن کار، نہ اس کے قدر دان!

نواب محمد اسحاق خاں کے خوش ہونے اور قہقہے لگانے کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ نواب اسماعیل خاں بھی اپنی خوشی اور خوشنودی کا اظہار اسی طرح سے کرتے تھے۔ یہ بات نواب صاحب کے مخلص اور معتبر ہونے کی ایک واضح علامت تھی۔ ان سے مل کر آپ اس تذبذب میں نہیں مبتلا ہو سکتے تھے کہ انھوں نے آپ کا اعتبار کیا یا نہیں، جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی زبان پر آتی۔ اس سے ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہ صرف سہولت ہوتی بلکہ لطف آتا اور حوصلہ بڑھتا۔

نواب صاحب ہم سب پر بڑے مہربان تھے، اور ہم پر بھروسہ کرتے تھے۔ دلیر اور حوصلہ مند تھے، کوئی نازک موقع آن پڑتا اور بات یونیورسٹی سے باہر پہنچنے والی ہوتی تو وہ ہماری فروگذاشت کو اپنی فروگذاشت بنا لیتے اور ہم پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دیتے، ہماری عزّت کو اپنی عزّت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں، گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزّت کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ نواب صاحب ہماری ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے! قبیلے کا سردار ہونے کی ان میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

نواب صاحب عرصے تک یونیورسٹی کے ٹریزرر رہ چکے تھے۔ ملک تقسیم ہوا، تو مستقل وائس چانسلر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اطراف ملک میں مسلمانوں کی آبرو، جان اور مال کی تباہی کا وہ عالم تھا کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد آج بھی ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ قوم بھی جسے مسلمان کہتے کبھی کبھی شرم آنے لگتی ہے۔ کیسی کیسی ہولناکیوں سے جاں بر ہو چکی ہے، لیکن اب تاریخی کارناموں کے بجائے تاریخی رسوائیوں کی خوگر ہونے لگی ہے۔ قرآن پاک میں اس موقع کے لیے غالباً کوئی وعید آئی ہے جو یاد نہیں آتی ورنہ ضرور لکھ دیتا۔

نواب صاحب جس ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہے، جو نہ ان کے قریب تھے نہ صورت حال سے براہ راست واقف، ہر وقت اس کا خطرہ رہتا کہ کہیں یونیورسٹی کا وہی حشر نہ ہو جو دوسری مسلمان بستیوں کا ہو چکا تھا۔ ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آرہی تھیں۔ غارت گروں کا جتھا علی گڑھ کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ نواب صاحب جس لیگ کے ارکان اعلیٰ میں سے تھے اس کی لائی ہوئی تباہیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور کچھ کر نہیں پاتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی متاع گراں بہا مسلم یونیورسٹی کو بچانے کی ذمہ داری ان کے سر تھی۔ مقامی حکام سے بروقت امداد کی توقع موہوم تھی۔ وہ جو انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ فلاں شخص غم یا غیرت کا ایسا شکار ہوا کہ پھر تمام عمر نہیں مسکرایا، کم وبیش یہی کیفیت نواب صاحب کی تھی۔

یہاں پہنچ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ ملک تقسیم ہوا ہے تو کانگریس اور مسلم لیگ کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی تھی، لیکن کانگریس کے ہر طبقے میں نواب صاحب کی ساکھ قائم رہی۔ جس کا ثبوت راج گوپال اچاریہ[1] بالقابہ گورنر جنرل ہند کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسی سال کے کنووکیشن میں کی تھی، اور نواب صاحب کی خدمات اور خوبیوں کا برملا اعتراف کیا تھا۔ کانگریس حکومت کے اتنے ذمہ دار اور مقتدر شخص کا مسلم لیگ کے اتنے ممتاز رکن کو اس زمانے میں علی گڑھ آکر سراہنا معمولی بات نہ تھی!

مسز سروجنی نائیڈو[2] یوپی کی گورنر تھیں۔ علی گڑھ تشریف لائیں، ممدوحہ کے اعزاز میں نواب صاحب نے یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو شب میں اپنے ہاں شعر وسخن کی ایک مختصر اور منتخب محفل میں مدعو کر لیا تھا۔ موصوفہ جہاں موجود ہوں وہاں کی گرمی محفل کا کیا کہنا۔ اس موقع پر اپنے خلوص اور خوش گفتاری سے ایسا کام لیا اور حاضرین میں سے ہر ایک کی فرداً فرداً ایسی دل نوازی کی کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فضا ہی بدل گئی ہو۔ نواب صاحب کو اپنی اور اپنی حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کی حفاظت اور حرمت کا اطمینان دلایا۔ اس زمانے میں حکومت کا شاید ہی کوئی

---

1. راج گوپال اچاریہ
2. مسز سروجنی نائیڈو

اتنا بڑا آدمی باستثناء چند علی گڑھ کی تالیف قلب میں اس جرأت اور مرحمت کا نمونہ پیش کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔

سوچتا ہوں مسز نائیڈو 17-1916 میں نواب محمد اسحاق خاں کی آنریری سکریٹری شپ میں ان کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لائیں اور اپنی بے مثل خطابت سے بقول سہیل مرحوم:

شکست رنگ ساحری چو زد نوائے شاعری
نمود سحر سامری اگر در خطاب زد ![1]

کا کیسا سماں پیدا کر دیا تھا۔ پھر تیس بتیس سال گزر جاتے ہیں۔ نواب اسحاق خاں کے فرزند علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوتے ہیں۔ ملک میں تقسیم کا تہلکہ مچا ہوا ہے۔ مسلمان خاک و خون میں ملائے جانے لگتے ہیں۔ علی گڑھ نرغے میں آجاتا ہے تو وہی مسز نائیڈو کسی کے بلائے بغیر علی گڑھ پہنچتی ہیں اور اپنی شرافت اور مرحمت سے نواب صاحب اور ہم سب کو ڈھارس دیتی ہیں اور اس ادارے کو تاراج ہونے سے بچانے میں گراں قدر حصہ لیتی ہیں۔ آج بھی جب کہ صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے، مسز نائیڈو اور اس صوبے میں ان کی گورنری اکثر بے اختیار یاد آتی ہے اور محزوں بنا جاتی ہے۔ قانون کہتا ہے، گورنر کیا کر سکتا ہے۔ قانون کا یہ کہنا سچ ہے۔ اس لیے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنے والا اس سے زیادہ مستند اور کون ہو سکتا ہے، لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ قانون بنانے والوں اور خود قانون کو یہ نہ معلوم ہو کہ شخصیت کیا کر سکتی ہے!

یادوں کے سلسلے میں باتیں بھی کہاں کہاں پہنچیں! نواب صاحب کو سب سے پہلے غالباً 1920 میں ان کے دولت کدہ مصطفیٰ کاسل میرٹھ میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں میرٹھ میں ایک پراونشل ٹینس ٹورنامنٹ ہونا تھا جس میں شرکت کرنے کے لیے کالج سے ٹیم گئی تھی، اور نواب صاحب کی مہمان ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں مسعود ثامی مرحوم[2] میرٹھ میں غالباً تحصیل دار تھے۔

---

1. اقبال سہیل (1955-1884) ترجمہ: نوائے شاعری کو منتخب کر کے ساحری کے رنگ کو باطل کر دیا اور اگر خطاب کیا تو سامری کے جادوئی اثرات جگا دیے۔

2. مسعود ثامی کی بذلہ سنجی، شوخی اور تفریحی شرارتوں کے قصے اس زمانہ میں ہر علی گڑھ والے کی زبان پر تھے۔ ایک دن یونین کا جلسہ تھا، اچھے اچھے مقرر موجود تھے۔ مسعود ثامی بھی کہیں سے آنکلے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مسعود ثامی کو خبر لگ جائے کہ علی گڑھ سے طلبا آئے ہوئے ہیں تو ملنے کے لیے فرط محبت سے بے قرار ہو جاتے تھے۔ موٹر لے کر مصطفیٰ کاسل پہنچے اور نواب صاحب سے کہا، نواب صاحب کلکٹر صاحب سے آج کی چھٹی لے لی ہے۔ آپ بھی ان لڑکوں کو چھٹی دے دیجیے۔ سب کو پکنک پر سردھنے[1] کا گرجا دکھانے لے جاؤں گا۔ کھانا ساتھ ہے، لنچ اور سہ پہر کی چائے وہیں ہوگی۔ شام تک سب کو واپس پہنچا جاؤں گا۔ نواب صاحب نے فرمایا، لے جاؤ۔ خاطر مدارات خوب کرنا، صرف اپنی عادتیں نہ سکھانا، یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا ثامی مرحوم بھی ہنس پڑے، اور بولے۔ نواب صاحب کاش عادت سکھا دینا ہی آسان ہوتا جتنا آپ کو اندیشہ ہے! پھر دونوں نے قہقہے لگائے اور ہم سب مسعود ثامی کے قبضے میں چلے گئے!

اب کیا بتاؤں اور کیوں کر بتاؤں کہ مسعود ثامی سب کو لے کر چلے ہیں تو ان کی سرخوشی کا کیا عالم تھا، جیسے زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو دفعتاً پوری ہوگئی ہو! علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبا پر مسعود ثامی کس حد تک فریفتہ میں نے کسی اور کو اب تک نہ پایا۔ ہر اعتبار سے کتنا حسین مردانہ پیکر، سرخ سپید رنگت، بالکل جیسی اس زمانے میں انور پاشا کی روغنی تصویر جا بجا آویزاں ملتی تھی۔ ہر وقت خوش رہنا اور ساتھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، کیسا ذہین اور محبت کرنے والا شخص بار بار علی گڑھ کا ذکر اور ہم پر 'نوازش ہائے پیدا و پنہاں'!

(بقیہ پچھلے صفحہ کا)

حاضرین نے بے اختیار نعرہ لگایا کہ مسعود ثامی بھی تقریر کریں۔ وائس پریسڈنٹ (اب پریسڈنٹ) نے کہا کہ مسعود صاحب سب سے آخر میں تقریر فرمائیں گے تاکہ وہ دوسری تمام تقریروں پر تبصرہ فرما سکیں۔ وقت آنے پر مسعود صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور 'ڈھب شو' شروع کر دیا۔ یعنی ہر مقرر کے سراپا، اس کی تقریر اور انداز تقریر کو زبان سے نہیں بلکہ اعضا و جوارح کی حرکات و سکنات سے دکھانا بتانا شروع کیا، جیسے اسکرین پر خاموش تصاویر دکھائی جاتی ہیں۔ گانے اور ناچنے کے فن کے ماہر آواز اور حرکت سے مختلف کیفیات کا اظہار شاید اس خوبی سے نہ کر پائیں، جیسی مسعود ثامی نے اس موقع پر تقریر کرنے والوں کی خاموش نقل ہم کو دکھائی تھی۔ حاضرین کس طرح سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مسعود ثامی۔ رشید احمد صدیقی۔

1۔ سردھنہ ضلع میرٹھ کا یہ مشہور گرجا گھر بیگم سمرو کا تعمیر کردہ ہے اور اطالوی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

آج کے مصطفیٰ کاسل کو دیکھ کر چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کے مصطفیٰ کاسل کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کتنی خوب صورت شان دار عمارت، وسیع باغ اور کتنے گھنیرے تناور درخت جو کبھی کبھی اتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے، جتنے پرانے زمانے کے سورما اور ان کی 'داستان ہائے رزم و بزم'۔ ایسے دیو پیکر درخت اتنی تعداد میں اس قرینے سے یکجا وسط شہر میں مَیں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ عمارت کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا، جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے۔ ایک چیز اب تک یاد ہے، ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا، جس کی اونچائی غالباً 10-8 انچ ہوگی۔ اس وقت اس کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا خیال گزرا تھا کہ عورت میں کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں، یا ابتدا سے آج تک اچھے اور بڑے شعرا نے دریافت کی تھیں، ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا تھا۔ جس کو مجسمہ ساز نے پورا کر دیا تھا!

مدتوں بعد یاد نہیں آتا کسی سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفیٰ کاسل جانا ہوا۔ نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ عمارت، باغ، درخت سب کہنگی، ویرانی اور افسردگی کی زد میں تھے، سوا نواب صاحب کی شفقت اور شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے متاثر نہ تھی۔ آج دفعتاً سننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرما گئے! مصطفیٰ کاسل ڈھے گیا جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہوگئیں۔ محبت و مروّت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضع داری کی یادیں، غیرت و حمیت کی یادیں، شرافت اور شفقت کی یادیں، ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا۔ اس کے اُٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہوگئیں!

کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی!

تقسیم ملک سے پہلے کی تقریباً تیس بتیس سال کی قومی سرگرمیوں میں نواب صاحب کی خدمات کا مسلسل اور معتد بہ حصہ رہا ہے۔ خلافت کی تحریک میں پیش پیش تھے، مسلم لیگ کے اعیان و اکابر میں سے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرر اور وائس چانسلر رہے۔ کوئی غیر معمولی سیاست داں، ماہر تعلیم، عالم فاضل، یا کسی فن میں یگانہ، روزگار نہ تھے، لیکن ایسی شخصیت کے مالک تھے، جس کے بغیر یہ تمام سرگرمیاں نامکمل اور ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہیں!

مسلم لیگ کے آزمودہ کار اور مقتدر رکن ہونے کے باوجود مسلم لیگ میں اتنے قابلِ اعتنا نہیں سمجھے گئے، جتنے کہ وہ مستحق تھے۔ سبب یہ تھا کہ سیاست میں شخص کو نہیں مصلحت کو دیکھتے ہیں۔ لیگ کی مصلحت اور طریقۂ کار سے بحیثیت مجموعی نواب صاحب کی سیرت و شخصیت ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ نواب صاحب نے اپنے لیے ایک سطح مقرر کر لی تھی۔ جس سے وہ کسی حال میں نیچے اترنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی زندگی میں اکثر ایسے مواقع آئے جہاں اپنے اس اصول، مزاج یا طریقۂ کار کی خاطر ان کو نقصان اٹھانا پڑا اور حریفوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ لیکن نواب صاحب اس طرح کی شکست کو اپنی فتح سمجھتے تھے۔ اس لیے بددل اور بے زار ہونے کی بجائے ہمیشہ شگفتہ اور شادماں رہے۔ نواب صاحب پارٹی نہیں بنا سکتے تھے اور پارٹی بنائے بغیر پبلک لائف کے نشیب و فراز سے عزّت اور عافیت سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ نواب صاحب مدتوں علی گڑھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمے دار عہدوں پر فائز۔ اس میں شک نہیں اس زمانے میں (تقسیم ملک سے پہلے) مسلم یونیورسٹی کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا نہ تھا، اور نت نئے مسائل کا اتنا سامنا نہ تھا، جتنا آج ہے۔ پھر بھی انتظامی دشواریاں کچھ کم نہ تھیں۔ یونیورسٹی کی آمدنی بہت کم تھی، ایک ترقی پذیر معیاری ادارے کے لیے مالی دشواری بہت بڑی مصیبت ہے۔ اسٹاف کی کمی، سامان کی کمی، عمارات کی کمی، گرانی کے سبب سے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت، اس قسم کے کتنے اور مسائل تھے۔ جن کا یونیورسٹی کو سامنا تھا، بایں ہمہ نواب صاحب کی شرافت، بے لوثی اور حسن سلوک کا ایسا اثر تھا کہ کسی دشواری نے پیچیدگی یا ناگواری کی صورت کبھی نہیں اختیار کی۔ ادنیٰ ملازمین سے لے کر اعلیٰ عہدے داروں تک سبھی تو نواب صاحب پر بھروسا کرتے تھے، اور خود نواب صاحب سب سے عزّت اور محبت سے پیش آتے تھے، کسی کے پاس حاجت لے کر جائے تو نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے، لیکن نواب صاحب اس وقار سے ملتے تھے، اور اس دل سوزی سے پرسش احوال کرتے اور مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے کہ ذلت کے بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا۔ نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی برا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی برائی پر آمادہ ہو جائے۔

ایک دن نواب صاحب ضلع کلکٹر کے ہاں لنچ پر مدعو تھے۔ شاید کسی منسٹر کے اعزاز میں یہ تقریب تھی۔ اس زمانے میں شاید یونیورسٹی کی اپنی کوئی کار نہ تھی۔ معلوم نہیں کہاں سے ایک خستہ و خوار جیپ آئی۔ وقت تنگ تھا، نواب صاحب عجلت میں تھے، کوٹھی سے نکلے ہی تھے کہ ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے۔ موٹر روک دی، معلوم ہوا کہ عارضی ملازم تھے، تنخواہ کے روپے ملنے میں کوئی پیچیدگی پڑ گئی تھی، اور آفس والوں نے ان کو چکر میں ڈال رکھا تھا۔ نواب صاحب نے ان کو گاڑی میں ساتھ بٹھا لیا، وکٹوریہ گیٹ پر لائے اور کہا کہ اوپر جا کر متعلقہ کلرک کو بلا لائے، وہ آئے تو وہیں آرڈر لکھ کر دیا اور فرمایا کہ ٹریژرر صاحب سے میرا اسلام کہنا اور چیک پر دستخط کرا کے ان صاحب کے حوالے کر دینا۔ اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، لنچ سے واپسی پر پھر گیٹ پر آئے اور دریافت کرایا کہ چیک دے دیا گیا یا نہیں، اطمینان ہو گیا تو کوٹھی پر واپس آئے۔

نواب صاحب نے اپنے ٹریژررشپ کے عہد میں یہ اسکیم پیش کی تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور عمال کو یونیورسٹی کے حدود میں ذاتی مکان بنا کر مستقلاً آباد ہو جانے کے لیے قطعات زمین دیے جائیں اور مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں۔ مقصد یہ تھا کہ ملازمت سے سبک دوش ہونے پر بھی اساتذہ کا بالواسطہ تعلق اس ادارے سے رہ سکے۔ ان کی ہمہ وقت موجودگی سے طلبا کو ہر طرح کا فائدہ پہنچے گا، اور یونیورسٹی میں ایسی فضا پیدا ہو جائے گی جو یہاں کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایات کو صحت مند اور تازہ کار رکھے گی۔ ہندوستان کی اقامتی درس گاہوں میں مسلم یونیورسٹی کا یہ اقدام اپنی نظیر آپ تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس منصب کے بروئے کار آنے پر اس درس گاہ کی دیرینہ اقامتی حیثیت کو اور زیادہ فروغ نصیب ہوگا۔ یونیورسٹی نے اس اسکیم کو منظور کر لیا، چنانچہ مقررہ شرائط پر کافی لوگوں نے بڑے شوق اور حوصلے سے قطعات زمین لیے اور مکان بنوائے۔ پھر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کچھ دنوں بعد اس اسکیم کو ختم کر دیا گیا۔ 1947 کے رستاخیز میں وہ لوگ بھی ادھر اُدھر ہو گئے جنھوں نے مکان بنوا لیے تھے۔ چنانچہ اس اسکیم سے جو فوائد مرتب ہونے والے تھے وہ نہ ہو سکے۔

اس زمانے میں اسٹاف کے لوگ یونیورسٹی کے اس اقدام پر بہت خوش ہوئے تھے، اور اس کا عام چرچا تھا کہ نواب صاحب کو ادارے کے اساتذہ اور عمال کا کتنا خیال تھا۔ ان کے لیے

ان کے قلب میں کتنی وسعت تھی، اور جہاں تک یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کا تعلق تھا، ان کی نظر کتنی دوررس تھی۔

نواب صاحب بڑے سیر چشم تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہمانوں کی موجودگی، شرف اور شادمانی کی کوئی تقریب تھی۔ کھانے انواع واقسام کے ہوتے، کھانے والے بھی ہر طرح کے ہوتے۔ یہ نہیں کہ ہر روز 'معزز مہمانوں' ہی کا مجمع ہوتا، ہر روز تو معزز مہمان کسی کے ہاں نہیں ہوتے۔ نواب صاحب کے ہاں کا دستور یہ تھا کہ خود ان کے یا سرکاری جتنے ملازم یا کام کرنے والے ہوتے اور آس پاس ان کے بیوی بچے ہوئے تو وہ بھی نواب صاحب کے مطبخ سے کھانا کھاتے۔ یہی نہیں بلکہ کھانے ناشتے کا وقت ہوا اور کوئی کلرک یا چپراسی پہنچ گیا جو نواب صاحب کے کلرک یا چپراسی کا شناسا ہوا تو وہ بھی کھانے میں شریک ہوگیا۔ اس طور پر نواب صاحب ہی نہیں ان کے ملازمین اور متوسلین کا دسترخوان بھی کچھ کم وسیع نہ ہوتا! صورت حال کچھ اس طرح کی تھی کہ نواب صاحب کی میزبانی تو 'شرح معین' تھی، ملازمین اور متوسلین کی حیثیت 'ضمنی میزبان' کی ہوتی!

یہ وصف ان کا خاندانی تھا، اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا۔ جس نے وفا نہ کی، مہمان نوازی اور وضع داری کے اوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا۔ ان اوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، یہ دشواریاں بڑھتی گئیں۔ آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہو سکتا تھا، لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے سے رہنا!

نواب صاحب بڑے اونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے، جس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مبتلا ہوں اس کا اظہار ان کی کسی بات سے نہ ہوا۔ ہمارے ہاں ادنیٰ درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے، لیکن جس بات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یونان کے عہد اوّلین کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔

مہمانوں کی تواضع وتکریم، اولاد کی تعلیم وتربیت، گھر کی زندگی کو خوب صورتی اور خیر وبرکت سے مالا مال رکھنے میں نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو بڑا دخل تھا۔ پردہ نشین، باوقار، خداترس، خوش مزاج اور بڑی نفاست پسند بی بی تھیں۔ یونیورسٹی میں غریب عورتوں کا سہارا تھیں۔ آج تک یہاں کے نچلے طبقے کے ملازمین، ان کی بیوی بچے بیگم صاحبہ کی دل نوازی اور دادودہش کا ذکر بڑی محبت اور حسرت سے کرتے ہیں۔ موقع آئے تو ان میں کسی نہ کسی کو یہ کہتے ضرور سُنیں گے کہ کھانے پینے اور عزّت وآرام کے مزے تو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کے زمانے میں اُٹھائے! کہنے کو تو کہا جاتا ہے، کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے، گو اب یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ والدین کی تقدیر بگاڑنے میں اولاد کا دخل کچھ کم نہیں ہوتا! لیکن جہاں تک نواب صاحب کی اولاد کا تعلق ہے، یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت ان کو زندگی میں جو ہمہ جہت شہرت اور وقعت نصیب ہے، اس میں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے فیض تربیت اور خاندان کی اعلیٰ روایات کا بڑا حصہ ہے!

نواب صاحب مجھ پر کتنا کرم کرتے تھے، اور میرے بچوں اور عزیزوں سے کس محبت اور عزّت سے پیش آتے تھے، جی چاہتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے کروں، اس سے نواب صاحب کی شفقت، حق پسندی اور وضع داری کی کیسی قابلِ قدر مثالیں سامنے آسکتی ہیں، لیکن کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے، جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کرلیتا، یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی، اور نہ کروں تو غیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ وہ حق نہیں ادا کررہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے!

نواب صاحب کی فرداعمال تو خدا کے علم میں ہے، اور نجات اُخروی کا سررشتہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، لیکن نواب صاحب کی محبت ومنزلت سے میرا دل جس قدر معمور ہے اس سے امید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخششوں سے ضرور نوازے گا۔ میرا کچھ اس طرح کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت اس محبت سے بھی دیتا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے گنہ گار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے!

●●● (مطبوعہ معارف (اعظم گڑھ) 1950)

مولانا ابوالکلام آزاد

(1888-1958)

ابوالکلام آزاد 1888 میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی درسی تعلیم جامعہ ازہر، کلکتہ اور بمبئی کے اساتذہ سے حاصل کی اور اپنی علمی استعداد ذاتی مطالعہ کتب سے بڑھائی۔ 1905 میں الندوہ کی ادارت سنبھالی۔ 1913 میں ہفتہ وار الہلال کلکتہ سے نکالا۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں کئی بار جیل گئے۔ کانگریس کے صف اوّل کے رہنما تھے۔ 1947 میں آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم ہوئے۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک کے بعض پہلوؤں سے مولانا کو اختلاف تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم ممبر تھے اور کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ علی گڑھ منتھلی میں مضامین بھی تحریر کیے۔

اکتوبر 1920 میں یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جب مولانا محمود الحسن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تو یہ بھی شریک تھے۔ 1949 میں یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد پر خطبہ دیا۔ تذکرہ، غبار خاطر، ترجمان القرآن، انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) مولانا کی مشہور تصانیف ہیں۔ 22 فروری 1958 میں انتقال ہوا۔

مولانا مرحوم سے خط و کتابت عمر بھر میں دو بار ہوئی۔ ملاقات صرف ایک بار وہ بھی ان کے آفس میں چند منٹ کے لیے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق غالباً 1948 کے آخر میں! اس طرح میں ان لوگوں میں ہوں جو مرحوم کے بارے میں براہ راست بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ مرحوم کی نجی، قومی یا علمی زندگی سے اسی حد تک متعارف ہوں جس حد تک کتب، رسائل، تقاریر اور مختلف اشخاص کی مدد سے مجھ جیسی محدود فہم و فکر کا آدمی مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ہو سکتا ہے!

بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی۔ الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، اور میں اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔

عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بُرے کاموں کے لیے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی، بالخصوص بوڑھوں کو جنھیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسّر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا۔ واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لیے حسین و غمیں ہے! بہر حال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اس کی تقدیر ہی یہ ہے۔ آج مولانا آزاد بھی اس جہاں سے اٹھ گئے کس کو یاد کر کے کس کا ماتم کروں!

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفریندۂ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کش مکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے۔ کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے!

سیاسی پلیٹ فارم پر مولانا کے آنے کا وہی زمانہ تھا، جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی اور ہز ہائینس آغا خاں[1] اور مولانا محمد علی[2] اور شوکت علی[3] بھی ہمارے ویسے ہی ہیرو بنے ہوئے تھے جیسے بلقان اور طرابلس کے جاں باز مجاہد! اس سے پہلے مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور تقسیمِ بنگال اور اس کی تنسیخ کا عمل اور ردّ عمل بھی سامنے آ چکا تھا۔ برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ہندوستانی قومیت کے متحدہ محاذ کا انتخاب کیا۔ اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ کے پروگرام کی تائید میں نہ تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ دونوں کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ اس عقیدے کی حمایت میں ان پر کیسے کیسے حادثات نہیں گزر گئے، دو چار مہینے یا سال نہیں کم و بیش نصف صدی تک گزرتے رہے!

قطع نظر اس سے کہ مولانا نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے کس محاذ جنگ کا انتخاب کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ مجھے جو چیز سب سے عجیب اور عظیم نظر آئی وہ ان کا اپنی فراست پر بھروسہ اور اپنے عقیدے کی محکمی تھی۔ کتنی مدت پہلے انھوں نے اسی فراست کی روشنی میں جو راستہ اختیار کیا اور جس منزل کو سامنے رکھا اس سے تمام عمر سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں تذبذب اور تفرقے کی کیسی کیسی نزاع اور نزاکتوں کا سامنا ہوا اور ان کی زد میں آ کر کیسے کیسے ساتھیوں نے فکر و عمل میں کیسے کیسے ردّ و بدل کیے لیکن مولانا نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا۔ سیاست کے صحیفے میں اس طریق عمل کو کبھی کبھی نہیں بھی سراہا گیا ہے لیکن اس کو

---

1. آغا خاں۔
2. مولانا محمد علی۔
3. مولانا شوکت علی۔

کیا کہیے کہ بالآخران تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں اور سرداروں کو جو سیاست کے الیاس و خضر یا قیس و کوہکن سمجھے جاتے تھے، اسی راستہ پر آنا اور اسی کعبۂ مقصود کی طرف پلٹنا پڑا جو مولانا کا بتایا ہوا تھا!

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے جو کہیں کہیں یا تو نظر سے گزرا ہے یا سننے میں آیا۔ کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ ''تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں۔'' دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے۔

بلقان اور طرابلس کی جنگوں کا نعرہ مولانا کی زبان اور قلم سے نکل کر پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجا اور دل میں اتر گیا۔ ان کی تحریر و تقریر کی بجلیاں اور زلزلے ہندوستان میں وہی کام کر رہے تھے جو مسلمان مجاہدین یورپ اور افریقہ کے میدان کارزار میں اپنے لہو اور تلواروں سے انجام دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمارا تصور تاریخ کی کتنی صدیوں اور کھنڈروں کو روندتا کھوندتا اس عہد شرف و سعادت میں پہنچ جاتا جہاں شیدایان اسلام داد شجاعت و شہادت دے رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا یا ان کے اخبار الہلال کے خلاف حکومت جب کوئی تادیبی کارروائی کرتی، اخبار سے ضمانت طلب کی جاتی یا مولانا کو نظر بند کر دیا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے مسلمانوں کا کوئی جاں باز جنرل میدان جنگ میں اسیر ہو گیا یا کام آ گیا۔ بلقان اور طرابلس کے محاربے (حق و باطل کی جنگ) جہاں کہیں جب کبھی برپا ہوں گے مولانا کی تحریریں اور تقریریں دعوت دار و رسن دیتی رہیں گی!

یہ پہلا موقع تھا جب مولانا کی تحریروں کے طفیل ہندوستان کے مسلمانوں کو دور دراز بکھرے ہوئے مسلمانوں کی ابتلا و آزمائش میں شریک ہونے کا احساس و افتخار ہوا۔ گو یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے دکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق باہر کے مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوئی، نہ وہاں کے زعما کو نہ عوام کو! اور یہ اس ہندوستانی مسلمان کا کارنامہ ہے جس کی ہندوستانی قومیت کی محکمی سے کٹر سے کٹر ہندو اور جس کے اسلامی تصورات، مذہبی معتقدات اور دینی خدمات سے کٹر سے کٹر مسلمان انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بایں ہمہ ہندستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم و جور اپنے ملک کے مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام نے اٹھایا، وہ ہندوستان میں شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصہ میں آیا ہو۔

گاندھی جی[1] اور مولانا ابوالکلام کی زندگیوں میں ایک بات کتنی الم ناک، لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اس وقت جب کہ مسلمانوں کے جان و مال و آبرو کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے۔ مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہوگی لیکن فرطِ افتخار سے سر اونچا ہو جائے گا، اگر کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا! ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندستانی مسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہیے!

تقسیم ملک سے اب تک ہندوستان کی سیاست جن دشواریوں اور نزاکتوں سے گزری اور اب تک گزر رہی ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کرنا نہ تو ضروری معلوم ہوتا ہے نہ میرے بس کی بات ہے، لیکن اس دوران میں حکومت ہندوستان کی خارجی اور اندرونی پالیسی پر مولانا کی سیاسی بصیرت آئینی تدبر، اخلاقی بلندی، علمی فضیلت اور شخصی وقار کس طور پر اثر انداز ہوتا رہا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نگہ داشت کے نہایت درجہ مشکل اور نازک فرائض جس خاموشی، دل سوزی اور قابلیت سے مولانا نے انجام دیے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ مولانا کی خدمات کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی حمایت اور ان کے گرتے ہوئے حوصلوں کو اونچا کرنے اور رکھنے کے فرائض ایسے حالات اور ایسے زمانے میں انجام دینے پڑے جن سے زیادہ مشکل اور نازک زمانہ مسلمانوں پر اس برصغیر میں شاید پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت انجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی! کس عظمت اور کیسی غیرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ وتنہا اس مسلمان کے حصے میں آیا جس

---
1 گاندھی، کرم چند (1948-1869)

سے زیادہ مطعون اور مغضوب تقسیم ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا!

ہندوؤں یا حکومت ہند میں یہ غیر معمولی ساکھ مولانا نے محض حسن اتفاق سے نہیں پیدا کر لی تھی۔ ہندو تو پھر ہمارے ہی آپ جیسے انسان ہیں، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور رہے ہیں جن میں مولانا کسی سے پیچھے نہیں اور بہتوں سے آگے تھے، جن کا سابقہ انسانیت سے ناآشنا وحشیوں سے ہوتا تو وہ ان میں بھی اپنی سرداری مسلم کرا لیتے! سفا کی یا چالاکی سے نہیں برگزیدگی اور بہادری سے۔ مولانا کو صبر و صداقت کی کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر یہ منزلت حاصل ہوئی ہوگی۔ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را، کا جیسا ماجرا جو مولانا پر گزرا ہوگا، اس کا احساس ان لوگوں کو کیسے دلاؤں جو نہ اس صورت حال سے آشنا ہیں جن میں مولانا گرفتار تھے، نہ اس کرب سے جو شاعر نے اس شعر میں بھر دیا ہے!

حکومت میں مولانا کو بعض ساتھیوں کے تعصب اور تنگ نظری کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اور کس غیرت مند کو نہیں کرنا پڑتا! یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب نامساعد حالات کا ہجوم تھا۔ ان پر جو گزرتی تھی اور کیا کچھ نہیں گزرتی تھی اس کو وقار اور خاموشی سے سہتے تھے۔ مولانا کو اپنا ہم خیال بنانے میں کبھی تامل نہیں ہوا، لیکن اپنا غم گسار بنانا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی طبیعت کا بڑا امتیاز خاصہ تھا۔ وہ اپنے عزائم کے سامنے کسی دشواری کو ناقابل تسخیر نہیں سمجھتے تھے۔ دنیوی جاہ و منزلت سے بے نیاز تھے۔ کسی سے جھگڑتے نہیں تھے، جھگڑنا اپنے رتبہ سے فروتر سمجھتے تھے، لیکن اس کی نوبت آ جاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ حریف کے مقابلہ میں یہ ان کی پہلی جیت ہوتی تھی۔

علم کی معرفت اور مذہب کے شرف و سعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب و مکروہات اور سیاست کے شور و فتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے۔ جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں۔

یہاں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک دہلی کی سب سے بڑی مسجد میں پیش آیا، دوسرا ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان حکومت میں! 1947 کے اکتوبر میں شمالی ہند کے مسلمان بالعموم اور دہلی کے بالخصوص تقسیم ملک کے تہلکے سے ہراس اور درماندگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان لیڈر ایسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کو ڈھارس دیتا یا ان کی حمایت میں آگے آتا بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ لیڈر خود سراسیمہ اور درماندہ تھے!

مولانا دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے جو مسلمانوں کے جبروت وجلال، شوکت وشادمانی، اقبال واختلال کی کتنی کروٹیں دیکھ چکی تھی۔ مسلمانوں کے خاموش، مایوس اور ملول مجمع کو دیکھا، جیسا مجمع آج سے پہلے انھوں نے نہ کسی اور نے ہندوستان میں کبھی دیکھا تھا۔ پھر جیسے بوڑھے سردار کی شریانوں میں خون کے ساتھ عزیمت اور حمیت کے شرارے کوندنے لگے ہوں لیکن اپنے وقار پر قابو رکھتے ہوئے جو اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا، بولنا شروع کیا:..............

یہ تقریر اردو کے بیش تر اخبارات میں تمام وکمال چھپ چکی ہے، اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو اس کے اکثر ٹکڑے زبانی یاد نہ ہوں۔ چاہا تھا کہ ناظرین کی خاطر جہاں تہاں سے اس کے اقتباسات ہی پیش کر دوں لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی کہ کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو نہیں۔ اس تقریر پر تبصرہ بجائے خود ایک مضمون بن جاتا۔ اس لیے بادل ناخواستہ ارادے سے باز رہنا پڑا۔ جامع مسجد کی اس تاریخی تقریر سے مسلمانوں کے حوصلے بندھے اور خوف ومایوسی کی تاریکی چھٹنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکست وشکن میں ہمواری اور اس زمین پر بسنے والوں کے پاؤں میں استقامت آ گئی ہو! کسے معلوم مولانا، ان کی تقریر اور اس مجمع کے ہلکے گہرے نقوش جامع مسجد کے سنگ وخشت، سقف ودر، مینار ومحراب، نقش ونگار میں کس نامعلوم طریقہ سے پیوست یا مرتسم ہو گئے ہوں! اور خدا ہی جانتا ہے کہ قوم کی تقدیر میں ان کی بازگشت کب اور کس طور پر سنائی دے!

دوسری تقریر پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن[1] کے اس اتہام لگانے پر کرنی پڑی کہ وزارت تعلیمات ہندی سے سرد مہری برت رہی ہے، اور اردو کی بے جا پاسداری کرتی ہے۔ اس

1. پرشوتم داس ٹنڈن

اتہام کے پیچھے کھلے چھپے کتنے اور الزامات تھے جن کا اندازہ کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں۔ مولانا نے پارلیمنٹ کے آداب اور خود اپنی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس وقار برہم اور صداقت بے باک سے جواب دیا وہ ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے۔ اس کی روداد بھی اخباروں میں آچکی ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ پوری پارلیمنٹ جس کے اراکین میں سے شاید بہتوں نے مولانا کی یہ تقریر پورے طور پر سمجھی بھی نہ ہو، مولانا کے خطاب سے سناٹے میں آگئے۔ سکوت کا یہ عالم اور سطوت کا یہ سماں ہندستانی پارلیمنٹ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو! اس کے بعد اردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت و انصاف سمجھا جانے لگا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس تاریخی جلسے میں جو دہلی میں گذشتہ موسم سرما میں ہوا تھا، مولانا کی اردو کی حمایت میں آخری تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ہی اردو کا سب سے بڑا خطیب، اردو کا سب سے شان دار انشاپرداز اور اردو ہی کی کتنی حسین اور عظیم شخصیت ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اب دیکھیے اردو کے باب میں!

کسے ہے حکم اذاں لا إلہ الا اللہ!

رینائسنس (احیاے علوم) اور ریفرمیشن (اصلاح دین) کی واپسی زبردست اور عدیم المثال انقلابی تحریکیں یورپ میں برسرکار آئیں، جنھوں نے یورپ کو دنیا کی تمام دوسری اقوام سے یک لخت اس درجہ بلند کردیا کہ دوسری قوموں کو صدیوں بعد تک ان مدارج تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ ان تحریکوں نے جو کچھ کر دکھایا تاریخ عالم کے بڑے بڑے کشور کشاؤں کے حصے میں نہ آیا تھا۔ انسان کی صالح اور صحت مند پوشیدہ قوتوں کو بروے کار لانے میں مذہب (اعتقاد) اور علوم بڑے زبردست اور پائدار محرکات ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام کا ظہور بجائے خود اصلاح ادیان اور احیاے علوم کی براہ راست بشارت تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رینائسنس اور ریفرمیشن دونوں بڑی حد تک اسلام کا عطیہ ہیں! لیکن مسلمانوں کی عام غفلت اور ان تحریکوں کے غیر معمولی غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکومتیں اور مسلمانوں کے عقائد اور اعمال، دونوں مغربی افکار اور استعمار کی زد میں آگئے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے کہ جو قومیں اپنے اعمال کا حساب نہیں لیتی رہتیں ان کو ایسے ہی بُرے دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو

ایک طرف اپنی حکومتوں کو، دوسری طرف اپنے افکار وعقائد کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنے کی مہم کا سامنا تھا۔ حکومتوں پر کیا گزری یا گزر رہی ہے یہاں خارج از بحث ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تبدیلی اور اصلاح سب سے دیر میں حکومتیں قبول کرتی ہیں اور ان کا احساس واظہار سب سے پہلے قوم کے ارباب فکر ونظر کرتے ہیں۔

اسلامی عقائد وافکار کو مغربی اور مروجہ عقائد وافکار کی روشنی میں پرکھنے اور تعبیر کرنے کا فریضہ ہندوستان میں غدر کے بعد جن بزرگوں کے حصہ میں آیا ان میں بعض یہ ہیں: سرسید، جسٹس امیر علی، شبلی، اقبال، ابوالکلام اور مولانا مودودی۔ ان سب کا مقصد ایک تھا۔ طریقۂ کار و استدلال جدا تھا۔ یہ صورت حال مقامی نہ تھی، عالم گیر تھی۔ مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ میں جمال الدین افغانی، مفتی عبدہٗ، رشید رضا وغیرہ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کردینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی ہندو عقائد اور قومیت کے احیا اور تشکیل نو کی تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جس کے اہم مرکز دکن، بنگال اور پنجاب میں تھے۔ یہی نہیں بلکہ بدیسی کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ہندو سرمایہ دار بھی صنعتی اور اقتصادی محاذ پر پورے طور سے منظّم ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں کی کیا حیثیت بن گئی تھی، اور مسلمانوں کی کیا رہ گئی تھی!

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن دشواریوں میں مبتلا تھے، ان میں بعض یہ تھیں: مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام، انگریزوں کا مسلمانوں سے برہم اور برگشتہ ہونا، مسلمانوں کا ضرورت سے زیادہ کبھی آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پر اَڑنا، اسی طرح کبھی طرز کہن سے ڈرنا اور آئین نو پر اَڑنا، مذہبی اور تہذیبی احیا اور سیاسی وصنعتی تنظیم میں ہندوؤں کی پیش قدمی، مسلمانوں کی سیاسی کسمپرسی، اقتصادی بدحالی، صنعتی پس ماندگی، تعلیمی پستی اور عام مایوسی و درماندگی! سرسید نے ان کا مداوا بہ حیثیت مجموعی علی گڑھ تحریک میں پیش کیا جس کی مرئی اور متعین شکل مدرستہ العلوم کی تھی جواب مسلم یونیورسٹی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک اور مسلمانوں کے لیے غدر انیسویں صدی کا سب سے الم ناک انقلابی حادثہ تھا۔ جس نے ہندوستان میں ان کی کئی سوسالہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت کو کلیتہً

زیروزبر کردیا۔ مسلمانوں میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے فکروعمل کے لیے یہ صورت حال ایک بے اماں و بے درماں آزمائش سے کم نہ تھی۔ نظر بر آں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی اس بنیادی اور تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دونوں مسلمانوں کی تقریباً ہمہ جہت آبادکاری و بردمندی کا مشن بھی تھیں اور مشین بھی! اور اپنے گوناگوں مقاصد کے حصول میں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کے ضد معلوم ہوتے تھے۔ براہ راست یا بالواسطہ اس حد تک کامیاب ہوئے، جس حد تک ہندوستان کا کوئی اور مسلم ادارہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔

کچھ تعجب نہیں سرسید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک اور مدرستہ العلوم (مسلم یونیورسٹی) کو کسی نہ کسی حد تک دانستہ یا نادانستہ طور پر رینائسنس[1] اور ریفرمیشن[2] کی روشنی میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ اس خیال کو اس بنا پر اور تقویت پہنچتی ہے کہ اصلاح دین کی تحریک دہلی میں مدتوں سے برسرکار تھی، جو سرسید کے عہد میں اور زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا گھرانا اس تحریک میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا۔ اسی اصلاح دین سے احیائے علوم کے چشمے پھوٹتے تھے۔ پرانے زمانے میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام میں بھی علوم کا سرچشمہ مذہب تھا۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات وحوادث سے دوچار تھے ان کے پیش نظر علی گڑھ تحریک میں کچھ اور مقاصد بھی شامل کرلیے گئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں رینائسنس اور ریفرمیشن کی قیادت کے لیے جس عظیم اور جامع حیثیات شخصیت کی ضرورت تھی، وہ صرف سرسید[3] کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر سرسید رحلت فرماگئے۔ بیسویں صدی کے عشرۂ اوّل میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رُخ اختیار کیا اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا، اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم اور ہمہ جہت نہ تھی جتنا کہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس وقت ایک نئے سرسید کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام نے ادا کیا۔

---

1. Renaissance۔ نشاۃ ثانیہ

2. Reformation۔ دورِ اصلاح

3. سرسید احمد خاں (1817-1898)

سرسید ہی کی طرح وہ اعلیٰ خاندانی روایات ، اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد، اسلامی اقداراور اسلامی تہذیب واخلاق کے حامل اور مبلغ ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو پہچانتے تھے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے تھے۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ شرافت، قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو شعروادب کا اعلیٰ ذوق اور تحریر وتقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ایک بات جو سرسید اور مولانا کو ایک دوسرے سے جدا اور متمائز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید عامۃ الناس سے بڑا گہرا قریبی اور ہمہ وقت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے ان ہی میں سے ہوں، ان کے پاؤں زمین میں بڑی مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے ہر پیمانے پر سوچتے تھے اور اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں پر غدر کی تباہ کاریوں کا شدید اور عالم گیر اثر تھا۔ سرسید کا کمال اور کارنامہ یہ تھا کہ دور اور دیر کی اسکیموں کو بروے کار لانے کے علاوہ موقع آن پڑتا تو وہ فرسٹ ایڈ (حادثے پر فوری چارہ سازی) بھی کرتے۔ سرسید کے اس فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خودغرضی ناسمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمۂ صحت!

مولانا ابوالکلام عوام کے آدمی نہ تھے کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا! شاید انھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند وویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ یہ بحث آگے بھی آئے گی۔

یہاں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مولانا ان تحریکوں کی تائید میں نہ تھے! یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی، اس کے خلاف مولانا کی لکھنؤ میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انھوں نے سپردقلم کیے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت، شدید طنز اور اعلیٰ انشاپردازی کے اعتبار سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد جب حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہرگزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں، وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ ان میں سے ایک ذاکر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلر شپ قبول کرنے پر

آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے، لیکن وقت آیا تو ان ہی دونوں کو اس کی حمایت وحفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے! 'بت خانے' کی یہ 'کرامت' کیا کم ہے:

کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد!

ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دنیا کے راستوں پر نہیں بلکہ دنیا کو اپنے راستے پر چلنے کے لیے تیار کر لیتے ہوں۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مردان کار آگاہ، کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کسی کے مشورے یا مدد کے خواست گار نہیں ہوئے۔ ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے۔ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیار خوب و زشت کی پابندی کر سکتے تھے!

مولانا عزلت نشین، دیر آشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے 'خاصانِ بارگاہ' سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیبات نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم پختہ ہوتا ہے، عبادت و ریاضت میں گزارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعۂ ذات اور محاسبۂ نفس ہوتا ہے۔ اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کا کیا مشن ہے اور وہ خلق خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دعوت حق اور خدمتِ خلق کے لیے عامتہ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کسی خاص عہد میں اس مرحلے و منزل سے گزرے یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے اور مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبے کے لیے اپنی کمیں گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے، اور بہت بڑی بات ہے۔ اور اپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے، اور بہت معمولی بات ہے۔ اوّل الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا، اور موخر الذکر بجائے خود ایک مقصد ہے، لیکن ادنیٰ مقصد ہے۔ ایک پناہ لینا ہے، دوسرا بے پناہ بننا ہے! اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کا مزاج خانقاہی نہ تھا۔ آخرت میں

مولانا کے ساتھ جنت کیا سلوک کرے وہ تو مجھے نہیں معلوم، دنیا میں تو مولانا نے جنت کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا!

مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریق دعوت کے بجائے آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی۔ وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے!

مولانا کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت تھی، اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب طرز کی ایک نشانی یہ بھی ہے! مولانا نے لکھنے کا انداز، لب ولہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں پر رعشۂ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی ساز گار تھی جتنی خدائی کے رول سے! خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا۔ اس لیے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں سے نہیں ہوتا۔ اس لیے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرز خطاب سے جداگانہ ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا۔

صحفِ سماوی میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، انسان نے ہمیشہ ان کو اپنی بہترین احساسات کے مطابق فنون لطیفہ میں تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی افکار کو شعروادب سے اور شعروادب کو مذہبی افکار سے سب سے زیادہ تازگی اور توانائی ملی ہے۔ فارسی اور اردو نظم میں رومی اور اقبال نے جس حرارت دینی، علمی تبحر، عصری بصیرت، شاعرانہ حسن کاری اور فن قدرت سے کلام پاک کو متعارف کیا۔ اس کی جھلک اگر کہیں ملتی ہے تو ڈانتے اور ملٹن کی نظموں میں، جو عیسوی تصورات مذہب کی رہینِ منت ہیں۔ ان مشہور عالم شعرا کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنت اور جہنم کے اسلامی تصورات سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ کلام پاک کی

تعلیمات اور تصورات کو اردو میں اس بصیرت، زیبائی و برنائی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ اللہ کا کلام ہی نہیں بندوں کا عمل صالح بھی معلوم ہو، معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں۔ اردو میں یہ کارنامہ مولانا آزاد کا ہے!

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغاز اسلام سے آج تک یکساں بلند ہے جس کا سب سے بڑا سبب کلام پاک کی غیر متبدل زبان و بیان اور اس کے معانی و مطالب کا عالم گیر اثر و نفوذ ہے۔ ان قوموں سے قطع نظر جن کی مادری زبان عربی ہے بے شمار ایسے مسلمان ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور ہے، لیکن کلام پاک کی تلاوت و ترتیل، اوراد و وظائف کے التزام، مذہبی فرائض بجالانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ کی زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور ان کے ذہنوں میں پیوست ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدراس میں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اس کی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ اب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی۔ ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔

یہاں عربی اور فارسی زبانوں کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے جس کو زوال نہیں اور اس زبان کا صحیح عمل دخل جہاں کہیں جس زبان اور قوم میں ملے گا ان میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی تازگی اور توانائی بھی ملے گی۔ فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور تھا، اور ان کا ذوق جس طرح ان کی ذہن و فکر میں رچ بس گیا تھا، وہ مولانا کے قلم اور زبان سے اردو میں سہ آتشہ ہو کر نمودار ہوا!

یہ بات صرف عربی فارسی زبانوں تک محدود نہیں ہے۔ زبان کے معیار کو بلند اور کارآمد رکھنے میں الہامی اور کلاسیکی زبانوں کی اہمیت مسلّم ہے، بشرطیکہ اور یہ بہت بڑی شرط ہے کہ ان زبانوں کا اثر اور ان کی افادیت بولنے اور لکھنے والوں کی عملی زندگی میں مسلسل اور موثر طریقے پر ملتی ہو۔ زبان نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے نہ زبان کے بے وقوف

دوستوں کے حسب نسب سے وہ ترقی کرتی ہے۔ بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے سے۔

سرسید[1]، شبلی[2]، حالی[3]، نذیر احمد[4]، محمد حسین آزاد[5] سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائیں گے، لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیرو کا نہ ملنا مولانا کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہے اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا کا اسٹائل ادب اردو کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں یا اس کی فائدہ رسانی کی عمر ختم ہو چکی یا مولانا کی تحریروں میں اسٹائل کا غلبہ اور مواد کی کمی ہے یا مولانا کے مضامین کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں، جو عربی فارسی کی جینیس (Genius) سے نا آشنا ہو، کامیاب نہ ہوگا تو میں اس سے "جدال سدری" قسم کی تفریح پر بھی آمادہ نہ ہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ بے مثل اسلوب جس میں عجم کا حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں کے ساتھ 'شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی' بھی ملتا ہے، مولانا پر ختم ہو گیا۔ ایک جگہ عرفی[6] نے اپنے انداز خاص سے ماتم کیا ہے کہ تمام شہر و دیار چھان ڈالے، لیکن 'نیافتم کہ فروشند بخت در بازار'۔ نصیبے کی طرح اسٹائل کا بھی یہی حال ہے بالخصوص مولانا کی اسٹائل کا!

صحافت کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کی سرگرمیاں بالعموم روزمرہ کے حالات وحوادث پر رائے زنی تک محدود ہوتی ہیں۔ مسائل حاضرہ پر تبصرہ اور خبریں پڑھ کر ہم دوبارہ اخبار کی طرف التفات نہیں کرتے، اخبار کے بارے میں کبھی کبھی ایک کہاوت بھی سننے میں آجاتی ہے یعنی اتنا باسی جتنا کہ گزرے ہوئے دن کا اخبار! ہمارے بعض بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار صحافت کے نشے یا طلسم میں ایسے اسیر ہوئے کہ آخر تک نکل نہ پائے اور ان کی تحریریں 'صحافتی' قرار پائیں۔

---

1 سرسید (1817-1898)

2 شبلی

3 الطاف حسین حالی

4 نذیر احمد

5 محمد حسین آزاد

6 عرفی

مولانا کا ابتدائی عہد (جنگ بلقان سے پہلی جنگ عظیم تک) اردو صحافت کا زرّیں دور تھا۔ گذشتہ پچاس سال میں اردو کے اچھے سے اچھے اخبار اور ان کے مدیر قوم اور ملک سے روشناس ہوئے جنھوں نے اردو جرنلزم کو بڑی ترقی دی، لیکن سوائے مولانا کے کسی اور کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ادب کی صف اوّل میں جگہ نہ ملی اور صرف الہلال اور البلاغ کے مضامین کو علمی اور ادبی درجہ نصیب ہوا۔

بذات خود میں نہ مولانا کو متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور البلاغ کو صرف اخبار۔ مولانا کسی مسئلہ پر نہ سرسری طور سے غور کرتے تھے نہ اظہار خیال۔ بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلّمات کی روشنی کی تاب لا سکے۔ کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی و ادبی معیار پر صحیح اُترے۔ ادارت کے مصروف پروگرام اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے، صرف مولانا ایسا کر سکتے تھے۔ اردو صحافت کو مولانا نے کلاسیکس کا درجہ عطا کیا۔ مولانا کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی تھی۔ نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ، ان کی تحریروں تقریروں نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنہ قدیمہ میں یونان کے زندہ جاوید رزمیہ نگار مصروف کار ہوں۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے!

مولانا کے یہاں انشاپردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ الہلال میں دعوت دار و رسن ہے، تذکرے میں دعوت دید و شنید، غبار خاطر میں دعوت نوش و نشید، تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا!

غالباً الہلال اور تذکرہ ہی کے زمانے میں مولانا نے تفسیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ کلام پاک کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن تفسیر کا کام بدرجہا مشکل اور نازک ہے۔ اس لیے کہ اس میں عربی زبان و بیان پر عبور ہونے کے علاوہ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر عقیدے کی محکمی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی لازمی شرائط ہیں۔ تفسیر میں مفسّر کے نقطۂ نظر کا راہ پا جانا جتنا مناسب ہے، اتنا ہی ناگزیر بھی ہے۔ تفسیر میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں جہاں تاویل و تعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں۔

چنانچہ الہامی اور مذہبی کتابوں پر معتقدین اور منکرین نے برنباے اعتقاد یا انتقاد اب تک جتنے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نوعیت کی کتاب کے بارے میں دیکھنے میں آئیں۔

تفسیر لکھنے والوں کا کبھی کبھی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تاویل کلام الٰہی میں پالیں —— مولانا نے اپنی تفسیر میں (جو شاید پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی) اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کلام الٰہی میں اپنے نقطۂ نظر کا جواز نکالنے کے بجائے کلام پاک ہی کے نقطۂ نظر کو پانے اور پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام بڑی دیانت اور جرأت کا ہے!

قلعۂ احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبار خاطر لکھنا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ غبار خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں، لیکن مولانا کے انداز طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر ایسا یہ محسوس ہوا جیسے مولانا نے یہ خطوط دراصل اپنے ہی نام لکھے ہوں۔ اس لیے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی! مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہو سکتے تھے کہ اس کو ایسے خطوط لکھتے۔ اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے!

یہاں پہنچ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے عزیز یا دوست سے دانستہ یا نادانستہ تمام عمر بے التفاتی برتی ہو، لیکن آخر میں تلافی مافات کا خیال آئے تو اس پر نوازشوں کی بارش کر دے۔ مولانا نے سیاست کے خارزار اور قومی زندگی کی بے آب وگیاہ وادی میں تمام عمر اپنے نفس کو ہر لذت سے محروم اور ہر محرومی سے دوچار رکھا لیکن آخر زمانے میں جب اس فروگذاشت کا خیال آیا تو اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ خطوط ایک طور پر نتیجہ ہو سکتے ہیں مولانا کے اپنے نفس سے بدلے ہوئے خوش گوار رویے کا!

دوسری بات جو مولانا کی انشاپردازی کے بارے میں ان خطوط سے منکشف ہوتی ہے، وہ ان کی طبیعت کا انبساط اور شگفتہ، شاداب اور صحت مند انشاپردازی پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے۔ غبار خاطر میں مولانا کی حسن طبیعت کا وہ اظہار ملتا ہے جو رقعات غالب میں غالب کا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غبار خاطر سے پہلے مولانا کی انشاپردازی پر ابتدا سے جو خطیبانہ اور ملہمانہ رنگ طاری تھا۔ اس کا فشار اگر بالکل دور نہیں تو بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

غبار خاطر وجود میں نہ آتا تو مولانا کی شخصیت اور انشا پردازی کا ایک بڑا دل آویز پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا!

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں مولانا کا جو اسلوب تحریر ملتا ہے وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا، اور اپنی خوبی اور خوب صورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن غبار خاطر کا اسلوب اردو میں نامعلوم مدت تک زندہ ہوگا۔ اکثر بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے، کاش اس اسلوب کے ساتھ مولانا کچھ دن اور جیے ہوتے پھر ہمارے ادب میں کیسے کیسے نسرین و نسترن اپنی بہار دکھاتے اور خود مولانا کے جذبہ و تخیل کی کیسی کیسی کلیاں شگفتہ ہوتیں!

ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان اکابر کو اسیری نصیب ہوتی تو بالعموم ان کا ذہن مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوتا۔ ان میں سے اکثر اپنے تاثرات بھی قلم بند کرتے۔ آزاد فضا کی حشر زائیوں کے بعد جیل کی ساکن، بے رنگ اور ویران زندگی کی معمولات کا سامنا ہو تو اسیروں کا افکار اور جذبات کی اپنی بنائی ہوئی بے کنار و بوقلموں دنیاؤں میں پناہ لینا فطری ہے، جو ان کو پہلے نصیب نہ ہوتی۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں، یہ صورت حال سب پر گزری ہے۔ کسی نے لڑکی کو خطوط لکھے، کسی نے بیوی کو، کسی نے اپنے آپ کو!

قیاس یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا رانچی میں نظر بند تھے۔ تفسیر کا کام جس کی ابتدا الہلال اور البلاغ کے صفحات سے ہو چکی تھی، بڑی تندہی سے شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں مولانا کی سرگرمیاں تمام تر سیاسی، مذہبی یا مذہبی سیاسی نوعیت کی تھیں۔ یعنی کبھی کشتی سیاسی ہوتی بادبان مذہبی ہوتے اور کبھی اس کے برعکس۔ جہاں تک خیال ہے، یہ تفسیر ناتمام رہی اور صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ رانچی سے احمد نگر تک کی مدت اتنی تھی کہ یہ کام مکمل ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور آخری اسیری کا زمانہ مولانا نے کتاب الٰہی کی تفسیر لکھنے کے بجائے 'کتابِ دل' کی تفسیر لکھنے میں صرف کیا! ایسا تو نہیں کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا لازمانی اور لامکانی کے بجائے 'زمینی و زمانی' ہو گئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ تبدیلی بڑی مبارک اور انقلابی تھی!

جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کر چکا ہوں، تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے وہ تنہا سہارا رہ گئے تھے۔ حکومت کے بڑے اہم منصب پر فائز رہ کر اور بے شمار نزاکتوں میں

گھرے ہونے کے باوجود مولانا نے یہ فرض جس خوبی سے انجام دیا وہ بیان سے باہر ہے۔
مولانا کے اٹھ جانے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ منصب ان پر ختم ہوگیا ہو!

یہاں پہنچ کر یہ بات بھی دل میں آتی ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو، آزادی اور تندہی سے
قوم کی خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ موثر طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔ کچھ اور نہیں
تو اس بنا پر کہ حکومت میں رجعت پسندی اور عامتہ الناس میں ترقی پسندی کی استعداد خلقی ہے۔
اوّل الذکر کی تقدیر سکونی ہے، موخر الذکر کی حرکی!

قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہوگئے تھے۔ اس سے باہر نکل
سکتے بھی تھے یا نہیں، ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی۔ کبھی
کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے کاش وہ حکومت کے محدود اور گلوافشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی
جمہوریہ کے دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا
حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی!

جی ایسا کیوں چاہتا ہے، شاید اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا
کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا، جس کے سپرد ہندستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی
ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جاسکے!

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

(مطبوعہ علی گڑھ میگزین، شمارہ۔2، 1959)

●●●

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس)

(1898-1958)

پطرس بخاری (احمد شاہ بخاری) 1898 میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ لاہور واپس آ کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر ہوئے۔ 1937 میں آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے۔ 1940 میں ترقی کر کے کنٹرولر جنرل ہوئے۔ 1951 میں پاکستان کی طرف سے اقوام متحدہ میں مستقل نمائندے مقرر ہوئے۔ 1955 میں آپ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا۔ 5 / دسمبر 1958 کو نیویارک میں آپ کا انتقال ہوا۔

پطرس بخاری کا صف اوّل کے مزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف 'مضامین پطرس' طنز و مزاح کا بہترین شاہکار ہے۔

o

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) دفعتاً ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔

اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعروادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے ہم بہ اتفاق آرا کس کو اپنا نمائندہ انتخاب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو، بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات کس وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے لیکن کتنا اونچا مقام پایا!

تاریخ اور تفصیل میں کون پڑے اتنا البتہ یاد ہے کہ سب سے پہلے 'راوی' میں پطرس کا مضمون 'کتے' پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے لکھنے والے نے اس مضمون سے جو درجہ حاصل کر لیا وہ بہتوں کو تمام عمر نصیب نہ ہوگا۔ ظرافت نگاری میں پطرس کا ہمسر ان کے ہم عصروں میں کوئی نہیں۔ طنز وظرافت آسانی سے ہاتھ آ جانے والے لیکن پر پیچ اور خطرناک آلے ہیں۔ ہنسی، دل لگی یا طعن تشنیع کسے نہیں آتی۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کب ہنسنا چاہیے کس پر ہنسنا چاہیے کتنا ہنسنا چاہیے، اور سب سے مشکل یہ کہ کیسے ہنسنا چاہیے۔ انسان ہنسنے والا جانور کہا جاتا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح ہنستے ہیں ممکن ہے اسی سبب سے بقیہ جانوروں نے ہنسنا چھوڑ دیا ہو، بخاری ان رموز سے واقف تھے۔

جو بات ظرافت کے بارے میں کہی گئی ہے وہی طنز پر بھی صادق آتی ہے۔ دونوں کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ سہل الحصول ہونے کے سبب سے ہم ان ذمہ داریوں کا خیال نہیں کرتے جو ان کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں، اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سستی طنز و ظرافت بہت مہنگی پڑتی ہے یعنی احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو طنز و ظرافت سے کام لینے والا خود طنز و ظرافت کا شکار ہو جاتا ہے، ہم میں سے اکثر اس کا شکار ہیں۔ صرف محسوس نہیں کرتے۔

طنز کی محرک برہمی یا بے زاری ہوتی ہے۔ ظرافت کی تفریح و تفنن ان کا رشتہ نفس واقعہ سے بھی ہے اور فن کار کے ردِّ عمل سے بھی۔ ایک ہی واقعہ ایک شخص کو ایک طرح سے متاثر کرتا ہے، اور دوسرے کو دوسری طرح۔ ایک اس سے برہمی یا بے زاری کا اظہار کرے گا دوسرا اس کے مضحک یا تفریحی پہلو کو ابھارے گا۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ جس فن کار کا جیسا ردِّ عمل ہوا ہے اس کا اظہار اس نے کس طرح کیا ہے۔ یعنی فن کار کی شخصیت کس پایہ کی ہے اور فن پر اس کی گرفت کیسی ہے۔ نادانستہ طور پر بحث اس منزل پر آ گئی جہاں شخصیت اور فن کے رشتے سے بحث کرنا ضروری ہو جاتا ہے، لیکن یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فن کو شخصیت سے توانائی اور توثیق ملتی ہے اور فن کی غلامی شخصیت کی نامحکمی کی دلیل ہے۔ فن ٹکنیکل اور مکینکل ہوتا ہے اور شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

آج کل طنز و ظرافت میں جس چیز کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے، وہ شخصیت ہے۔ سبب یہ ہے ہمارے بیش تر لکھنے والے بندھے ٹکے موضوعات کے اسیر ہو گئے ہیں۔ جن پر طنز و ظرافت کا عمل کوشش کیے بغیر بھی کارگر ہو سکتا ہے۔ مثلاً بیوی، نیتا، مولوی، والدین، قرض، مہنگائی، چور بازاری، نفع خوری، اقربا پروری، لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی وغیرہ۔ ان سب پر طبع آزمائی کی تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے جیسے کسی تھکے ہارے شاعر کو اس سے زیادہ تھکے ہارے شعر پر اسی طرح کے حاضرین داد دیتے ہوں۔ مضحک کو مضحک دکھانے بتانے کا کوئی نتیجہ نہیں، یہ سستا اور فضول کاروبار ہے۔ شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے یعنی طنز و ظرافت کے پہلو وہاں دیکھ لے جہاں کسی دوسرے کا ذہن آسانی سے نہ پہنچ سکتا ہو۔ طنز و ظرافت کے یہی نمونے فن کار کی شخصیت کی کشید ہوتے ہیں اور اچھے ادب اور اچھے ذہنوں میں جگہ پاتے ہیں۔

بخاری کی ظرافت بندھے ٹکے تفریحی موضوعات، روایتی کرداروں اور لفظی ہیر پھیر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہر جگہ ہر بات میں انھوں نے خوش طبعی اور زندہ دلی کا پہلو نکالا ہے۔ جیسے 'صحرا کو مسکرا کے گلستاں بنا دیا' ہو۔ بخاری کی ظرافت عام طور سے مفرد ہوتی ہے، مرکب نہیں۔ بعض اطبا بڑے سے بڑے امراض کا بھی علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں۔ بعض دوسرے معمولی امراض کے لیے بھی مرکب دوائیں مثلاً معجون، گولیاں، کشتہ جات تجویز کرتے ہیں۔ علاج دونوں مستند ہیں، لیکن اوّل الذکر زیادہ مشکل اس لیے زیادہ قابل تعریف ہے۔ بخاری ظرافت کو ظرافت ہی کے سہارے قائم رکھتے ہیں، اور اس سے ہر مقصد حاصل اور ہر مشکل حل کر لیتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی تعبیر آتش کے اس شعر سے کی جا سکتی ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ہنس ہنس کے مار ڈالنے کا گر، بخاری کو خوب آتا تھا۔ ظرافت اور ظرافت نگاری کی یہ معراج ہے۔

بخاری کی ظرافت نگاری کی مثال داغؔ کی غزلوں اور مرزا شوق کی مثنویوں سے دے سکتے ہیں۔ جس طرح ان بے نظیر فن کاروں نے ماجرائے حسن و عشق کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی رکھا ہے۔ مزرع آخرت بنانے کی کوشش نہیں کی، اسی طرح بخاری نے ظرافت کو زمینی و زمانی ہی رکھا، ماورائی و لامکانی بنانے کی فکر میں نہیں پڑے۔ مزے کی باتیں مزے سے کہتے ہیں، اور جلد کہہ دیتے ہیں۔ انتظار کرنے اور سوچ میں پڑنے کی زحمت میں کسی کو مبتلا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پڑھنے والوں کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ ترشے ہوئے فقروں اور ڈرامائی انداز سے عامی اور عالم دونوں کو مسرور کرنے اور مسخر رکھنے کا سلیقہ جتنا بخاری کو تھا کسی اور کے ہاں کم نظر آتا ہے۔

بعض مشاہیر کو کبھی کبھی اس شوق میں بھی مبتلا دیکھا گیا ہے کہ وہ بدیہہ گو، بذلہ سنج اور داستان طراز بھی سمجھے جائیں۔ اس کی آسان ترکیب یہ نکالی ہے کہ بے شمار لطیفے ازبر کر لیے جائیں جن کو موقع بے موقع، کبھی ایسے بھونڈے طریقے سے جیسے بعض شعرا اپنا کلام سنانے کے لیے

کسی شریف آدمی کو دفعتاً گھیر لیتے ہیں، سناتے رہیں گے۔ وہ یہ نہیں جانتے ظرافت کا مدار ذوق پر ہے حافظے پر نہیں۔

بخاری فقروں اور لطیفوں کی تجارت نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر طرح کی متاع ہر جگہ پیدا کر لیا کرتے تھے۔ تجارت کے لیے نہیں تواضع کے لیے وہ اپنی تحریر و تقریر میں لطیفوں کو چٹکلوں کے پیوند نہیں لگاتے تھے۔ بلکہ طباعی اور زندہ دلی ان کی رگ و پے میں ساری تھی، اور طرح طرح سے جلوے دکھاتی تھی۔ وہ لطیفہ خواں نہ تھے، لطیفہ طراز تھے۔ ممکن ہے بخاری سے کبھی کسی کو تکلیف بھی پہنچی ہو لیکن اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ایک ہی لطیفہ دوسری بار یا کئی بار سننے کی کوفت شاید ہی کسی شخص کو ہوئی ہو۔

غالباً 1945 میں پی۔ای۔این کا سالانہ اجلاس جے پور میں منعقد ہوا تھا۔ ای۔ایم۔ فاسٹر، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، صوفیا داد یا مرزا اسمٰعیل، ملک راج آنند، بخاری اور کتنے اور مشاہیر علم و ادب ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے شریک جلسہ تھے۔ موسم خوش گوار جے پور کا تاریخی خوب صورت اور ستھرا شہر، ریاست کی روایتی مہمان نوازی، مرزا اسماعیل کا انتظام جو اس زمانے میں ریاست کے وزیر اعظم تھے۔ پی۔ای۔این کا ایسا شان دار اجلاس ہندوستان میں شاید ہی اس سے پہلے یا اس کے بعد منعقد ہوا ہو۔ تین دن تک کیسی کیسی عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ بلند پایہ مقالے پڑھے گئے علمی مذاکرے رہے، بے تکلف ملاقاتیں اور پُر تکلف دعوتیں ہوئیں۔

بخاری کی علمی شہرت، بے اختیار متوجہ کرنے والی شخصیت، حسین و ذہین خدوخال، سجل اور ستھرا لباس، بے تصنع خرام و قیام، ہر شخص سے اس کے مناسب حال گفتگو، مزے کی بھی پتے کی بھی، ہر شخص کی نگاہیں پڑتی تھیں، لیکن ان کا اپنا انداز یہ تھا کہ مشاہیر کے حلقوں میں یوں ہی کبھی گھومتے پھرتے نظر آ جاتے جیسے ان پر کرم کرنے نکل آئے ہوں۔ ورنہ بیش تر عام لوگوں اور اپنے ساتھیوں کے حلقے میں مگن رہتے تھے۔ بخاری ایسے یوسف تھے جو کبھی بے کارواں نہیں رہے۔ مقالہ پڑھا تو دھوم مچ گئی، اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کے ایک بنیادی مسئلہ کو پہلی بار نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ بحث تفصیل سے یاد نہیں، انھوں نے

کہا کہ ہندستانی ادیب مادری زبان اور انگریزی کے درمیان معلّق ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ 'دولسانی' کش مکش ان کے فکر و نظر کو فطری رنگ میں جلوہ گر ہونے نہیں دیتی۔ وہ اپنی زبان کی پرداخت اور اس کے حسن کے صحیح احساس سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف انگریزی ادب کے اصلی خدوخال اور مزاج کو اپنانے کے لیے جس ریاضت و بصیرت کی ضرورت ہے اس کے نہ خوگر ہیں نہ اس سے پورے طور پر آشنا، نتیجہ ظاہر ہے وہ کلاسیکی ادب کی اساسی قدروں کا صحیح عرفان نہیں رکھتے۔ اس لیے جدید ادب کے افکار کو پرکھنے کی صلاحیت سے بے گانہ ہیں۔ ان کا پورا زور ماضی کو سمجھے بغیر اس سے رشتہ توڑنے اور بغیر پرکھے جدید سے رشتہ جوڑنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بخاری کے ان خیالات کو کانفرنس میں بڑی اہمیت دی گئی، اور سب کو اس کا احساس ہوا کہ کتنے اہم موضوع پر، کتنی فکر انگیز بات، کس وضاحت سے کتنے بڑے مبصر نے کہی۔

آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ دہلی میں قائم ہوا تو اس کے عملے کا تقرر ایک بورڈ نے کیا جس میں مسٹر فیلڈن، ڈائرکٹر جنرل بخاری، ڈاکٹر کریم حیدر لودی اور کچھ اور لوگ تھے۔ جن میں ایک میں بھی تھا۔ صدر فیلڈن تھے، اس بورڈ کی سفارش پر ذوالفقار بخاری، آغا اشرف، مجاز مرحوم اور بعض دوسرے لوگوں کا مختلف آسامیوں پر تقرر ہوا تھا۔ فیلڈن بڑے ذی استعداد جری اور آزاد خیال تھے۔ ریڈیو کا کاروبار سنبھالنے ولایت سے نئے نئے آئے تھے۔ حکومت ہند کے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں تک کی پروانہ کرتے تھے۔ لیکن بخاری کا کلمہ پڑھتے تھے، اور ان کے اشاروں تک کا احترام کرتے تھے۔

جیسا کہ قاعدہ ہے امیدواروں سے ہر ممبر اپنے اپنے مضامین کے بارے میں تھوڑی بہت گفتگو کر کے رائے قائم کرتا۔ ڈاکٹر کریم حیدر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے آئے تھے ان کے سوالات کبھی کبھی مبہم ہوتے اور مشکل بھی۔ اس پر ان کا بھاری بھر کم جثہ، ایسی ہی آواز، کڑے تیور، امیدوار پر ہیبت سی طاری ہو جاتی۔ تھوڑی بہت ان امیدواروں پر بھی جو بعض امیدواروں کی موافقت پر مائل ہوتے۔

ڈاکٹر حیدر کے بعد میری نشست تھی۔ لنچ کے بعد بورڈ کے ممبر اکٹھا ہوئے تو انٹرویو کا کام شروع کرنے سے پہلے فیلڈن نے ان امیدواروں پر تبادلۂ خیال کیا جو بورڈ کے سامنے

آ چکے تھے۔ گفتگو ختم ہونے پر آئی تو فیلڈن نے ڈاکٹر حیدر کو مخاطب کر کے کہا۔ ڈاکٹر حیدر دیکھو اگر تم نے آئندہ امیدواروں کو ڈرانے دھمکانے کا ارادہ کیا تو میں بے تامل تم کو گولی مار دوں گا۔

ڈاکٹر حیدر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر پیچھے کی طرف لیٹ سے گئے پھر مصافحہ کے لیے فیلڈن کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر حیدر کے داد دینے کا یہی انداز تھا۔ اتنے میں بخاری نے آواز دی۔ صدیقی صاحب ادھر آ بیٹھو۔ فیلڈن کے نشانے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اب فیلڈن کا وہی حال تھا جو پروفیسر حیدر کا تھا۔

بڑے سے بڑے ذہنوں سے ٹکر لینے اور محفل پر چھا جانے میں بخاری کا جواب نہ تھا۔ خواہ وہ محفل علم و دانش کے اکابر کی ہو، خواہ بے تکلف احباب اور بے فکروں کی، خواہ سیاسی شاطروں کی، بات کوئی ہو، موقع کیسا ہی ہو، بخاری نہ مشتعل ہوتے تھے، نہ مایوس، نہ متفکر، توازن اور تفنن کی فضا برابر قائم رکھتے تھے۔ کبھی برجستہ فقروں سے، کبھی اپنے مخصوص قہقہوں سے، لیکن اس دوران میں مقصد کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوتے اور جہاں تہاں ایسے نکتے پیدا کرتے رہتے کہ حریف کو قائل ہونا پڑتا کہ بخاری سے مفر نہیں۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو بخاری اپنی بات بہت کچھ منوا لیتے تھے۔ کبھی ایک زیرک وکیل کی طرح، کبھی ایک کارآزمودہ جنرل کی مانند، حریفوں کو پسپا ہوتے ہی دیکھا، اکثر لاجواب ہو کر، کہیں ہنسی خوشی اور کہیں بے سوچے سمجھے بھی۔

یہ سماں ایک بار آل انڈیا ریڈیو دہلی میں دیکھا جب بخاری اس کے ڈائرکٹر جنرل اور.... مسٹر انچارج تھے جن کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ بخاری کے عاشق زار نہ تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت بڑھ گیا تھا، آئے دن وزارت سے عتاب نامے اور ملک کے گوشے گوشے سے طرح طرح کے وفد نازل ہوتے رہتے۔ بخاری کو ان دونوں سے نپٹنا پڑتا مگر وہ مطلق فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ وزارت کے عتاب ناموں کو تو 'نامۂ الفت' کہا کرتے تھے، اور وفود کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ان کی نفسیات وہی تھی جس کا ذکر غالبؔ نے اپنے اس مصرعے میں کیا ہے۔

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایسے وفود کا خیر مقدم وہ اس طرح کرتے جیسے اپنے بے تکلف دوستوں یا عزیز طالب علموں کو چائے پر مدعو کیا ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک وفد باریاب ہوا، بخاری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ موقع کی اہمیت کا احساس کرتے اور دلاتے ہوئے ایک مختصر لیکن لاجواب انگریزی تقریر میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اور تقریر کو ختم کیا۔ چند خوش نما، توصیفی فقروں پر جس کے مخاطب وہ بگڑے دل لیکن غبی اراکین تھے۔ جن کو متعارف ہوتے وقت انھوں نے اپنی بے خطا ذہانت سے بھانپ لیا تھا۔ بخاری کی شیوا بیانی سے وفد ڈانواڈول ہو گیا اور ممبروں کے وہ کڑے اور کڑوے تیور مضمحل ہو گئے۔ جن کے ساتھ وہ 'غالب کے پرزے' اُڑانے آئے تھے، جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ اس کو ان سورماؤں نے پورا کر دیا جن پر بخاری کا جادو پہلے سے چل چکا تھا، اور مباحثے کے دوران میں بخاری کی ناقابلِ بیان و ناقابلِ گرفت شہ پا کر جس کے وہ امامِ وقت تھے اپنے ساتھیوں ہی سے بدلنے اور ردّ وقدح کرنے لگے تھے۔

یہاں پہنچ کر بخاری نے پینترا بدل دیا اور ہمہ تن ان ممبروں کی تکریم و تواضع پر مائل ہو گئے، جو یقیناً قابلِ لحاظ تھے۔ لیکن اب تک ان کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ان سے ملنے اور بات کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ بڑے عالمانہ اور ماہرانہ سطح سے گفتگو شروع کی، اردو ہندی کے مسئلے پر جتنی کتابی، اخباری، دفتری معلومات اور طرح طرح کے شمار و اعداد اور ان سے اخذ کیے ہوئے نتائج بخاری کے حافظے میں اور زبان پر تھے، ان کے نصف مواد تک بھی وفد کے ممبروں کی رسائی نہ تھی۔ پھر ان کا سریع الانتقال کرشمہ کار اور ناقابلِ تسخیر ذہن اور بات منوانے کے طرح طرح کے انداز بخاری کو کوئی نیچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ میٹنگ میں ہر طرح کے 'کیل کانٹے سے لیس' ہو کر آنے میں بخاری کے ہمسر کچھ ہی لوگ دیکھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اراکین بھی زیرِ دام آ گئے اور بخاری نے 'علی قدر مراتب' کسی سے ہاتھ ملا کر، کسی کو گلے لگا کر، کسی کی شان میں دو چار نہایت مبالغہ آمیز فقرے کہہ کر جو اتنے ہی مغالطہ انگیز بھی ہوتے وفد کو ہنسی خوشی رخصت کر دیا۔ علی قدر مراتب کا ان کا اصول اور دوسرے کا المیہ یہ تھا کہ جس کو جتنا تہی مغز سمجھتے اتنا ہی زیادہ اس سے 'سرگرم التفات' ہوتے۔ اس سے حساب لگایا جا سکتا ہے کہ جس سے انھوں نے معانقہ کیا ہوگا، اس کا ان کے ہاں کیا درجہ رہا ہوگا۔

اس حربے سے بخاری ہی کام لے سکتے تھے۔ ان سے ذرا بھی کم درجے کا آدمی اس حربے کا خود شکار ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بخاری کے ترکش میں جتنے اور جس جس طرح کے تیر تھے موقع آجانے پر انتخاب جس تیزی اور تیقن سے کرتے اور جس مشاقی سے چلاتے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسے تیر ہر ترکش میں نہیں ہوتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ڈائرکٹر جنرل شپ کے زمانے میں ایک ہندستانی ڈکشنری کی تالیف میں مصروف ہو گئے تھے۔ جس میں ملک کے بعض مخلص اور مستند اہلِ قلم ان کے شریک کار تھے۔ یہ کام ان ہی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ اس میں ان انگریزی الفاظ واصطلاحات کے ہندستانی مترادفات دیے گئے تھے جو ریڈیو اور اخبارات وغیرہ میں رائج تھے۔ یہ کام اس زمانے میں جتنا ضروری تھا، اتنا ہی نازک اور مشکل تھا۔ اس لیے 'ہندستانی' کا لفظ یا تصور (جسے ہندی اردو کا سنگم کہتے تھے) اردو اور ہندی دونوں کے علَم برداروں کے یہاں نامقبول تھا۔ ڈکشنری کی کئی ضخیم جلدیں تھیں جو ٹائپ میں چھاپ لی گئی تھیں اور نظرِ ثانی کے لیے مختلف اصحاب کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ تمام مترادفات اس ترتیب اور وضاحت سے علاحدہ علاحدہ خانوں میں دی گئی تھیں کہ تلاش کرنے والے کو انتخاب میں دقّت کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد معلوم نہیں اس لغت کا کیا حشر ہوا۔ مکمل ہو جاتی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے محکمۂ نشر واشاعت کے لیے بہت کار آمد اور بھلے مانسوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بہت مفید ہوتی۔

انگریزی شعر وادب پر ان کو جتنا غیر معمولی عبور تھا، ہم سب جانتے ہیں، لیکن ان کے ذوق وذہانت کا پورا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کے اردو مضامین میں انگریزی کی وہ جاندار، گوارا، ٹھہری ہوئی اور خوش آئند فضا محسوس کرتے ہیں، جو کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے توسل سے انگریزی کی جھلک اردو میں دیکھ کر ان کی اردو شناسی اور انگریزی دانی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں خود اس کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں کہ غیر زبان کا اردو میں ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ غیر زبان کی صفتوں کا پتہ نہ لگے۔

انگریزی موضوعات، مفاہیم اور اسالیب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اوروں نے بھی کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ دوسرے ایسا کرنے میں اکثر ترجمے، تفسیر

یا مفہوم ادا کر دینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی اَدھ کچرے طور سے یا انگریزی کے مطالب کو اردو کے روایتی شاعرانہ الفاظ یا انداز میں اس درجہ شرابور کر کے پیش کریں گے کہ نہ انگریزی ذہن کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا، نہ انگریزی زبان کا، نہ انگریزی اسالیب کا اور نہ انگریزی فضا کا۔ بخاری کی اردو کو میں ٹکسالی نہیں کہتا، لیکن انگریزی کے پرتو سے ان کی اردو اس طرح جگمگاتی ہے جیسے ۔

پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

الہامی اور قانونی کتابوں کا ترجمہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد میرے نزدیک یورپین زبانوں کے ڈراموں کا ترجمہ مشکل ہے۔ جہاں فن، بیان و زبان اور نفسیاتی کیفیات کی بڑی نازک اور ناقابلِ گرفت وارداتوں کا سامنا ہوتا ہے، جس طرح سیسمو گراف (زلزلہ پیما) زمین کے چھوٹے بڑے ارتعاش مرتسم کر لیتا ہے، اسی طرح اچھا ڈراما سوسائٹی اور زندگی کے ارتعاشات کی نشان دہی کرتا ہے۔ بخاری نے انگریزی کے بعض مشہور ڈراموں کا جس خوبی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی زبان اور انگریزی سوسائٹی کے مزاج اور ڈرامے کی فنی نزاکتوں سے پورے طور پر واقف ہونے کے علاوہ اردو کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کرانے کی کتنی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اردو کا کوئی معمولی واقف کار اس غیر معمولی فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کی ظرافت نگاری اور انگریزی ڈراموں کے تراجم دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بخاری نے اردو کی ایک نئی جینیس اور ایک نئی توانائی کا انکشاف کیا ہو۔

جہاں تک مجھے علم ہے بخاری نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں، لیکن اردو کے ادبی تنقید نگاروں میں ان کا پایہ مسلم ہے اور یہ اس حقیقت کا مزید ثبوت ہے کہ بخاری نے بہت کم ادبی سرمایہ چھوڑا ہے، لیکن بہتوں سے اونچا مقام پایا ہے۔ گذشتہ 25-20 سال میں اردو تنقید پر کافی توجہ کی گئی، اور اب تو ادبی مذاکروں یا مجادلوں میں اس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ غزل کے بعد تنقید کے فن شریف پر ہمارے قبیلۂ شعر و ادب نے سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے جیسے تنقید نگار تنقید کے مقاصد کو نظر انداز کر کے اپنے مقاصد پیشِ نظر رکھتے ہوں اور تنقید نہیں تبلیغ کرتے ہوں۔

اردو میں جدید تنقید کا بیش تر سرمایہ مغربی ہے لیکن اسے جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اس میں مغربی تنقید کی اتنی توضیح نہیں ملتی جتنا اس کا ترجمہ۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں کو یہ بھی معلوم کرنے کی فکر نہیں ہوتی کہ مغربی تنقید کے کس اصول سے اردو کے کس صنف ادب کو پرکھیں۔ نیز مغرب میں جن اصناف ادب پر تنقید ملتی ہے ادب کی وہ صنفیں اردو میں ہیں بھی یا نہیں، یا اردو میں جو صنف ادب ملتی ہے اس کے لیے مغرب نے کوئی اصول تنقید وضع بھی کیا ہے یا نہیں۔ ادب کہیں کا ہو کسی طرح کا ہو، تنقید مغربی ہوگی۔ کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو۔

یہ بحث فرسودہ بھی ہے، تلخ بھی، شاید بے نتیجہ بھی۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بخاری اس حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی تنقید وسیع ترین مفہوم میں خالص ادبی ہوتی تھی۔ انھوں نے جس مسئلہ پر یا شخص پر لکھا ہے اس کو اپنے نقطۂ نظر کا تابع نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرکے وہ نقطۂ نظر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مسئلے یا شخص میں خوابیدہ یا بیدار موجود ہے۔ ادبی پارکھ کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کسی ادبی تخلیق یا شخصیت پر قلم اٹھائے تو اس کا احاطہ اس طور پر کرے کہ جز و اور کل دونوں گرفت میں آجائیں۔ نہ یہ کہ جز و سے کل کی نشان دہی کرے اور کبھی کل سے جز و کو روشناس کرائے۔ تصوف میں یہ روا ہے، تنقید میں نہیں۔ ایسی تنقید پارکھ کے لیے ادب کی وسیع معلومات اور تنقید کے فنی اصول سے گہری واقفیت کے علاوہ ایک بڑی شرط یہ ہے کہ تنقید نگار کی نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی ہو۔

بخاری کی تنقید کا بڑا اچھا نمونہ ان کا مضمون 'کچھ عصمت چغتائی[1] کے بارے میں' ہے۔ عصمت چغتائی کی تحریریں منظر عام پر آئیں تو ادبی اور غیر ادبی دونوں حلقوں میں ایک 'شور طوفان خیز' اُٹھا اور ان تحریروں کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں سخت اختلاف آرا ہوا۔ یہ اختلاف شدت پر تھا کہ بخاری کا یہ مضمون شائع ہوا۔ بخاری نے ایسا بے لاگ تجزیہ اتنی گہری بصیرت کے ساتھ، اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ موافق اور مخالف دونوں مدھم پڑ گئے۔ البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود عصمت چغتائی کے نقطۂ نظر پر اس کا کیا اثر پڑا۔

1۔ عصمت چغتائی (1991-1910)

بخاری کا مزاج مغربی نہ تھا، ذہن تھا۔ ان میں اور ان کے بیش تر ساتھیوں میں اردو شعروادب کا ذوق، مشرقی تہذیب کا رکھ رکھاؤ اور طبائع کو اختلاف کے باوجود اپنی قدروں کی بڑی پاسداری ملتی ہے۔ جب تک پطرس لاہور میں انگریزی کے پروفیسر رہے، ان کا اور ان کے رفقا کا اردو شعروادب کی سمت ورفتار پر برابر اچھا اثر پڑتا رہا۔ اس زمانے میں 'نیاز مندانِ لاہور' کی آواز ایسی نہ تھی جس کو نظر انداز کرنا آسان ہوتا۔ نیاز مندوں کے جامے میں بخاری کا انداز قدرے بے تکلف پہچانا جا سکتا تھا۔ اپنی بیش بہا غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بخاری لاہور کے تعلیم یافتہ، ذہین، ہونہار نوجوان طبقے کے سرخیل تھے۔ اعلیٰ پائے کی ذہانتوں کا اتنا اچھا اور بڑا اجتماع اس زمانے میں شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔ بخاری نہ ہوتے تو شاید ایسی مختلف النوع، بے مثل ذہانتوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی یہ بات بھی ذہن میں آئی ہے کہ اگر بخاری ان رفیقوں کے ساتھ لاہور میں اسی طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہوتے جیسے سرسید اور ان کے رفقا علی گڑھ میں، تو اردو کی نئی فتوحات کا کیا عالم ہوتا۔

یہ خیال اس لیے ذہن میں آیا کہ تقسیم ملک کے بعد بخاری انگریزی کی پروفیسری پر لاہور واپس آ گئے تو اردو کو نئے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور قومی عزائم کے مطابق اس کی تنظیم وترقی کا ایک منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بخاری خود ڈاکٹر تاثیر اور خواجہ منظور حسین اور بعض دوسرے رفقا یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کتنی حوصلہ انگیز، دوررس اور گراں قدر یہ اسکیم تھی، جو بروئے کار آ جاتی تو کیا عجب آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی مرحوم کا نعم البدل ثابت ہوتی، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ بخاری کا دامن سیاسی کاموں نے بیرون ملک کھینچا اور ساتھیوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جو اس منصوبے کی مشکلات اور نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ دکھاتا اور ساتھی نوجوانوں کی قیادت کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ جہاں ذہنی صلاحیتوں کے اس کثرت سے اکابر موجود ہوں، علمی، قومی، تہذیبی کارناموں کی روایات کی فراوانی ہو اور قوم وملک کی نئی تشکیل وتنظیم کے لیے دعوت کار اور کارزار بھی کچھ کم نہ ہو، وہاں یہ بے عملی وبے حوصلگی کیسی۔ اس اجتماع کے افراد نے اپنے اپنے

طور پر جا ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کیا ہو، اس سے انکار نہیں، لیکن ایسی اور اتنی غیر معمولی قابلیتوں کا کوئی عہد آفریں کارنامہ سامنے نہ آیا۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک ایسا نہیں تو مسئلہ فکر یہ ضرور رہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر اہل فضل و کمال کا جیسا نادر روزگار اجتماع دہلی میں ہو گیا تھا، اس کی مثال مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان میں کہیں اور کم نظر آئے گی۔ جس کے بارے میں حالی نے کہا تھا:

تھے ہنر منداتنے تجھ میں جتنے گردوں پر نجوم

غدر میں یہ ستارے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ان میں سے سرسید نے اپنے رفقا کرام کے ساتھ علی گڑھ میں ایک جدید شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی اور علی گڑھ تحریک کے نام سے مسلمانوں کی حیات نو کی طرح ڈالی۔

اس کے بعد اور پہلی جنگ عظیم کے آس پاس کے زمانے میں علوم وفنون کے کتنے اور کیسے کیسے جامع کمالات، ہونہار نوجوان لاہور میں نظر آتے ہیں۔ جن میں 'جوانانِ سعادت مند' کے 'پیر دانا' سر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر سر اقبال سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر بعض وجوہ کی بنا پر موخر الذکر دو کو علاحدہ کر دیں تو سر شیخ عبدالقادر یقیناً ان لوگوں میں تھے جو پنجاب کے سرسید ہو سکتے تھے۔ جہاں تک ان کی بزرگی، شفقت اور سرپرستی کا تعلق ہے انھوں نے لاہور کے ہونہار نوجوانوں کے لیے کم سے کم اتنا ضرور کیا جو وہاں کے کسی اور سے نہ ہو سکا۔

شیخ صاحب کے بعد سب سے زیادہ اس کی توقع بخاری سے تھی۔ وہی ان مرکز گریز اعلیٰ صلاحیتوں کو اپنے گرد جمع رکھ سکتے تھے۔ ایک حد تک انھوں نے رکھا بھی، لیکن یہ شخصی تعلقات کی بنا پر تھا۔ کسی عظیم مقصد یا منظم مقصد یا منظم اسکیم کے ماتحت جیسی کہ مثلاً علی گڑھ تحریک تھی، نہ تھا اور جس کے بغیر دور رس اور دیرپا نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج بخاری کی یاد میں یہ بات ذہن میں آئی لیکن بے وقت نہیں آئی۔ اب بھی اس کا امکان ہے کہ لاہور کے بچے کھچے احباب ہونہار نوجوان کو اپنے سایۂ شفقت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک نئے صحت مند، علمی، ادبی اور تہذیبی محاذ کی پاکستان کو بڑی ضرورت ہے۔

ہر سوسائٹی میں نوجوان بڑا غیر متعین، بڑا خطرناک لیکن اتنا ہی قیمتی عنصر ہوتا ہے۔ پاکستان کے نوجوانوں کو مناسب اور بروقت رہبری نہ ملی تو یہ زیادہ دنوں تک بے کار نہیں رہ سکتا۔

کسی اور سے ناتہ جوڑے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ نوجوانوں کا فلاں یا فلاں مذہب ہے۔ دراصل وہ اپنے شباب کی وارداتوں (حوصلہ اور ہوس) کا شکار ہوتا ہے۔ مذہب تو اس کو صحیح اور صالح راستے پر لگانے والے ہوتے ہیں۔

اسی حلقے ('نیازمندان لاہور' یا 'ناموران لاہور') سے اس زمانے میں ایک بحث یہ اٹھائی گئی کہ پنجاب میں جو 'یہ میں نے جانا ہے'۔ یا اس طرح کے اور فقرے بولے جاتے ہیں ان کو غلط کیوں قرار دیا جائے۔ پنجاب کے لوگ اردو سے کچھ کم واقف نہیں ہیں۔ اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ نثر اور نظم کی محفل میں ان کا درجہ کسی سے کم تر نہیں رہا۔ اردو کا مستقبل بھی پنجاب ہی میں زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ فارسی عربی کے علاوہ مغرب کی زبانوں اور خزانوں سے بھی انھوں نے دوسروں کی طرح استفادہ کیا ہے وغیرہ، اس لیے ان کی زبان پر یہ فقرہ جس شکل میں آتا ہے اس کو صحیح کیوں نہ مانا جائے۔

کچھ دنوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا، لیکن جلد ہی ختم ہو گیا اور بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ اس موضوع پر ان سے اکثر گفتگو آئی۔ اتنی علمی و ادبی نہیں جتنی تفریحی یوپی کی زبان، اشخاص یا شاعروں پر بخاری کو طبع آزمائی کا شوق ہوتا تو بے تکلف روئے سخن میری طرف کر دیتے۔ ایک بار بڑے مزے سے اور بہت زور دے کر کہنے لگے، پنجاب اس طرح کے فقرے اسی طرح بولے گا۔ آپ کے ....(نام حذف کرتا ہوں) جو چاہیں کر لیں۔ یہ جملہ غلط کیوں ہو؟ میں نے کہا، ہاں کیوں ہو۔ کچھ مسکرائے، کچھ نرم پڑے، لیکن انداز کی برہمی قائم رکھتے ہوئے بولے۔ بتایئے نا آپ تو صرف و نحو میں خاصے مبتلا رہتے ہوں گے۔ اس میں قباحت کیا ہے؟ میں نے کہا۔ میں صرف و نحو سے قطعاً معصوم ہوں۔ آپ بھی ہوں تو ایسا کوئی سانحہ نہ ہوگا۔ لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو، میں تو چاہوں گا کہ یہ فقرے اسی طرح بولے جائیں۔ اس میں ہزار عیب ہوں ایک خوبی بے مثل ہے۔ بولے، 'یعنی چہ؟' 'عرض کیا۔'' اس سے آدمی پہچان لیا جاتا ہے۔'' بے اختیار قہقہہ لگا کر کھڑے ہو گئے، بولے۔ صدیقی صاحب! میرے ساتھ چلئے، میں اس فقرے پر آپ کے اعزاز میں کھڑے کھڑے، پنجاب میں فرسٹ کلاس بلوا کرا سکتا ہوں۔

بخاری خطوط بڑے اچھے لکھتے تھے۔ ان کے کتنے اور کیسے دل آویز خط و خال ان خطوط میں جلوہ گر ملتے ہیں۔ اچھے خطوط وہی لکھ سکتا ہے جس کو مکتوب الیہ سے اخلاص اور اپنے پر اعتماد ہو، محبت کی سب سے معتبر علامت یہ ہے کہ عاشق اپنے راز محبوب پر ظاہر کرنے لگے۔ اچھے خطوط لکھنے کے لیے یہ رشتہ اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اصول ضروری ہے۔ خط لکھنے کا وہ فن ہے جہاں تکلف یا تصنع لکھنے والے کو لے ڈوبتا ہے۔ *Safely First* یا *Self First* کے بندے کبھی اچھے خط لکھنے والے نہیں ہو سکتے۔ آمیز شئے کجا گہر پاک او کجا کا اطلاق خط نگاری کے فن پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ یا کہیں اور سے دوستوں کے نام جو خطوط انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اردو کے رسالوں میں شائع ہوئے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کتنی وسیع اور جامع، مشاہدہ کتنا تیز، ذہن کتنا زرخیز، تاثرات کتنے گہرے، تخیل کتنا نادرہ کار اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی تھی۔ وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دل کش معلوم ہونے لگتے تھے۔ یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔

بخاری کو اچھے سوٹ پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک زمانے میں جب آل انڈیا ریڈیو کا پہلا دفتر علی پور روڈ پر تھا، اور وہ اسٹیشن ڈائرکٹر یا اس سے اونچے کسی منصب پر تھے ان کا درزی کشمیری دروازے کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ دکان اور مرجوعہ دیکھتے ہوئے کچھ ایسا ماہر فن نہیں معلوم ہوتا تھا، لیکن بخاری اس پر فریفتہ تھے۔ اس کے پاس کبھی تقاضے کے لیے، کبھی سوٹ میں ترمیم و اصلاح کی غرض سے، اس پابندی اور شغف سے آتے تھے، جیسے بعض مصنفین اپنی کتاب کا مسودہ دیکھنے بھالنے، کاتب کے گھر یا پریس کا چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ اس مہم پر ایک بار میں بھی ساتھ تھا۔ دکان پر پہنچے تو وعدہ خلافی پر درزی سے کچھ دیر مصروف واسوخت خوانی رہے۔ کپڑے کی قطع برید، استر، سلائی، کاج، بٹن کے بارے میں ایسے ایسے نکتے درزی کے ذہن نشیں کرانے لگے ضمناً میرے بھی کہ میں حیران رہ گیا کہ اچھا خاصا آدمی کس چکر میں مبتلا ہے۔ شاید اس بات کو سمجھ گئے۔ دفعتاً بولے۔ ''کیوں صدیقی صاحب آپ کو سوٹ سے بھی دل چسپی ہے۔'' عرض کیا۔ ''کیوں نہیں، لیکن مردوں کے نہیں، عورتوں کے سوٹ سے۔''

بخاری ہنس پڑے، لیکن فقرے کی داد درزی سے دلوائی یہ کہہ کر کہ صاحب کو سلام کرو، صاحب عورتوں کا سوٹ پسند کرتے ہیں۔ سلام تو اس نے کیا لیکن جیسے اسے اس کا یقین نہ ہو کہ اس پسند کا اظہار میں نے سوٹ میں ملبوس کسی خاتون سے کرنے کی کبھی جرأت کی ہوگی۔ مدتوں بعد، تقسیم ملک سے کچھ پہلے مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بنی تو ایک دفعہ دفتر میں ملاقات ہوئی۔ سر سے پاؤں تک کسی اعلیٰ نسل کے کھدر کے سوٹ میں ملبوس تھے، دیکھ کر ہم دونوں بہ یک وقت مسکرائے، لیکن ستم یہ تھا کہ بخاری کا مسکرانا میرے مسکرانے پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک بار میں نے خط لکھا، کچھ روپے بھیج دیجیے کارِ خیر کے لیے درکار ہیں۔ خط ملتے ہی روپے بھیج دیے توقع سے زائد۔ میں نے شکریہ کے خط میں لکھا۔ ''بخاری صاحب میری طرح بچپن میں آپ نے بھی مجتبائی قسم کی کتاب میں کہیں نہ کہیں ضرور پڑھا ہوگا کہ ایک مسافر کھانا کھا رہا تھا۔ اتفاق سے کوئی کتا بھوک سے نڈھال پہنچ گیا۔ مسافر نے ایک ہڈی اس کے آگے پھینک دی کچھ دنوں بعد کسی نے مسافر کو خواب میں دیکھا، جس نے بتایا کہ مرنے کے بعد قبر میں عذاب کے فرشتے نازل ہوئے اور گرز مارنا چاہتے تو کتے کو دی ہوئی ہڈی سامنے آجاتی اور فرشتے کچھ نہ کر پاتے۔ چنانچہ عذاب واپس لیا گیا۔ مجھے یقین ہے جو رقم آپ نے اس کارِ خیر میں بھیجی ہے، وہ آپ کے اب تک کے گناہوں کے لیے ایسی ہی ثابت ہوگی۔ بخاری نے لکھا مژدے کا شکریہ، لیکن اس کا بھی تو اندیشہ ہے کہ ہم آپ جب آخرت میں پہنچیں تو ''شرح مبادلۂ زر'' اتنا خاطر خواہ نہ رہے۔...... تفصیل یا یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا محسوس اکثر کیا کہ اس حلقے کے افراد جتنے بخاری کے شیدائی تھے، بخاری ان کے نہ تھے۔ وہ یقیناً ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، لیکن مقررہ خانوں میں ان پر کسی طرح کی ارضی یا سماوی آفت نازل ہو جاتی ہوگی تو مجھے یقین ہے بخاری ان کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔ روپے پیسے سے، دوڑ دھوپ سے، تحریر و تقریر سے لیکن شاید وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ذہانت، علمیت، اقتدار اور شہرت کے میدان میں جہاں وہ لاشریک لہ تھے ان کا کوئی ساتھی یا کوئی اور شرک کا مرتکب ہو۔ بخاری بڑے بت شکن تھے، جینیس کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن جہاں وہ خداؤں میں صرف مسلمانوں کے خدا کے قائل تھے وہاں بتوں میں صرف اپنے بت کے۔

اقوام متحدہ کے دفتر میں بخاری شبانہ روز اپنے فرائض جس جاں فشانی اور قابلیت سے انجام دیتے تھے وہاں کے چھوٹے بڑے اہل کار کو جس طرح اپنا قائل اور گرویدہ رکھتے تھے اور یاران باصفا سے ملنا ہو جاتا تھا تو محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اس کا حال ملاقاتیوں سے معلوم ہوتا رہتا جو ان کی زیرکی اور ذکاوت کے واقعات اس مزے سے بیان کرتے تھے جیسے کوئی افسانہ سنا رہے ہوں۔ کچھ عرصہ سے ان کی صحت تیزی سے گرتی جارہی تھی جس کے سبب سے خاموش اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے۔ اس کے باوجود جیسے کبھی کبھی 'بادشمال' کا گزر ہو جاتا اور افسردہ کلیاں مہکنے مسکرانے لگتیں۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر دوستوں کو جمع کر کے سیر کو نکل جاتے، ان کے ساتھ کھانا کھاتے اور ہنس بول کر وقت گزار لیتے جو ان کا ہمیشہ سے محبوب مشغلہ تھا۔

پی۔ای۔این کی جے پور کانفرنس کے بعد فاسٹر علی گڑھ آئے تھے۔ فاسٹر بالطبع کم سخن ہیں، چہرے سے علم کا وقار اور عارف کی گہری سوچ نمایاں رہتی ہے۔ چائے پر ایک شام اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ کہنے لگے ہندوستان آتا ہوں تو ایک بات کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کتنے اچھے اور ذہین لوگ جن کو یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے یا ادب کی خدمت کرنا چاہیے، کتنی غلط جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ بات کچھ آگے بڑھی تو بولے، تم لوگ بخاری کو (جو اس زمانے میں ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے) اپنی یونیورسٹی میں کیوں نہیں مقید کر لیتے۔ موقع ملتا تو میں ان کو کیمبرج میں گرفتار کر لیتا، پھر دبی زبان اور غم گین مسکراہٹ سے یہ بھی کہا کہ وہ وہاں سے دیوار پھاند کر نکل جاتے تو میں کیا کر لیتا۔

آج یہ گفتگو یوں یاد آرہی ہے کہ بخاری نے اپنا آخری پروگرام یہ بنایا تھا کہ اقوام متحدہ کی ملازمت سے سبک دوش ہو کر امریکہ کی کسی یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے، لیکن اسے کیا کہیے کہ کسی یونیورسٹی کی دیوار میں مقید ہونے اور پھاندنے سے پہلے ہی وہ زندانِ حیات ہی کی دیوار پھاند گئے۔

''پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان کی باتوں اور تحریروں سے بے شمار لوگوں کے دل خوش ہوئے، اور ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اتنی بڑی خدمت لی تو یقیناً ان کو اپنی بے کراں نوازشوں سے سرفراز بھی فرمایا ہوگا۔''

(''کیا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور'' کے عنوان سے نقوش (پطرس نمبر) 1959 میں شائع ہوا)

●●●

کندن

خاکہ 'کندن' رشید صاحب کے بہترین خاکوں میں شمار ہوتا ہے۔ بظاہر ایک معمولی حیثیت کے انسان کو رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز تحریر سے زندہ و جاوید کر دیا ہے اور اس کی شخصیت میں وہ خوبیاں تلاش کر لی ہیں جن تک ہماری نظر نہیں جاتی!

گمان غالب ہے کہ کندن کی موت 1959 میں ہوئی۔

O

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے۔

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم و بیش 35-30 سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّتِ ملازمت ختم کی، یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹہ بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو، جیسے وہ وظائفِ جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔

کئی دن بعد کسی نے بتایا کہ کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ ارے کندن مر گیا۔ اتنے دِنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا۔ پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظامِ فطرت میں اس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے، نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بیزاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر ہونا نظامِ فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔

انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی تمام شعبدہ ہائے طلسم ہے سبھی !

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آ جاتیں۔ ترکی ٹوپی سیاہ ٹرکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر غریب گھرانوں کے خوب رو، خوش اطوار، ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بہ قول انشا ''ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن ۔'' ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی اُمیدوں اور اُمنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا۔ پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا، وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آ جاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا — کندن! کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لیے نہیں، جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا، ہجور فلاں گھنٹہ، چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلّم ہو، یا کلرک، اس کے ہجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنّع کی گراوٹ نہیں۔

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا، کتنوں کو چھوٹا، کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس 35-30 سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور، ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے، نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں؛ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود و معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ زِ زُہد ہیچو توئی زفسق ہیچو منی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی، تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائے گی۔

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کواڈرینگل (پکی پکی

بارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کھیرا (ایک بڈھے مہتر) کو لانس کارپول (Lance Corporal)۔ خواص میں یہ کمپنی Mirza Akhtar Husain's own Fussiliers (مرزا اختر حسین اون فوسیلیرس) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفر مینا کے نام سے مشہور ہوئی۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب، کندن اور یہ سفر مینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی۔

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے، جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہو جانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزر ریے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے، کوٹ کے اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھڑیا کے ایک آدھ ٹکڑے، بغل میں طرح طرح کی فائلیں اور کاغذ کے پلندے۔ ڈیسک یا کرسی پر، یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھڑیا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن، اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی سفرِ مینا ''جاروب بدست وکھرپا دربغل'' اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسے آج کل سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہو اور دوسرے حسبِ مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفرِ مینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا۔ دوسرا ڈی ٹچ منٹ اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا۔

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا۔ یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلّموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں، لیمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے ادا

کرتے تھے۔ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی۔مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورتِ حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا۔''

مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا، کہنے لگا۔ہجور اطلاع کرتا تو پہلے ......صاحب کے گھر والوں کو کرتا، آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ ہوتا۔مرزا صاحب نے فوراً اس واؤچر پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی۔ چواز قومے یکے بے دانشی کرد!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا، جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابانِ اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے، اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوسِ شاہی کا یومِ تقریب، دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی، عظمت الٰہی زبیری کے عہدِ رجسٹراری تک برقرار رہی، اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا۔کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضور ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا؟ تول ٹھیک ہے؟ کہتا، ہجور بالکل ٹھیک ہے، کھاتر جمع رکھیں۔ایک دن کندن کی عمل داری میں سے گزرا۔نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جا رہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا

ہوا؟ بولا، ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عمل داری ہے۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنہ چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصّے میں آ گیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کیے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزمِ مے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا اُنھیں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں، جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں ہو کیسی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گذشتہ 40-30 سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں ''صلائے عام'' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں، میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید کہیں اور، اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا بُرا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے عہدے داروں کی ایک اہم صفت اور ان کے ثباتِ صحت و حواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ایک ہفتے تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخ رو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کس کمرے میں کتنے ڈیسک اور کرسیاں ہیں، کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ گئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں، اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے

کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی قلت، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی، ان سب سے نبٹنے کے لیے کندن کی ''ایک شخصی وزارت'' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہوسکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبے کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈیسک مہیا کیے جاسکیں، کردیں۔ شکرگزاری کے مؤجب ہوں گے۔ یہ خط لے کر کندن آجاتا، پوچھتا، کندن کیسے ادھر آنکلے؟ ''بجور امتحان نہ ہے، کرسی ڈیسک چاہئیں۔'' بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا؟ میاں خاں (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اُٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈیسک اسی طرح کمرے میں قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبے کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے اس پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا لیکن کندن کی پہچان اور انکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبہ جات جن کی امانت اور نگہ داشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہوگیا یا کسی کو اغوا کرلیا گیا!

کنووکیشن (جلسۂ تقسیمِ اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہوکر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے، جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے، چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام، تین گھنٹے کے اندر اندر، اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صحیح ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر

بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ رات گئے تک یہ 'ہنگامۂ شعر وسخن' برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز اور کرسیاں حسبِ معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے۔

جلالت الملک شاہ سعود[1] ور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران[2] کے اوقاتِ ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں رکھا گیا تھا جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کریکٹ، دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا۔ دونوں تقریبوں میں حسبِ معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فاصلہ تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصے میں منتقل کرکے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیا کو حسبِ منشا میزوں پر چُن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسبِ معمول اس خوش اُسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دست گاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دُشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اُسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا مؤکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح وسالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا، وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار، نہ دوڑ دھوپ، نہ تو تکار، کام اس طرح

1۔ شاہ سعود بن عبدالعزیز دسمبر 1955 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آئے تھے۔ ان کا شاندار طریقہ پر استقبال ہوا تھا اور خصوصی کانووکیشن پر ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔

2۔ رضا شاہ پہلوی فروری 1956 میں اپنی بیگم فرحہ دیبا کے ساتھ آئے تھے۔ ان کا بھی شایانِ شان استقبال کیا گیا تھا اور ایک خصوصی کانووکیشن منعقد کرکے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔

انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے، جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھ کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو حاصل تھا، کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبے میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کے کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا، اس کی کون نہ مانتا۔

میرا خیال ہے، کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسمِ خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا لیکن اس کی اٹکل اور قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تا وقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کندن کی ایمان داری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کے نہیں دوسرے غیر سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ کام بے تکلف سپرد کر دیے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سینٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آ کر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی۔ لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہو گئی اور بس۔

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر اُدھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، کبھی انکار کیا کبھی ٹالنا چاہا۔ بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفرمینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا۔ اور کہا کہ پارسل گھر

لے چلو میں خود تلاش کرلوں گا۔ یہ آفریا چیلنج ان کو قبول کرنا پڑا۔اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔امتحان کا زمانہ تھا۔ایک ہی طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے اوپر نیچے گڈ مڈ رکھے ہوں گے۔ان میں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کرلینا کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

1947 کی قیامت برپا تھی۔علی گڑھ کے نواح میں قتل وغارت گری کی جیسی ہول ناک خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درماندگی کا جو عالم تھا،اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اُس زمانے میں یہاں تھے۔کندن کا مکان دودھ پور میں تھا جو یونیورسٹی سے ملا ہوا،ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا،پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابہ ہوتا رہے گا؟ گاؤں میں کیا خبر ہے؟ کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو،کہتا: ''ہجور کالج پر سرسیّد کی دعا ہے۔سب کھیریت رہے گی۔کالج کا بڑا نمک کھایا ہے۔پرمیسر لاج رکھ لے۔''اس زمانے میں،مَیں نے کندن سے زیادہ مُضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا،جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سیّد صاحب'' کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو۔

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے افراد دہلی گئے،ایک ایسے محلّے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آرہے تھے۔نہ کوئی جا سکتا تھا،نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے،وہ بیان سے باہر ہے۔اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اُس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کردیں۔صورتِ حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا۔لیکن اُس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔اتا پتا دریافت کرنے کے بعد بے محابا دہلی کی آگ میں کود پڑا۔سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لاکران کے گھر پہنچا دیا۔کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقل مندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا،اس کا ذکر اُس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا،وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب اور کہاں کیا گزری۔

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا۔

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا: ''حجور یہ لڑکے ہیں نہ، جب چاہیں خود راج پرکھ بن جائیں، جب چاہیں دوسروں کو بنادیں۔ ان کا کیا؟''

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے دوسروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں، جن سے سیّد محمود اور سرسیّد کورٹ میں آمدورفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی، معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہو، ادھر سے گزریے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو، یا آفس کا کوئی عہدے دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو بجالاؤں۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمّہ داری کے اس تقاضے کی بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عمل داری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں۔

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آ کر ٹھہری گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قویٰ، شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں، وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پائیدار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا، نہ دن دیکھتا، نہ

رات، نہ سردی، نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھا ہوا، اتنی محنت نہ کیا کر، تو وہی کلمہ دُہرادیتا جواس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ یعنی ہجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی، خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عمل داری میں وکٹوریہ گیٹ سے لے کر بابِ اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے 35-30 سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دن میں نے کہا، کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونی فارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا؟ بولا، میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا، ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمھارے سائے میں بسا ہوا ہے، کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمھاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں اُلٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ ''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا، تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنوانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن اب تک اس حرکت سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسیّد کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا۔ یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اُس کے ذہن ودماغ پر مستولی تھیں۔ زندگی بھر وہ ان ہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں

لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا۔

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے روز بروز تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے، ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، ناقابلِ تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا۔

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں، ان کو روکا جا سکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے۔ وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورتِ حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم ''گذشتہ سے پیوستہ ہیں گذشتہ کا ذکرِ خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو اب تک نہ بدلی ہے، نہ کبھی بدلے گی۔

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی۔

●●● (مطبوعہ آج کل (دہلی) جنوری 1960)